شمارہ ۳] لاہور [جون ۲

اس شمارہ میں

مدیر : بشیر ہاشمی

معاونین : ... عبدالغفور چوہدری

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

جون سنہ ۱۹۵۲ء

جلد ۵

شمارہ ۳

سالانہ چندہ

پاکستان کیلئے ۶ روپے

غیر ممالک کیلئے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ :- دس آنے

پبلشر

یونیورسٹی بک ایجنسی کچہری روڈ لاہور

[illegible] ثناء اللہ پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کر یونیورسٹی بک ایجنسی کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا۔

ــــــــــ اساتذہ کا فرض

آزادی کی آمد کے جلد بعد یہ آوازیں سنائی دینے لگی تھیں کہ ہماری زندگی میں غیر ذمہ دار عناصر بڑھ رہے ہیں۔ واقعات نے ان خدشات کو درست ثابت کر دکھایا ہے۔ اخباری رپورٹوں سے رفتار جرائم کے متعلق جو اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ ہر سوجھ بوجھ رکھنے والے شہری کے دل میں تشویش پیدا کرے گا۔ اور وہ قدرتی طور پر یہ سوال پوچھے گا کہ غیر ذمہ داری کا یہ بڑھتا ہوا سیلاب آخر کہاں جا کر رکے گا؟ وہ کون سے اسباب ہیں جو ہماری معاشرتی زندگی میں بددلی، قنوطیت، بے چینی اور غیر ذمہ داری کو ہوا دے رہے ہیں؟

ان سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب ڈھونڈنے کے لئے ہمیں معاشرے کی بنیادوں کا اچھی طرح جائزہ لینا ہوگا۔ اور بنیادی خرابیوں کا تدارک کرنا ہوگا۔ اس کام کو پورے طور پر انجام دینا تو مدرسے کے بس کا روگ نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مدرسوں اور کالجوں میں پڑھانے والے نئی پود کے ذہنی افق کو روشن، کشادہ اور متوازن بنانے میں کافی مدد دے سکتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ معاشرتی زندگی کے خد و خال متعین کرنے میں سب سے زیادہ دخل زندگی کی ذہنی فضا کو ہی ہوا کرتا ہے۔ اگر یہ ذہنی فضا صحت مند بن جائے تو زندگی کے ناپسندیدہ پہلو رفتہ رفتہ خود بخود اعتدال پر آجاتے ہیں۔

ہمیں یہاں آج دو باتوں کا رونا ہے۔ ایک طرف تو مادی اقدار اور پیٹ کی معاشیات کو اس قدر اچھالا جا رہا ہے کہ ہر کس و ناکس زندگی کی ہر شے کو مادی ترازو میں تولنے کا خوگر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ "اولی الامر منکم" کا جائز احترام بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ دوسری طرف بددلی کا یہ حال ہے کہ احترام نفس، ذاتی پاکیزگی اور حسن معاملہ کے سے ابتدائی اخلاقی اطوار کو پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔ ہم صاف ستھرے ماحول اور پاکیزہ لباس پر فخر کرنا نہیں جانتے۔ ہم اپنے احسان کرنے والوں کا لفظی شکریہ تک ادا کرنا ضروری نہیں سمجھتے

غرض بقول غالب ۔

بے دلی ہائے تماشہ کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

اس ضمن میں ہم اساتذہ کو ان کے فرض کا احساس دلاتے ہیں ۔ ہم ان سے یہ مطالبہ تو نہیں کرتے کہ اپنے تن بدن کا ہوش کھو کر اس بلند نصب العین ہی کے لئے سب کچھ قربان کر دیں ۔ انہیں اپنی معاشی زندگی کو بہرحال ایک آبرومند درجہ پر رکھنے کی ضرورت ہے ۔ لیکن ہم اس نکتہ پر ضرور زور دیں گے کہ وہ شخص ہرگز استاد کہلانے کا مستحق نہیں جو اس اہم قومی فریضہ سے محض اس لئے تغافل برتے کہ اس کے بعض معاشی مسائل تسلی بخش طور پر حل نہیں ہوئے ۔ اس کے اخلاقی اور فنی وقار کا تقاضا یہی ہے کہ وہ نئی پود کی تہذیب اخلاق کے لئے جو کچھ کر سکتا ہو اس سے کسی حالت میں دریغ نہ کرے ۔

نوٹس

سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے سی ۔ ٹی پاس کرنیوالے اصحاب سے التماس ہے کہ کالج کے دفتر کو اولین فرصت میں مندرجہ ذیل کوائف بہم پہنچا دیں :۔

(ا) موجودہ پتہ

(ب) موجودہ تنخواہ اور دیگر گریڈ

(ج) کیا آپ گورنمنٹ سکول میں کام کر رہے ہیں یا بورڈ سکول میں یا پرائیویٹ سکول میں ؟

ایڈیٹر :۔ آموزش

علم اور عمل حدیث کی روشنی میں

عبد الغفور چودھری

افلاطون کا قول ہے "علم نیکی ہے" ۔ اور یونانی مفکرین کے تجربہ کے پیشِ نظر علم یقیناً نیکی سے مماثل ہے کیونکہ یونانی زندگی میں اس کا مفہوم دانائی کے مترادف لیا گیا ۔ یہ وہ منزل ہے جس تک محض کتابوں کی سطحی معلومات کے ذریعہ نہیں پہنچایا جاسکتا بلکہ اس کیلئے مسلسل اخلاقی اور ذہنی جدوجہد کی ضرورت ہے یہ منزل چھان بین اور تحقیق کی طویل اور پُر از خطر مہم کا حاصل ہوتی ہے ۔ لیکن جب درسگاہوں پر جو کلیاکے زیر اثر رہ کر زندگی اور سرگرمی سے بہت دور جا پڑی تھیں جامعی فلسفہ کا اثر پڑا تو علم کے لئے اجنبی سی چیز بن گئی ۔ اور تبھی سے بڑے بڑے تعلیم والوں کی کوششیں پہلے سے زیادہ توجہ کے ساتھ اُس جوشش وخروش اور سرگرمی کیساتھ تعلیمی اصول کو واپس لانے کی طرف لگ گئیں جو ہمیشہ گرفت سے نکل جانے کی کوشش کرتا ہے ۔

نئی تعلیم کا مقصد اس خلیج کو پُر کرنا ہے جو علم اور عمل کے درمیان حائل ہوگئی ہے ۔ اس تعلیم نے بچوں کی وافر قوتوں کے آزاد اور پُر مسرت اظہار کے لئے نئی نئی راہیں کھول دی ہیں ۔ لیکن یہ راہیں خاص کر جسمانی اور ذہنی سرگرمی سے متعلق ہیں نئی تعلیم پر یہ الزام رکھنا کہ وہ تعلیمی عمل کی اخلاقی اور معاشرتی پیچیدگیوں کو سمجھنے سے قاصر رہی ہے بعید از انصاف ہوگا البتہ یہ امر ناقابل تردید ہے کہ تعلیم سے متعلق قوتوں میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کے لئے جوش اور ولولہ نہیں پیدا کیا جاسکا اس کا مطلب یہ نہیں کہ نئی تعلیم میں اخلاقی قدروں کی موجودگی سے انکار ہے بلکہ یہ کہ اس میں ردِ عمل کا فقدان ہے ۔

جدید فلسفہ نے دریافت کیا ہے کہ عمل اور علم آپس میں ایک دوسرے کے دست نگر ہیں عمل علم کو حقیقت کی ایک محکم بنیاد پر قائم کرنے اور تجربہ کی تکمیل میں ممد ہوتا ہے اور علم کسی خاص سرگرمی کی معاشرتی ، اخلاقی اور ذہنی پیچیدگیوں کا انکشاف کرتا ہے اور اسے پُر مقصد اور دلچسپ بناتا ہے ، علم اور عمل دو دست ہیں جو فرد کی اخلاقی اور معاشرتی مساعت

آموزش

دنا قائم رکھتے ہیں (SUFYAN THAURI) کا قول ہے کہ "علم عمل کو اپنے پاس بلاتا ہے اگر عمل کا جواب اثبات میں ہو تو ٹھیک ورنہ پھر یہ (عمل) ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس شخص کو الوداع کہہ دیتا ہے"

تہذیب جدید کی ترقی اور نشوونما پر صنعتی انقلاب کے زبردست اثرات ہیں اور ان معاشرتی اور معاشی بحرانوں نے (جن میں معاشرتی و معاشی نظام نے انسانیت کو دھوکا دیا ہے) ماہرین تعلیم کو ایک ایسا نظام تعلیم پیدا کرنے پر مجبور کر دیا ہے جس کی بنیاد لازمی طور پر علم اور تجربہ کے درمیان قریبی علاقہ پر ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تعلیم کے دو مختلف پہلو عام تعلیم اور پیشہ کی تعلیم) جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں ہم آہنگ ہو جائیں گے اور محنت کش طبقہ اور ان کے آقاؤں کے درمیان انسانی سالمیت کا ایک جذبہ پیدا ہونے میں مدد ملے گی۔ یہ درست ہے کہ دستکاری کی حمایت نفسیاتی اور اخلاقی بنیاد پر بھی کی جارہی ہے لیکن اس رجحان کے پیچھے جو تحریکی قوت کام کر رہی تھی وہ بہ نسبت نفسیاتی ہونے کے عمرانی زیادہ تھی۔

دنیا کی اس انوکھی صورت حال کا جس نے تعلیم دانوں کو تعلیم کا یہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اسلام کے ابتدائی دور میں کوئی وجود نہ تھا۔ ان دنوں میں جب محنت کش طبقہ اور سرمایہ داروں کے درمیان اتنی شدید اور واضح بدمزگی نہیں تھی جب پیغمبر اعظمؐ کے ہاتھ میں پھاوڑا ہوتا تھا اور وہ بہ نفس نفیس بکریاں چرایا کرتے تھے جب ان کے صحابیوںؓ کی کلہاڑیوں کی آواز جنگلوں میں گونجا کرتی تھی اور وہ اپنی گذر بسر کے لئے خود لکڑیاں چنا کرتے تھے، جب پیشہ زندگی کے ایک شغل کی حیثیت رکھتا تھا نہ کہ ایک قابل نفرت مصروفیت اور جب انسانی تعلقات معاشی اور صنعتی امور کے مقابلہ میں معاشی زندگی کا ایک صریح تر جزو سمجھے جاتے تھے اس وقت درسگاہوں میں خالص عمرانی اسباب کی بناء پر دستکاری کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی اور اس کے نصاب تعلیم میں شامل کرنے کے لئے نفسیاتی بنیاد اب بھی نہیں دریافت ہو سکی ہے۔ (اس وقت پیشہ کی تعلیم ماہر دستکاروں کے ہاتھ میں تھی جو فن کارانہ تخلیق کو عملی پیداوار سے ملا دیتے تھے، پس عمل اور علم میں ہم آہنگی کا تقاضا درسگاہوں میں ہاتھ کا کام کئے جانے سے نہیں پورا ہوتا تھا بلکہ یہ ہم آہنگی درس گاہ اور سماج میں اخلاقی زندگی اور سماجی خدمات کی اعلیٰ تر حدوں پر پہنچنے سے پیدا ہوتی تھی۔

علم اور عمل کے ایک دوسرے پر قریب تر انحصار کے اصول کو ابتدا ہی سے ایک مکمل شخصیت کا بنیادی جزو تسلیم گیا ہے، اور مسلمان مصنفین کی تحقیق بتلاتی ہے کہ اس اصول کو بانی اسلامؐ سے قبل کے تمام پیغمبروں نے تسلیم کیا تھا

اور اس پر عمل پیرا تھے۔

ابی الدردا (IBI - AD - DARDA) کے مطابق پیغمبر ؐ پر ایک پیغام الٰہی کا انکشاف ہوا تھا کہ "جو لوگ علم کو اس پر عمل پیرا ہونے کے مقصد کے بغیر حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی مثال ایسے لوگوں کی سی ہے جو عوام میں ایک سیدھی سادی بکری کا بھیس بنانے پھرا کرتے ہیں لیکن ان کے قلوب بھیڑیئے سے بھی زیادہ خونخوار ہوتے ہیں جن کی تقریر شہد سے زیادہ شیریں ہوتی ہے لیکن دل ایلوا سے زیادہ تلخ "[1]

انجیل اس شخص کے لئے جو موجودہ عمل اور گذشتہ تعلیم کے درمیان تفاوت کو دور کرنے میں ناکامیاب رہا ہے تعلیم کے مزید بے سود حصول کی کوشش کو نامنظور کرتی ہے :"جو علم جو نہیں جانتے اسے اس وقت تک حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو جب تک کہ اپنے موجودہ علم کو عمل میں نہ لے آؤ"[2] یسوع مسیح ؑ کے مطابق جو شخص کچھ جانتا ہے اس کے لئے اس پر عمل کرنا اتنا ہی فطری ہے جتنا کسی شخص کے لئے آنکھیں رکھتے ہوئے دیکھنا۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے (APOSTLES) سے کہا "دانائی اور حکمت کی بات بتلانے والا اور اس کا سننے والا دونوں (اس بات میں) یقیناً برابر کے شریک ہوتے ہیں، لیکن اس شخص کا مرتبہ زیادہ ہوتا ہے جو اس پر پہلے عمل کر کے اسے حاصل کر لیتا ہے "

"اے بنی اسرائیل! ایک اندھا آدمی سورج کی تجلی سے کچھ حاصل نہیں کرتا کیونکہ وہ اپنے شعور دانائی کو استعمال نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر ایک معالج اپنے عمل کی صلاحیت کو استعمال نہیں کرتا تو اسے اپنی فراوانی علم سے کوئی منفعت نہ ہوگی" آنحضرت ؐ کو اس المناک امر کا پورا احساس تھا کہ ان کے زمانہ کے یہودیوں اور مدینہ کی درسگاہوں میں علم اور عمل میں کوئی رابطہ نہ تھا۔ اور یہ رواجی تعلیم کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ آپ ؐ نے اپنی امت کو اس قسم کی تعلیم کی تباہ کاریوں سے آگاہ کر دیا تھا۔

دس صحابیوں کا ایک گروہ کعبہ کی مسجد میں جمع ہو کر علمی مباحث پر گفتگو کیا کرتے تھے، ایک روز آنحضرت ؐ ان کے پاس آئے اور کہا "جتنا کچھ بھی تمہارا جی چاہے سیکھو لیکن خدا سے اس کا صلہ اسی وقت ملے گا جب تم اس پر عمل کرو گے"

اس موضوع پر احادیث میں جس ادبی حسن اور اصل حقیقت کا اظہار ہے وہ آج بھی اتنا ہی آموز کا ادر تازگی بخش ہے جتنا تیرہ صدی پہلے ۔ آنحضرت ؐ نے ایک حدیث[3] میں جو ڈانٹے کی دوزخ (Inferno) کی ادبی عظمت اور قوتِ تخیل کی یاد تازہ کرتی ہے (جس کی تخلیقی تحریک کا باعث درحقیقت آنحضرت ؐ کی احادیث ہی ہیں) اس عالم کے لئے سزا

---

[1] احیاء ص [illegible] اور المنتقرا ۔ [2] المنتقر ص [illegible] ۔ [3] [illegible] ۔ [illegible] اس حدیث کے لئے ملاحظہ Shane Mahar [illegible] ص [illegible] اور ترمذی ۔

[illegible] کی ہے جو دوسروں کو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے لیکن خود اس پر چلنے سے گریز کرتا ہے، ایسے عالم کو دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا جائے گا اور اس کی انتڑیاں اس کا پیٹ پھاڑ کر باہر نکل آئیں گی اور اس کو چاروں طرف اس طرح پھرایا جائے گا جیسے گدھا چکی کے گرد پھرتا ہے[1]

یہ شاعرانہ عدل جو شاعرانہ ہوتے ہوئے بھی مشکل سے اپنی تاثیر کھوتا ہے ایک مناسب سزا ہے ایسے لوگوں کیلئے جو اپنے ادنیٰ تر جذبات کو بھڑکانے کے لئے علم حاصل کرتے ہیں۔ ان کی سزا یہ ہے کہ اس تکلیف دہ بوجھ کے نیچے دب کر اذیتیں برداشت کریں جسے انہوں نے اپنی دنیوی حیثیت (Career) سے کہیں بڑھ چڑھ کر تعمیر کیا تھا۔

وہ علم جو کسی شخص کی شخصیت کی اصلاح اور اس کے جذبات کی تعمیر میں جذو قوی کا کام نہ کرے اسے قلب یا جذباتی (emotional) زندگی کے لئے پیغام موت سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ علم قلب کے سرچشموں کو تلخ اور بدمزہ بنا دیتا ہے اور اسے نمکین ریت کے ایک ریگستان میں تبدیل کر دیتا ہے جہاں بارش کے قطرے اوپر سے گر کر نمکین قطروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

وہ عالم جو اپنے علم کو مردانہ عمل میں تبدیل کرنے سے قاصر رہتا ہے ایک ایسا مریض ہے جو خود صحت کی برکتوں سے محروم ہے لیکن کسی نسخہ کی تاثیر بیان کرنے میں پورا زورِ بیان صرف کر دیتا ہے جو خود فاقہ کرتا ہے لیکن لذیذ غذاؤں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور ان کی تفصیلات مزے لے لے کر بیان کرتا ہے حالانکہ اُسے وہ چیزیں خواب میں بھی میسر نہیں ہوتیں۔

علم اور عمل میں ہم آہنگی اخلاقی زندگی کا جزو لاینفک ہے اور فرد میں کردار کی سالمیت اور افتادِ مزاج کی وحدت کے لئے ضروری ہے، لیکن یہی چیز ایک استاد یا عالم پر دوہری ذمہ داریاں عائد کر دیتی ہے۔

اسے نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ اپنے شاگردوں سے بھی پرخلوص (True) ہونا چاہئے، آنحضرتؐ کی رائے میں وہ اس وقت تک عالم کہلانے کا دعوےٰ نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنے آپ سے پرخلوص (True) نہیں ہے "وہ شخص جس کی زندگی کا عمل اس کی علمیت سے مطابقت نہیں رکھتا مشکل سے عالم کہلائے جانے کا مستحق ہے"[2]

کسی عمل کی ذمہ داری اس شخص کے لئے جو اس کی اخلاقی پیچیدگیوں سے واقف ہے ایک ناواقف شخص کے مقابلہ میں سات گنا بڑھ جاتی ہے۔

---

[1] صحیح مسلم باب دوم الکتاب الذہد باب اس شخص کے بارے میں جو دوسروں کو ہدایت کرتا ہے لیکن خود اپنی ہدایت پر عمل نہیں کرتا۔
[2] المختصر ص[illegible]

ابی الدرداء کا قول ہے جو شخص نہیں جانتا اس کے لئے تو صرف ایک عذاب ہوتا ہے لیکن جو جانتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا اس کے لئے سات عذاب ہیں۔"

یہ امر کہ شاگرد اپنے استاد کو معاشرتی اور اخلاقی دائرہ عمل میں ایک انتہائی معیار سمجھتے ہیں استاد کی حیثیت کو اور بھی نازک بنا دیتا ہے، استاد کا اپنے شاگردوں سے وہی رشتہ ہے جو ایک کندہ کی ہوئی تختی کا پلاسٹر سے جس پر تختی کے نقش ابھر آتے ہیں یا جو رشتہ کسی لکڑی کے ٹکڑے کا اس کے سایہ سے ہوتا ہے، اگر اس تختی پر کوئی چیز کندہ نہ ہو تو پلاسٹر پر کوئی نقش نہ آئے گا اور اگر لکڑی میں کجی ہے تو سایہ اس کے بالکل مطابق ہی ہو گا۔ استاد کے معائب اور نکر وہ عادات اور نقل کے ذریعہ شاگردوں میں اور بھی واضح اور مصرح ہو جاتی ہیں، پس استاد میں علم اور عمل کی مطابقت کی زیادہ ضرورت ہے۔[1]

درحقیقت جو استاد اپنے افعال کو اپنے اقوال سے ہم آہنگ نہیں بنا تا وہ اپنے شاگردوں کے دماغ پر کوئی نقش نہیں چھوڑتا۔ اور اس کی ہدایت کے الفاظ دماغ سے اس طرح نکل جاتے ہیں جیسے پانی کی بوند پتھر پر گر کر پھسل جاتی ہے ابن مسعود نے ایسے بے عمل عالموں کی تعلیم کی مذمت کی ہے اور کہا ہے کہ قرآن مکاتب میں درسی کتاب کی حیثیت سے مقرر کئے جانے کے لئے نہیں نازل ہوا تھا۔[2]

اشاعت علم

اسلام یقیناً ایک پیغام ہے اور اس پر ایمان لانے والوں کو لازم ہے کہ اس کی برکات کو دوسروں تک پہنچائیں یہ ضرور ہے کہ یہ فرض ابتداءً مذہبی علم سے متعلق تھا لیکن اس فرض کا دنیوی تعلیم پر بہت گہرا اثر ہوا ہے جس کی نشوونما مذہبی اداروں کے گہوارہ میں ہوئی اور جسے مذہبی عالموں نے مقدس بنایا۔ ابن البیر نے مناسل علم کے پہلے باب میں متقدمین کے اقوال سے علم کی مندرجہ ذیل منازل بتائی ہیں: خاموشی سے بیٹھنا، سننا، سمجھنا، ادراک کرنا، حفظ کرنا، عمل کرنا اور آخر میں علم کی نشر و اشاعت کرنا۔[3] زید بن ثابت سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے اس شخص کو جو آپ کے ارشادات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے دوامی زندگی بخشی ہے۔[4] دراصل آپ کو ہر صاحب ایمان سے توقع تھی کہ وہ اسلام کے اصولوں کی تلقین و اشاعت اپنا فرض سمجھے گا۔ اور یہ فرض یکساں تاکید کے ساتھ اسلامی معاشرہ کے ہر فرد پر عائد ہوتا ہے۔

---

[1] ([illegible] ، ص [illegible] ۔ [2] ([illegible]) ص [illegible] ۔ [3] المختصر باب جب بیان اشاعت علم ۔ [4] [illegible]

ایک مرتبہ آپؐ نے اپنے خطبہ میں ان قبیلوں کی عام مذمت کی جو اپنے ہمسایوں کو مذہب سمجھنے کی تلقین نہیں کرتے
تھے بلکہ ان کو اس کے برعکس تعلیم دیتے تھے اور ہدایت کرتے تھے۔ سامعین میں اس خلاف ورزی کے کرنے والوں کے لئے تجسس
پیدا ہو گیا۔ اسی قسم کے اکا دکا واقعات سے تمام لوگوں کی توجہ اس امر کی جانب مبذول ہو جاتی تھی اور اسلامی معاشرہ میں
اصلاح پیدا ہو جاتی تھی۔ سامعین نے اس خاص قبیلہ کا نام ظاہر کئے جانے پر اصرار کیا، ان کو اپنے ہمسایوں کو مذہب کی ہدایت
کرنے اور تعلیم و مشورہ دینے کے لئے ایک سال کا عرصہ دیا گیا[1] یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس حدیث میں علم کے
دونوں پہلو شامل ہیں، اول مذہبی امور کی مقررہ تعلیم دوم تعلیم اپنے وسیع معنوں میں۔

آنحضرتؐ اکثر اپنے صحابیوں کے ایک منتخب گروہ کو قصبات کے لوگوں کو قرآنی احکامات کی تعلیم دینے کی غرض سے
بھیجتے تھے، اور مدینہ کے لوگوں کے لئے ابن کلثوم اور Mas'ud ابن عمر خاص طور پر منتخب کئے جاتے تھے،
مکہ ہجرت کرنے کے بعد آپؐ نے مدینہ کے لوگوں کو فن کتابت سکھانے کے لئے سعید ابن العاص کو مقرر کیا، ان کا انتخاب ایک
مشہور خطاط ہونے کی وجہ سے عمل میں آیا تھا۔ عوام کو جو قبیلوں اور خانہ بدوش کنبوں پر مشتمل تھے دو طریقوں سے غیر رسمی
تعلیم دی جاتی تھی، یا تو ان کی تعلیم کے لئے استاد بھیجے جاتے تھے یا قبائلی رہنماؤں اور سرداروں کو مدینہ آنے کی دعوت
دی جاتی تھی جہاں ان کو آنحضرتؐ اور ان کے صحابیوں کی معیت میں رہنے کا موقعہ ملتا تھا اور جہاں وہ کچھ عرصہ کیلئے مذہبی
اور روحانی جوش و خروش سے بھرے ہوئے ماحول میں سانس لیتے تھے اور اس عرصہ میں ان کی شخصی اثر اور معاشرتی دباؤ
کے ذریعہ اصلاح ہوتی تھی۔

سلمانؓ کا قول ہے قوم کی حیات کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے تعلیمی عمل بہت ضروری ہے اور اگر گزشتہ نسل اپنے بعد
آنے والی نسل کو تعلیم دینے سے قبل گزر گئی تو یہ امر قوم کی حیات کے لئے بہت تباہ کن ثابت ہوگا[2] یہی وجہ تھی کہ آنحضرتؐ
اسی کو علم گردانتے تھے جس کو کسی شخص نے صدقہ جاریہ کی طرح دیا ہو اور اس کی اشاعت کی ہو۔

ابی ہریرہؓ سے روایت ہے کہ علم ان کاموں میں سے ہے جس کا صلہ اس شخص کے مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے
جس نے اسے دوسروں کو دیا ہو اور اس کی اشاعت کی ہو[3]

علم جب ایک سے دوسرے کو پہنچنے کی حالت میں ہوتا ہے تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہوتی ہے جو

---

[1] المختصر باب ۴ [2] المختصر در بیان ترغیب و ترتیب ۴ [3] Ibne maja المختصر

OLYN PUS میں مشعل لئے ہوئے RE-AYRAES دوڑتا ہے اور ہر مشعل دوسری کو روشن کرتی جاتی جو اعلانیہ نیا باری پر ہر ایک روشنی اور درخشانی کے اس شاندار تسلسل کو قائم رکھتی ہے ۔ استاد کا زمین پر روشنی کے مینار سے مقابلہ کئے جانے سے معاشرت میں اس کے سماجی فرائض کی اہمیت نمایاں ہوتی ہے ۔

ابوموسیٰ الاشعریؓ کی سند پر ایک حدیث ہے جس میں بہت نمایاں طور پر ایک خوبصورت تشبیہ کے ذریعہ تعلیمی عمل کے معاشرتی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے ۔

"خدا نے مجھے میری امت پر علم اور تنبیہ کے ساتھ مبعوث کیا تھا اور اس علم کو اس بارش سے مشابہت دی جاسکتی ہے جو ایک ایسے خطہ زمین پر ہوتی ہے جس کا کچھ حصہ زرخیز ہو اور اس میں نمی جذب ہو کر گھاس اور ہرا چارہ اُگ آئے، ایک حصہ نشیب ہو جس میں پانی جمع ہو گیا ہو اور خدا نے اسے پینے اور آب پاشی کے کام کے لائق بنا کر منفعت بخش بنا دیا ہو، اور ایک تیسرا ہموار بنجر ہو جس میں نہ گھاس ہی اُگے اور نہ پانی ہی جمع ہو "[1] پہلے قسم کی زرخیز اور سیراب زمین سے وہ شخص مراد ہے جو اپنی انفرادیت کو ترقی دیتا ہے اور اپنی صلاحیتوں کو تعاون کے پرجوش جذبہ کے ساتھ اجتماعی مقصد کے لئے وقف کر دیتا ہے ، دوسری قسم کی زمین اس شخص کے مثال ہے جس نے اپنی انفرادیت کو تو سنوار لیا ہو لیکن سماجی خدمت کے تقاضے کو پورا کرنے کے لئے عمل نہ ہو ۔ اور تیسری قسم اس شخص کے مثال ہے جو اخلاقی حیثیت سے دیوالیہ ہو نہ صرف انفرادی طور پر بلکہ اجتماعی اعتبار سے بھی ۔ متعدد احادیث ایسی ہیں جن میں صاحب ایمان شخص کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ حق کی اشاعت میں سرگرمی سے حصہ لے ۔ اخفاء علم کی مذمت کی گئی ہے اور جو شخص علم حاصل کرنے کے بعد اسے دوسروں تک نہیں پہنچاتا اس کو اس شخص سے مشابہت دی گئی ہے جس میں دولت جمع کرنے کی حرص تو ہو لیکن اس کا صحیح استعمال نہیں کرتا ۔ درحقیقت اسلام میں سرمایہ داری کو معاشی ذہنی اور اخلاقی ہر اعتبار سے ناپسند کیا گیا ہے[2] ایک مرتبہ آپؐ نے اپنے ایک صحابی سے پوچھا "کیا تم جانتے ہو کہ سخیوں میں سب سے زیادہ سخی کون ہے ؟" پھر آپؐ ہی نے بتایا کہ وہ ذات خدا کی ہے اور خدا کے بعد اولاد آدم میں سب سے زیادہ سخی آپؐ خود اور آپؐ کے بعد وہ صاحب علم جو اپنے علم کی دور دور اشاعت کرتا ہے ۔ ایک حکیم نے ایک مرتبہ اپنے بھائی سے کہا "برادرمن ! اخفاء علم ایک گناہ PERDITION ہے اور اخفاء کی نجات ہے ۔"

ایک حدیث ہے کہ جو شخص علم کے معاملہ میں رازداری سے کام لیگا اس کو قیامت کے روز منہ میں دوزخ کی آگ کا دہانہ لگا کر لایا جائیگا کہ اس شخص کے منہ ... بات کی اشاعت سے اپنا منہ بند رکھا ۔ یہ کیسی منصفانہ سزا ہے ۔

اسلامیات کی تدریس

فضل احمد

قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے مدرسوں اور کالجوں میں ایک نیا مضمون اسلامیات کے نام سے داخلِ نصاب کیا گیا ہے۔ جس کی غایت یہ ہے کہ طلبہ کو اسلام کی بنیادی تعلیمات اور تاریخِ اسلام کے بڑے بڑے واقعات سے آگاہ کر دیا جائے۔ پیشتر اس کے کہ اس نئے مضمون کے اغراض و مقاصد اور اس کے طریقۂ تدریس پر بحث کی جائے۔ ضروری ہو گا کہ معاملہ کے تاریخی پس منظر کو اچھی طرح دیکھ لیا جائے۔

عیسائیت۔ بدھ مت اور اسلام اس وقت تینوں عالم گیر مذاہب ہیں۔ مگر ان میں اسلام ہی صرف ایک ایسا مذہب ہے۔ جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو ایک جامع ضابطہ کے تحت لے آنا چاہتا ہے۔ عیسائیت نے پہلے دن سے ہی آسمانی بادشاہت سے سروکار رکھا اور دنیاوی جھمیلوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ یہ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ اس مذہب کے دورِ اول میں ہی اس مشہور سیاسی عقیدہ نے جنم لیا۔ جو دو تلواروں کے نظریئے کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس کا منشا یہ ہے کہ روحانی اور دنیاوی سیادت دو جداگانہ تلواریں ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کا نیام الگ ہے۔ اور ایک کو دوسری سے کچھ علاقہ نہیں۔ لیکن گو نظری طور پر یہ تفریق تسلیم کر لی گئی۔ لیکن عملاً اس کا برقرار رکھنا کبھی ممکن نہ ہو سکا۔ پادریوں اور بادشاہوں کے درمیان تفوق کے لئے لگاتار جھگڑے چلتے رہے۔ اور ان کا خاتمہ صرف اس وقت ہوا۔ جب دورِ حاضر کی مادی تہذیب نے مذہبی اور روحانی طاقتوں کو بظاہر ہمیشہ کے لئے اپاہج بنا کر انہیں ایک ثانوی درجہ دے دیا۔ قریباً قریباً یہی حال بدھ مت کا ہے۔ یہ درست ہے کہ عیسائیت کے برعکس یہ مذہب بہت جلد حکمرانوں کا مذہب بن گیا تھا۔ لیکن اس سے اس مذہب کی حقیقی روح میں کچھ فرق نہیں آنے پایا۔ اشوک جیسے با اقتدار راجہ کی بیٹی بھی مذہب میں بلند مقام اسی وقت حاصل کر سکتی ہے۔ جب وہ دنیا کو تیاگ کر بھکشوؤں میں شامل ہو جاتی ہے۔ عہدِ حاضر میں جاپان نے بدھ مت

کا پیرو ہونے کے باوجود حیرت انگیز مادی ترقی کی تھی لیکن واقف حال لوگوں کو علم ہے کہ عسکریت نواز جاپان کے نکرونی کو مدت سے کچھ لگاؤ نہ تھا۔

اس کے برعکس اسلام پہلے دن سے ہی روحانیت اور سیاست دونوں میدانوں پر حاوی تھا۔ رسول اللہ صلعم نہ صرف مسلمانوں کے روحانی ہادی و پیشوا تھے۔ بلکہ ان کے سیاسی سردار اعلیٰ بھی۔ سچ یہ ہے کہ اسلام نے ساری اجتماعی زندگی کی بنیاد ان اخلاقی اور روحانی اقدار پر رکھی ہے۔ جن کو وہ اٹل قرار دیتا ہے۔ آنحضرت صلعم کے بعد خلفاء نے بھی روحانی اور سیاسی زندگی کی وحدت کو قائم رکھا اور گو خلفائے راشدہ کے بعد خلافت بادشاہیت میں بدل گئی۔ لیکن سیاسی اور روحانی زندگی کا اتحاد بدستور باقی رہا۔ کیونکہ اس کے خلاف قدم اٹھانا اسلام کی روح کے خلاف بغاوت کرنا ہوتا۔ یہ اسی چیز کا صدقہ تھا۔ کہ ہماری تاریخ کے جابر سے جابر اور بڑے سے بڑے حکمران بھی قرآنی۔ حدیث اور فقہ سے باخبر ہونے پر مجبور تھے۔ عبدالملک اموی کے متعلق مشہور ہے۔ کہ جب مروان مر گیا۔ اور اسے مسند خلافت کی خوشخبری دینے کے لئے آدمی بھیجا گیا۔ تو وہ مسجد میں بیٹھا قرآن مجید پڑھ رہا تھا۔ اسی طرح دوسرے بڑے بڑے اموی اور عباسی خلفاء کی دین سے آگہی۔ تاریخی طور پر مسلم ہے۔ برصغیر پاک و ہند پر نگاہ ڈالیں تو یہاں بھی یہی نقشہ نظر آتی ہے۔ محمود غزنوی کا سا بے عدیل سپہ سالار حافظ قرآن اور فقہ کا عالم ہے۔ علاؤالدین خلجی کا سا باجبروت بادشاہ بے چون و چرا علمائے دین کی رائے کے آگے گردن جھکا دیتا ہے۔ محمد تغلق کی دینداری کا یہ حال ہے کہ موت سے صرف کچھ دن پہلے باوجودیکہ سندھ کی مہم میں مشغول ہے۔ عاشورہ کا روزہ قضا نہیں ہونے دیتا۔ شیر شاہ سوری کو دیکھتے ہیں کہ جوانی کے کئی سال خانقاہوں اور دینی درسگاہوں میں صرف کرتا ہے۔ تاکہ علوم دینی کا اکتساب کر سکے۔ بابر کی اولاد میں اورنگ زیب عالمگیر کی دینداری سے کون بے خبر ہے؟ غرض اسلام نے دینی اور دنیاوی زندگی میں جو گہرا ربط پہلے دن سے قائم کیا تھا۔ وہ مدتوں تک باقی رہا۔ تا آنکہ مغرب سے مادیت کی ایک ایسی تیز و تند آندھی اٹھی۔ جس نے اس شیرازے کو بری طرح منتشر کر دیا۔ اور کچھ عرصہ تک مسلمان نے کوشش کی کہ وہ بھی مغرب کی تقلید میں اپنے دین اور دنیا کو الگ الگ کر سکے۔ لیکن یہ بات ان ہونی تھی۔ کیونکہ اسلام کو چھوڑے بغیر اس پر عمل محال تھا۔ رفتہ رفتہ حالات زمانہ نے کروٹ بدلی۔ آج مغرب کو بھی مذہب کی اہمیت کا احساس ہو رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی فضل نے ہمیں پھر موقعہ دیا ہے۔ کہ اپنی قومی زندگی کی تعمیر اپنی ثقافتی روح کے تقاضوں کے مطابق کریں۔ چنانچہ قیام پاکستان کے فوراً بعد کراچی میں تعلیمی

کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس نے تعلیم کے نصب العین کا ذکر کرتے ہوئے کھلے کھلے الفاظ میں اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ ہم تعلیم کے ذریعے سے ہی اسلامی اقتدار کو پھر سے زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ اس نصب العین کی طرف بڑی تیزی کے ساتھ پیش قدمی ہوئی ہے۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ پیش قدمی ہوئی ضرور ہے۔ ہمارے مدرسوں اور کالجوں میں دینیات کی تعلیم کا اجرا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اسی طرح جامعہ پنجاب میں شعبہ اسلامیات بھی اسی سمت میں ایک قدم ہے

دینی علوم کی اہمیت

اسلام نے ہر قسم کے علوم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض قرار دیا ہے۔ لیکن چونکہ وہ روحانی اور اخلاقی اقدار کو زندگی کی اصل بنیادیں قرار دیتا ہے اس لئے اس نے قدرتی طور پر دینی علوم پر زور دیا ہے۔ چنانچہ ایک مشہور حدیث میں مذکور ہے۔ کہ علم کی دو شاخیں از بس اہم ہیں۔ یعنی علم دین اور علم طب۔ فاروق اعظمؓ کے متعلق روایت ہے کہ فتوحات کے زمانے میں جب کسی کو مفتوحہ علاقہ میں دین کی اشاعت کے لئے روانہ فرماتے تو سختی سے تاکید کرتے کہ دیکھو لوگوں کو قرآن کی سیدھی سادی تعلیم کے سوا دوسرے جھگڑوں میں مت الجھانا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دینی تعلیم ہی سب کچھ ہے۔ اور اس کے علاوہ باقی علوم غیر ضروری ہیں۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے اس نکتہ کو جس طرح سمجھا اس کی عملی تفسیر اسی قسم کے مفروضہ کو غلط ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ دین فطرت ہونے کے باعث اسلام بنیادی امور پر زور دیتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر یہ اچھی طرح طے پا گئے تو ثانوی نتائج خود بخود برآمد ہوجائیں گے۔ یہ اسی نکتہ کے سمجھنے کا نتیجہ تھا۔ کہ صحرا نشین عرب صرف ایمان و یقین کی روشنی لے کر اٹھے اور چند ہی سالوں میں تمام معلوم علوم کے بارے میں باقی دنیا سے آگے نکل گئے۔ ان کی روز افزوں سیاسی قوت جس حد تک ان کے جوش ایمان کا نتیجہ تھی اسی حد تک ان کے بالاتر علم کا بھی۔ انہوں نے جلد ہی بری بحری فوجی قوت اور ملکی انتظام کے متعلق ایک ایسی تکنیک مکمل کر لی جو اس وقت کسی مخالف قوت کے پاس موجود نہ تھی۔

سیاسی غلبہ سے نظر اٹھا کر جب ہم علمی دنیا پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہاں بھی یہی کرشمہ کار فرما نظر آتا ہے۔ عباسی عہد کے اوائل میں ہی اسلام یونانی علم و حکمت کے ذخیروں سے دوچار ہوتا ہے لیکن ذہن انسانی کے یہ عظیم الشان کارنامے اسلام کی پریشانی کا باعث ہونے کی بجائے۔ اس کی حقانیت کو واضح ترکرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ

تی کہ اس عہد کے مسلمان عقیدہ توحید میں زندہ ایمان رکھتے تھے۔ یہ یقین ان کی نس نس میں رچا ہوا تھا۔ کہ کارخانہ عالم کی ہر شے
حکمت الہٰی کی تفسیر ہے۔ اس لئے اس کا کھوج لگانا اور اسے موضوع بحث و تحقیق بنانا عین منشائے دین ہے۔ اس میں
میں زیادہ لمبی چوڑی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اسی قدر کہہ دینا کافی ہے۔ کہ عین جس طرح مسلمانوں کو
سیاسی غلبہ عطا کرنے والی اصل شے ان کا سچا دینی شعور تھا۔ اسی طرح انہیں علمی معراج پر پہنچانے والی قوت بھی یہی تھی۔
غرضیکہ سچی اسلامی زندگی کی بنیاد ایسی روحانی اور اخلاقی اقتدار پر ہے۔ جو ہر قسم کی بلندی کی مکمل طور پر ضامن ہیں۔ اگر
خدانخواستہ ہماری زندگی اس بلندی سے محروم ہے تو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ ہم نے جن چیزوں کو اسلامی اقتدار خیال کر رکھا ہے
وہ فی الحقیقت کوئی اور شے ہے۔ ایسی صورت میں یہ ازبس ضروری ہو جاتا ہے کہ قوم کے روشن دماغ لوگ دین کے
سرچشموں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں تاکہ اصلاح حال کی راہ آسان ہو جائے۔

بیسویں صدی کے تقاضے

یوں تو موجودہ صنعتی تمدن کے آغاز سے ہی دنیا میں معدد معاشری انقلابات شروع ہو گئے تھے۔ لیکن موجودہ
صدی کی پچھلی چند دہائیوں میں ان کی رفتار اور ان کی گہرائی دونوں میں اس تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا ہے۔ کہ تاریخ عالم میں
اس کی مثال موجود نہیں۔ اس کا نتیجہ ایسے الجھے ہوئے معاشری مسائل کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ جن کا حل ذہن انسانی
کے لئے بہت بڑی آزمائش بن رہا ہے۔ ان مسائل میں سے ایک بہت بڑا مسئلہ ہر قسم کے انسانی تعلقات کی
روز افزوں وسعت ہے۔ پہلے وقتوں میں شہروں کی آبادی ہزاروں کو پہنچا کرتی تھی۔ آج ایسے شہر بھی موجود ہیں جن کی
آبادی لاکھوں چھوڑ کروڑ کے لگ بھگ پہنچتی ہے۔ صنعتی ممالک کے بیشتر محنت کار ایسے کارخانوں میں کام کرتے ہیں
جہاں کام کرنے والوں کی تعداد ہزاروں کو پہنچتی ہے۔ اس مسئلہ نے دوہری مشکل پیدا کر دی ہے۔ ایک طرف تو باہم
کام کرنے والوں میں جذبات رفاقت اور ہمسائگی کی بجائے بیگانگی پیدا ہو گئی ہے۔ اور دوسری طرف ان بڑے بڑے تعمیری اداروں
کے چلانے والوں اور ان کے ماتحتوں کے درمیان انسانی رشتوں کی لطافت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اسی طور پر بڑے
بڑے پر ہجوم شہروں میں بسنے والے لوگ ان جذبات ہمسائگی سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں۔ جنھوں نے اب تک
معاشری زندگی کے تانے بانے کو یکجا کئے رکھا تھا۔ آج حالت یہ ہے کہ ایک چھوٹے قصبے کے باشندے جس کی
آبادی صرف چند ہزار پر مشتمل ہو ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں اور باہمی ذمہ داریاں اور پرانی روایات کا

احساس ان کے اعمال و افعال کا قدم قدم پر محاسبہ کرنے کو موجود رہتا ہے۔ لیکن ایک بڑے شہر کا بسنے والا شخص اپنے آپ کو بالکل اسی طرح تنہا محسوس کرتا ہے جس طرح صحرائے اعظم میں کھویا ہوا کوئی راہ گیر اس کے اعمال و افعال کے محاسبے کے لیے پولیس کے سوا کوئی اور قوت موجود نہیں۔ اور چونکہ پولیس کی نگاہ زندگی کے ہر گوشے تک پہنچنی محال ہے۔ اس لئے آج صنعتی تمدن کے لئے یہ مسئلہ بہت بڑا درد سر بن رہا ہے۔ کہ پر ہجوم معاشروں کے شہریوں کو اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس کیونکر دلایا جائے۔ تاکہ وہ اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ اپنے فرائض اور دوسروں کے حقوق کا صحیح شعور بھی پیدا کرلیں۔

دور حاضر کا دوسرا مشکل مسئلہ صدیوں کے سوئے ہوئے عوام کی بیداری ہے۔ دنیا میں ہر جگہ اب آزادی اور حق خود ارادیت کا چرچا ہے۔ اور پس ماندہ سے پس ماندہ ملکوں کے لوگ بھی اپنے گھر کے خود مالک بننا چاہتے ہیں یہ امر بذات خود بہت پسندیدہ ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ عوام کے نام پر اقتدار کا مطالبہ کرنے والے لوگ ہر جگہ اقلیت میں ہوتے ہیں۔ اور جب تک عوام میں ایسی سچی بیداری اور بے باکی پیدا نہ ہو کہ وہ ہر صاحب اقتدار سے جرأت کے ساتھ باز پرس کرسکیں اس وقت تک یہ خطرہ بالکل حقیقی ہے۔ کہ غیر ملکی حکمرانوں کے جانشین وہ مٹھی بھر ملکی لوگ بن جائیں گے جو عوام کو آلۂ کار بنا کر اپنی مخصوص اغراض کی نگہداشت کریں گے۔ جدید معاشری زندگی کے یہ خطرے کسی خاص ملک یا کسی خاص سیاسی نظام کے ساتھ وابستہ نہیں۔ یہ اشتراکی اور سرمایہ دارانہ نظام دونوں میں موجود ہیں۔ سیاسی اور معاشی قوت کا ارتکاز عہد حاضر کا ایک ایسا عنصر ہے جس کی کارفرمائی ہر جگہ یکساں ہے۔ غیر صنعتی اور غیر ترقی یافتہ ملکوں میں اگرچہ یہ شے اتنی نمایاں نظر نہیں آتی لیکن یہاں بھی اس کی پیش قدمی بالکل حقیقی ہے۔

ان خطروں کی روک تھام کے لئے مغرب نے جمہوری نظام کا نسخہ تجویز کیا ہے۔ لیکن تجربے نے یہ بات ثابت کر دکھائی ہے کہ اس نسخے کے شافی ہونے کے لئے بہت سی شرائط کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اسے آنکھیں بند کرکے ہر جگہ استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

ہمارے لئے مسئلے کی نوعیت

جدید معاشری زندگی کے جن تقاضوں کا اوپر ذکر گزرا ہے وہ صرف مغربی ملکوں کے لئے ہی مخصوص نہیں۔ دور حاضر کی سب سے نمایاں خصوصیت دنیا کے مختلف گوشوں کا بڑھتا ہوا قرب واتصال ہے۔ مہذب دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہیں جو

عالمگیر معاشرتی رجحانات سے الگ تھلگ رہ سکتا ہو۔ سیاسی، معاشی اور صنعتی قومیں ہر جگہ تیزی سے متحرک ہو رہی ہیں۔ اسی طرح عالمِ اسلام میں ہر جگہ آزادی کی تحریکیں زوروں پر ہیں۔ بعض اسلامی ممالک غلامی کی زنجیریں کاٹ چکے ہیں۔ اور بعض اس کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ لیکن آزادی حاصل کرنے سے زیادہ کٹھن کام عوام کو سچے معنوں میں اس آزادی میں شریک کرنا ہے۔ ان معاشرتی اور سیاسی مشکلوں کے حل کی اب تک یہی صورت رہی ہے۔ کہ اسلامی ممالک نے مغربی جمہوری اداروں کو اپنے ہاں مروج کیا۔ مغربی سیاستدانوں کا عام عقیدہ یہ ہے کہ یہ جمہوری ادارے کسی قوم میں سچی جمہوری روح پھونکنے کا مؤثر ترین ذریعہ ہیں اور پسماندہ اقوام بھی مغرب کی بالادستی سے اس قدر متاثر ہیں کہ وہ اس چیز کو عام طور پر سیاسی حکمت کا نچوڑ خیال کرتی ہیں۔ اسلامی ملکوں میں ہر جگہ یہی ہوا ہے اور آج پاکستان بھی اس بات کا بڑی شد و مد سے مدعی ہے۔ کہ وہ اپنے ہاں جمہوری طرزِ زندگی کو فروغ دینا چاہتا ہے یہ بات ماننی پڑے گی۔ کہ سچی جمہوری روح اسلام سے بہت قریب ہے۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات کا نچوڑ انسانی ہمدردی۔ اخوت۔ مساوات اور رواداری کے سوا کچھ نہیں۔ جمہوری نظام بھی قریباً قریباً انہی مقاصد کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ لیکن جہاں مغربی حکمت نے ان مقاصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ بعض مخصوص قسم کے اداروں کو قرار دیا ہے۔ وہاں اسلام نے ان کے حصول کا واحد ذریعہ خوفِ خدا کو سمجھا ہے۔ خدائے واحد کی ربوبیت۔ اس کی رحمت اور اس کی عدالت پر زندہ ایمان پیدا کرنے سے اسلام انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تمام گتھیوں کو بہترین طریق پر سلجھا دینا چاہتا ہے۔ گویا اسلام کو ہماری سیاسی زندگی کی ہیئت سے اس قدر واسطہ نہیں جس قدر اس کے مقاصد کے ساتھ۔ دانشِ مغرب نے جہاں ظاہری اشکال کو اہمیت دی ہے۔ وہاں اسلام نے عملی روح کو۔ اسلام کا یہ دعویٰ کوئی لفظی دعویٰ نہیں بلکہ اس کی عملی تفسیر تاریخ کے صفحوں میں موجود ہے۔ روم اور ایران کی جابر شہنشاہیتوں کو ختم کر کے اسلام نے جس پر عدل اور روادارانہ نظامِ زندگی کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کی مثال تاریخ نے آج تک نہیں دیکھی۔ اس ضمن میں یہ کہنا بالکل عبث ہے۔ کہ اس زمانے کے معاشرتی حالات بالکل جداگانہ تھے اس لیے جو نظامِ زندگی اس وقت کامیاب تھا وہ اس وقت کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ وضاحت پیچھے گذر چکی ہے کہ اسلام نے سیاسی اداروں کی ہیئت کو معین نہیں کیا۔ عرب کے صحرا نشینوں نے روم اور ایران کے سیاسی اداروں میں ہی کچھ رد و بدل کر کے ان میں روحِ الٰہی کو پھونک دیا تھا۔ اور نتائج پورے طور پر معجز نما تھے۔ آج اسلامی دنیا کو یہ بھولا ہوا سبق پھر سے ازبر کرنے کی

ضرورت ہے۔ آج مسلمانوں کو یہ ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے۔ کہ ان کی اجتماعی زندگی کی فلاح صرف مغربی اداروں کے اپنانے میں نہیں بلکہ انہیں اپنانے کے بعد ان میں سچی اسلامی روح پھونکنے میں جب تک اسلامی دنیا یہ صلاحیت پیدا نہیں کر لیتی اسوقت تک جمہوری یا اشتراکی نظام میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستگی پیدا کرنے سے کچھ نہ بنے گا۔

طلبہ کو اسلامی روح سے باخبر کرنے کی ضرورت

اس تجزیہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے۔ کہ آج دنیائے اسلام کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ نئی پود کو اسلام کی سچی روح سے باخبر کیا جائے۔ انہیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرادی جائے۔ کہ دینی احکام اور عبادات کے پیچھے ایک خاص روح کام کر رہی ہے۔ جو اصل مقصود ہے۔ جب تک ہم اس روح کو اپنے عملی کردار کا جزو نہیں بناتے اس وقت تک عبادات کا اصل مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دینی تعلیم نصاب تعلیم کا لازمی حصہ قرار پائے۔ لیکن یہ تعلیم محض چند عربی عبارات کے رٹا دینے یا چند رسوم کا عادی بنا دینے پر ختم نہ ہوجانی چاہیئے۔ بلکہ جیسا اوپر کہا جا چکا ہے۔ اس کا مقصد ان الفاظ و رسوم کی روح تک پہنچنا ہو۔

اس وقت اسلامیات ہمارے اکثر مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن امتحان میٹرک میں ابھی اسے کوئی جگہ نہیں ملی۔ ظاہر ہے کہ جب تک اسے ایک لازمی مضمون قرار نہیں دیا جائے گا۔ اس وقت تک اسے وہ توجہ نہ ملے گی جس کے بغیر خاطر خواہ نتائج کا برآمد ہونا محال ہے۔ کالجوں میں اسلامیات کو بطور ایک اختیاری اور زائد مضمون کے رائج کیا گیا ہے۔ لیکن یہ صورت حال بالکل غیر تسلی بخش ہے۔ پہلے یہ حیثیت اردو کو حاصل ہوا کرتی تھی اور کالجوں کا تجربہ رکھنے والے لوگوں کو معلوم ہے۔ کہ کس طرح یہ امر اردو کے لئے فائدہ رساں ہونے کی بجائے الٹا اس کی تدریس کو پست بنانے کا موجب تھا۔ دینیات کے بارے میں یہ صورت حال از حد افسوسناک ہے۔

مقاصد اور طریق کار

اوپر یہ کہا جا چکا ہے۔ کہ اسلام معاشرتی زندگی کے مختلف اداروں کے بارے میں کوئی بندھی ٹکی حدیں مقرر نہیں کرتا۔ وہ سیاسی اور معاشی نظاموں کی کسی مخصوص شکل کا دلدادہ نہیں۔ اسے محض اس بات سے سروکار ہے کہ ان نظاموں کو کس جذبہ اور کس نقطہ نگاہ سے چلایا جاتا ہے۔ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک مخصوص جذبہ کو کار فرما دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ سارا زور اس بات پر صرف کرتا ہے کہ انسان تمام دنیاوی امور کو ایک خاص نقطہ نگاہ سے دیکھیں

جب یہ جذبہ اور یہ نگاہ پیدا ہو جاتی ہے۔ تو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام معاملات خود بخود اعتدال کی راہ پر آجاتے ہیں۔ یہ نتیجہ پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ معاشرے کے تمام یا کم از کم بیشتر افراد اس جذبہ اور اس نگاہ کے مالک ہوں۔ محض ایک مٹھی بھر جماعت پر بھروسہ کرنا بیکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے یہ کبھی نہیں چاہا کہ دین کو سمجھنے اور اس کی قیادت کرنے کے لئے کسی ایک فرقہ کو مخصوص کر دیا جائے۔ وہ اسی فرض کو ساری قوم کے ذمہ لگاتا ہے۔ چنانچہ جن مومنوں کو دینی اور دنیوی سرخروئی کی بشارت دی گئی ہے۔ ان کے متعلق صاف صاف الفاظ میں وضاحت موجود ہے۔ کہ وہ لوگ ایسے ہوں گے۔ جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیں گے اور اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں کی حفاظت کریں گے۔ گویا سربلندی اس قوم کے لئے مخصوص ہے جو نہ صرف اخلاقی اور روحانی طور پر پسندیدہ اور غیر پسندیدہ افعال سے اچھی طرح باخبر ہے۔ بلکہ جس کے افراد ہر وقت اس بات پر تلے رہتے ہیں۔ کہ پسندیدہ اعمال کو نافذ کیا جائے اور غیر پسندیدہ افعال کو دبا دیا جائے۔ اسلام کی اسی امتیازی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ کہ صدیوں تک مسلمانوں نے امور دنیا کے ساتھ ساتھ دین سے آگاہ رہنا بھی ضروری سمجھا۔ بدقسمتی سے دور انحطاط میں ہماری قومی زندگی کا یہ امتیازی وصف باقی نہ رہ سکا۔ اس دور میں علماء اور علوم جدیدہ کی تعلیم و تربیت الگ الگ نہجوں پر ہونے لگی۔ اور رفتہ رفتہ دونوں کے نقطہ ہائے نگاہ میں بعد پیدا ہو گیا۔ یہ چیز ہماری قومی روح کی صحت مندی کے لئے از بس نقصان دہ ہے۔ کیونکہ اسلام میں دین و دنیا دو متضاد چیزیں نہیں بلکہ یہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں ہمارے ہاں ایک کے بغیر دوسرے کا مکمل ہونا محال ہے۔ ان حالات میں یہ امر بے حد ضروری ہے کہ جدید علوم کے طلبہ دینی سرچشموں سے آشنا ہوں اور دینی علوم کے طلبہ جدید سائنسی ترقیوں سے باخبر رہیں۔ امید ہے کہ مدرسوں اور کالجوں میں دینیات کے لازمی قرار دینے اور پاکستانی جامعات میں علماء کے لئے پوسٹ گریجوایٹ نصاب رائج کرنے سے یہ دونوں غائتیں حاصل ہو جائیں گی۔

طریق کار کے سلسلے میں یہ بات بہت اہم ہے۔ کہ طلبہ محض اسلامی تعلیمات کو الفاظ کی شکل میں ہی نہ سنیں بلکہ مدرسے کے ماحول میں انہیں ان کی کارفرمائی بھی نظر آئے۔ اسلامی اخوت۔ مساوات۔ عدل و انصاف اور رواداری انہیں تعلیمی زندگی کے ہر پہلو میں نظر آئے۔ اس چیز کی ذمہ داری اساتذہ اور افسران انتظام ہر دو پر عائد ہوتی ہے دینیات کی تدریس کے سلسلے میں دوسری ضروری احتیاط یہ ہونی چاہیئے کہ یہ کام کسی مخصوص استاد کے ذمہ نہ لگا-

دیا جائے بلکہ مدرسہ کا ہر مسلم استاد دوسرے مضامین پڑھانے کے ساتھ دینیات بھی پڑھائے۔ اس سے نہ صرف تدریس میں تاثیر پیدا ہوگی۔ بلکہ یہ اقدام اس افسوسناک بعد کو بھی ختم کرنے والا ہوگا۔ جو ہم نے دینی اور دنیاوی علوم میں مصنوعی طور پر پیدا کر رکھا ہے۔

غرض اسلامیات کی تدریس کو اگر مدرسوں اور کالجوں میں صحیح طور پر مروج کر دیا گیا تو یہ امر نہ صرف ہماری ثقافتی سالمیت کے لئے از بس مفید ہوگا۔ بلکہ یہ ہمارے ان بہت سے معاشری مسائل کا حل بھی کرے گا جو جدید صنعتی تمدن کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں۔ اور جن کے حل کے لئے ہم اکثر مغرب سے راہنمائی تلاش کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس تعلیم سے ہماری نوجوانوں میں وہ نگاہ پیدا ہو سکے گی۔ جو انہیں جدید زندگی کے ساتھ اچھی طرح تباہ کرنے کے قابل بنا دے گی۔

ایک اہم سوال

دینیات کی تعلیم کے بارے میں ایک بہت بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اور وہ ہے فرقہ بندی سے اجتناب یہ امر از حد ضروری ہے کہ نئی پود کو صرف ایسی بنیادی دینی تعلیم دی جائے۔ جو تمام فرقوں کے لئے یکساں طور پر خشت اوّل کا درجہ رکھتی ہو۔ اس ضمن میں ہمیں یہ بات نہ بھولنی چاہیئے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں جو اختلافات ہیں۔ وہ زیادہ تر فروعی ہیں۔ توحید۔ رسالت۔ اخوت۔ مساوات اور رواداری جیسے بنیادی اصولوں کے بارے میں ہمارے درمیان کبھی کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ چونکہ ہم اپنے مدرسوں اور کالجوں میں انہی بنیادی اسلامی اصولوں کی تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے یہاں فرقہ وارانہ دینیات کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اگر خدانخواستہ کسی طرف سے ایسا مطالبہ ہوا تو پھر سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ ہم حقیقی مقصد کی طرف بڑھنے کی بجائے الٹا اس سے دور تر جا رہے ہیں۔ ماضی میں ہمارے تنزل کی سب سے بڑی وجہ ہمارا باہمی نفاق تھا۔ تنگ نظر ملاؤں نے ہمیشہ اس نفاق کو ہوا دی اور غیروں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ آج اسلامی دنیا کی تعمیر نو کے لئے سب سے ضروری چیز اتحاد ہے۔ اگر خدانخواستہ ہم نے نئی پود کے سامنے بھی دین کو ایک اختلافی مسئلہ کے رنگ میں پیش کیا تو پھر ہماری قومی وحدت کا مضبوط ترین بنیادی پتھر پارہ پارہ ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں ہماری قومیت کی بنیاد اس قدر نازک بنیادوں پر رہ جائے گی۔ جنہیں دشمن جس وقت چاہیں گے متزلزل کر دیں گے۔

یہاں یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ دوسرے مذاہب میں مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات ہمارے نسبت بہت زیادہ گہرے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آج زمانے نے انہیں مجبور کر دیا ہے۔ کہ ان اختلافات کو بھلا کر مدرسوں میں صرف ایسی دینیات کی تعلیم دیں۔ جو تمام فرقوں کے لئے بنیادی درجہ رکھتی ہو۔ انگلستان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ۱۹۴۴ء کے قانون تعلیم کی رو سے دینیات کی تعلیم وہاں لازمی ہو چکی ہے۔ مختلف عیسائی فرقوں کے اعتقادات میں جو بنیادی اختلافات ہیں۔ وہ کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن انگلستان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ آج جنگ مختلف فرقوں کے درمیان نہیں بلکہ مذہب اور لامذہبیت کے درمیان ہے۔ ایسی صورت میں سلامتی اسی میں ہے کہ مذہب اپنے اندرونی اختلافات کو بھلا دے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو وہ سراپا مادی نظام جو مذہب کا دشمن ہے اور جو دنیا کی تمام ترقیوں پر چھا رہا ہے۔ ایک ہی پوزیشن میں مذہب کا نام و نشان مٹا دے گا۔

یہ خطرہ آج اس قدر حقیقی اور اس قدر قریب ہے کہ اس سے آنکھیں بند کرنا گویا تباہی کو دعوت دینا ہے۔ یہ مانی ہوئی حقیقت ہے۔ کہ نئے تعلیم یافتہ طبقے کو مذہب سے دور لے جانے میں سب سے زیادہ ہاتھ علماء کی باہمی تکفیر بازی کا ہے۔ ایک اوسط پڑھا لکھا آدمی مذہب کو معقولیت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا ہے۔ اور چونکہ اختلافی مسائل اس خواہش کی تشفی نہیں کرتے۔ اس لئے وہ باقی چیزوں سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔ پچھلے ڈیڑھ دو سو برس تک یہ چیز محض اس لئے چلتی رہی۔ کہ ہمارے غیر ملکی حکمران خود مذہب کے نام کے سوا اس کی کسی اور چیز کے دلدادہ نہ تھے آج کیفیت سراسر مختلف ہے۔ مذہب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹا دینے کے لئے جو پرہیبت قوتیں جمع ہو رہی ہیں ان کے خوف نے عیسائیت جیسے مذہب کو بھی ایک مرکز پر جمع کر دیا ہے۔ برطانوی مدرسوں میں ان دنوں دینیات کے "متفقہ" نصاب رائج ہیں۔ اگر مسیحی دنیا اتنا بڑا قدم اٹھا سکتی ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان جن کے ہاں دینی بنیادوں کے متعلق کبھی جھگڑا پیدا ہی نہیں ہوا۔ کیوں اپنے تمام بچوں کے لئے دینیات کا "متفقہ" نصاب مقرر نہ کر سکیں۔ اس بنیادی نصاب میں سے گزرنے کے بعد مختلف فرقے اپنے بچوں کو اپنی مخصوص تعلیم دے سکتے ہیں۔ دینی تعلیم کے بارے میں بنیادی اتحاد آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور ہر سچے مسلمان کو اس کے لئے پوری کوشش کرنی چاہئے۔

یونیورسٹی کمیشن کی سفارشات

سرِ نہاں کہ عارف و سالک بہ کس نگفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

مروجہ نظام تعلیم کی تجدید کا عرصے سے غلغلہ ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کمیشن کا تقرر اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اگرچہ کمیشن کئی مہینوں سے اپنا کام ختم کر کے رپورٹ حکومت کو پیش کر چکا ہے لیکن ابھی تک سرکاری طور پر ان سفارشوں کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔ لوگ قدرتی طور پر اس رپورٹ کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے ہم ممنون ہیں کہ اخبار "امروز" نے اپنے غیر معمولی صحافی ذرائع سے کام لے کر کمیشن کی بڑی بڑی سفارشوں کا خلاصہ اپنی ۲۸ مئی کی اشاعت میں شائع کر دیا ہے امروز کا یہ انکشاف گو ابھی سرکاری تصدیق کا محتاج ہے لیکن یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ سفارشوں کا جو خاکہ اس اخبار نے شائع کیا ہے وہ بہت کچھ ان نجی اطلاعات سے ملتا جلتا ہے جن کا چرچا ایک عرصہ سے ہو رہا تھا۔ ذیل میں ہم "امروز" کا پورا بیان نقل کرتے ہیں امید ہے قارئین آموزش اسے دلچسپی سے پڑھیں گے۔

(ایڈیٹر)

لاہور ۲۶ مئی مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حکومت پنجاب نے جو یونیورسٹی کمیشن مقرر کیا تھا اس نے اپنی رپورٹ میں سفارش کی ہے کہ ایف۔ اے تک تعلیم ثانوی تعلیمی بورڈ SECONDARY BORRD OF EDUCATION کے ماتحت کر دیا جائے بعد یونیورسٹی کلاس میں کوئی دخل نہ ہو یونیورسٹی کے ذمے صرف کالجوں کی تعلیم کا بندوبست ہو نیز اس رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ بی۔ اے کے لئے مزید تین سال درکار ہونے چاہئیں اگر یہ رپورٹ من وعن تسلیم کر لی گئی تو بی۔ اے تک کی تعلیم کے لئے ۱۴ سال کی بجائے ۱۵ سال درکار ہوں گے اس رپورٹ میں یونیورسٹی کو ایک وفاقی FEDARATIVE ادارہ بنانے کی سفارش بھی کی گئی ہے نیز ماہرین فن

کے کالجوں مثلاً لاء کالج، یا ملحقہ کالج وغیرہ کو از سر نو منظم کرنے کی سفارش بھی اس رپورٹ میں موجود ہے۔

کالج کے پروفیسروں کی تنخواہوں میں اضافے کے لئے بھی سفارش کی گئی ہے اس رپورٹ میں لیکچرار کا عہدہ ہٹا دیا گیا ہے اور اس کی جگہ اسسٹنٹ پروفیسر کا عہدہ رکھا گیا ہے جس کی بنیادی تنخواہ ۳ صد روپیہ مقرر کرنے کی سفارش کی گئی ہے اس رپورٹ میں پروفیسروں کے تقرر کے لئے ایک خاص تقرری بورڈ کی سفارش بھی کی گئی ہے اس رپورٹ میں یونیورسٹی کے تمام اداروں کے آئین میں تبدیلی کی تجویز بھی کی گئی ہے اور ایک یونیورسٹی کے مالی امور کی دیکھ بھال کے لئے ایک خزانچی کے تقرر کی سفارش بھی موجود ہے۔

اس رپورٹ کے دو حصے ہیں پہلا حصہ یونیورسٹی کے موجودہ نظم و نسق میں خرابیوں سے متعلق ہے اور دوسرے حصے میں ان خرابیوں کو دور کرنے کے بارے میں سفارشات کی گئی ہیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ حکومت پنجاب نے دوسرے حصے کو یونیورسٹی کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے، تاکہ کمیشن کا سفارشات کے متعلق یونیورسٹی کی رائے معلوم کی جا سکے۔

رپورٹ میں یہ بھی سفارش کی گئی ہے کہ موجودہ اورنٹیل کالج کو مشرقی اور مغربی زبانوں کا دار العلوم بنا دیا جائے اور اس سلسلے میں ایک خاص فیکلٹی بھی قائم کی جائے اور موجودہ امتحانات منشی فاضل، ادیب فاضل وغیرہ کی پڑھائی اور امتحانات کا یونیورسٹی سے کوئی تعلق نہ رہے۔

اس رپورٹ میں ذریعہ تعلیم کے متعلق بھی سفارش موجود ہے اس میں کہا گیا ہے کہ آٹھویں تک تمام تعلیم و تدریس کا کام اردو میں ہو میٹرک (آرٹ) میں طلباء کو پانچ سال تک یہ اجازت ہو کہ وہ جس زبان میں چاہیں سوالات کا جواب دیں میٹرک سائنس میں ۷ سال تک انگریزی کو ذریعہ تعلیم برقرار رکھنے کی سفارش کی گئی ہے اور یہی سفارش یونیورسٹی تعلیم کے لئے ہے یعنی سات سال تک انگریزی برقرار رکھی جائے۔

حکومت پنجاب نے رپورٹ کا جو دوسرا حصہ یونیورسٹی کو ارسال کرنے کا فیصلہ کیا ہے وہ بھی اتنا ضخیم ہے کہ حکومت کو ان سفارشات کا ملخص تیار کرنا پڑا ہے اور یہ ملخص بھی ٹائپ شدہ فل سکیپ ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے گو آخری صفحے پر ۷۶ کا ہندسہ ثبت ہے لیکن ویسے حقیقت میں کل صفحات ۵۷ ہی ہیں کیوں کہ صفحہ ۴۶ کے دو حصے ہیں ایک ۴۶ اور دوسرا ۴۶ (الف A) یہ رپورٹ ۱۴ ابواب پر مشتمل ہے اور اسی طرح اس ملخص میں ۱۴ ابواب کو

اختصار سے پیش کیا گیا ہے۔

پہلا باب دو صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں وائس چانسلر کی طرف سے تعارفی نوٹ ہے۔ دوسرا باب تعلیمی معیار سے متعلق ہے اور ۲ صفحات پر مشتمل ہے تیسرا باب یونیورسٹی تعلیم کے بارے میں ہے یہ باب دو صفحات پر مشتمل ہے چوتھا باب کا عنوان یونیورسٹی اور صوبے کی ضروریات ہے پانچواں باب یونیورسٹی کے آئین کے بارے میں ہے اور اس کا ملخص ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے چھٹا باب یونیورسٹی اور کالجوں سے متعلق ہے یہ چار صفحات پر پھیلا ہوا ہے ساتواں باب یونیورسٹی اور کالج سٹاف کے بارے میں ہے آٹھواں تعلیم سے متعلق ہے نواں فنی کالجوں کے بارے میں ہے اس کے آگے کئی حصے میں اور سات حصوں میں لا کالج، زراعتی کالج میڈیکل کالج ہیلی کالج، ویٹرنری کالج، سنٹرل ٹریننگ کالج وغیرہ کے بارے میں الگ الگ سفارشات کی گئی ہیں۔

دسواں باب تحقیق اور تحقیق کے متعلق تربیت کے بارے میں ہے گیارھواں باب مشرقی علوم اور اسلامی تعلیمات سے متعلق ہے بارھواں باب امتحانات کے متعلق ہے تیرھویں باب میں ذریعہ تعلیم کا ذکر ہے اور چودھویں باب میں یونیورسٹی کی مالی حالت کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

اُردو

رپورٹ میں سفارش کی گئی ہے کہ اٹھویں تک تمام تعلیم و تدریس کا کام اردو میں ہو میٹرک (آرٹس) میں طلباء کو ۵ سال تک یہ اجازت ہو کہ وہ اردو یا انگریزی میں سے جو چاہیں استعمال کریں۔ میٹرک (سائنس) میں سات سال کے لئے انگریزی باقی رکھنے کی سفارش کی ہے یہی سفارش یونیورسٹی ایجوکیشن سے متعلق کی گئی ہے صرف قانون اور اساتذہ کی تربیت کے لئے سفارش کی گئی ہے کہ ان کو اختیار دیا جائے کہ وہ سات سال تک جون سی زبان چاہیں استعمال کریں مگر کوشش کی جائے کہ اردو استعمال ہو۔

سفارش کی گئی ہے کہ سائنٹیفک اور ٹیکنیکل انگریزی الفاظ کے ترجمے کے لئے ایک کمیٹی حکومت مقرر کرے اور اس کمیٹی کو گرانٹ دی جائے تاکہ وہ اپنا کام جلدی اور سہولت سے کرے۔

پروفیسروں کی تنخواہیں

کمیشن نے سفارش کی ہے کہ پروفیسروں کو ۱۲۵۰/۵۰/۰۰ کا گریڈ دیا جائے اور انہیں ۲۰۰ روپے

کالج الاؤنس ملے ایسوسی ایٹ پروفیسروں کو ۹۰۰-۳۰-۶۰۰ کا گریڈ دیا جائے اسسٹنٹ پروفیسروں کو ۵۰۰-۲۵-۳۵۰ کا اور ڈیمونسٹریٹرز کو ۲۰۰ روپے ماہانہ تنخواہ دی جائے۔

کمیشن نے سفارش کی ہے کہ یونیورسٹی کے پروفیسروں اور لیکچراروں کے علاوہ مضافات کے کالجوں کے لیکچراروں کو بھی انہیں گریڈز میں تنخواہ دی جائے۔

کالجوں میں بھیڑ کو ختم کرنا چاہئے طلبا کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا کی جائیں صرف اس لئے طلباء کو کالج میں داخل کیا جائے جن کو تعلیم دینے کا انتظام ہو۔ چھوٹی جماعتوں کی تعلیم صرف جونیئر اور نا تجربہ کار اساتذہ پر نہ چھوڑ دی جانی چاہئے کالجوں میں اسکولوں کی طرح تعلیم نہ دی جائے بلکہ لکھائی پر زیادہ زور دیا جائے۔

امتحانات

سفارش کی گئی ہے کہ یونیورسٹی کے کاموں میں ہر وقت جو امتحان جاری رہتے ہیں وہ نہ ہونا چاہئے سوالات اس طرح بنائے جانے چاہئیں کہ اس سے طلبا کی رٹنے کی استطاعت کا اندازہ ہونے کی بجائے اس کی قابلیت کا اندازہ ہو اور یہی اصول پرچے جانچتے وقت مد نظر رکھنا چاہئے۔ ممتحن کے انتخاب میں خاص احتیاط برتنی چاہئے۔

ایم اے کی تعلیم دینے کے لئے انگلستان اور امریکہ کے زیادہ پروفیسروں کو ملازم رکھنا چاہئے سفارش کی گئی ہے کہ کمپارٹمنٹ اور ضمنی امتحانات کا سلسلہ ختم کر دیا جائے اور ایسے طلبا کو جو دوسرے مضامین میں اچھے نمبروں میں پاس ہو رہے ہوں اور ایک مضمون میں پانچ یا چھ نمبروں سے فیل ہوں تو انہیں پاس کر دینا چاہئے۔

ایم اے پریویئس کا امتحان اڑا دیا جائے۔

یونیورسٹی نگر

حکومت پنجاب سے سفارش کی گئی ہے کہ لاہور میں تمام کالجوں کو یکجا کرنے اور یونیورسٹی کی زندگی میں اجتماعیت پیدا کرنے کے لئے یونیورسٹی کو ۲۰ لاکھ روپے کی گرانٹ دی جائے اس سلسلہ میں سفارش کی گئی ہے کہ جہاں تک ہو سکے تمام کالجوں اور یونیورسٹی کے دفاتر کو یکجا کیا جائے اور اس طرح سے ایک قسم کے یونیورسٹی نگر کی بنیاد ڈالی جائے چنانچہ کمیشن نے اس نگر کے لئے جو علاقہ تجویز کیا ہے وہ سنٹرل ماڈل سکول سنٹرل ٹریننگ کالج ضلع کچہری وٹرنری کالج۔ ڈی اے وی کالج سکول اور ہوسٹل سول سکریٹریٹ گورنمنٹ پریس، سناتن دھرم کالج عجائب گھر وغیرہ

بجی کے آخر تک ۔ ادھر سے اور دوسری طرف مدرسۃ البنات پی ڈبلیو ڈی سکریٹریٹ ۔ مارکیٹ اور محکمہ تعلیم کے

دفتر اور میڈیکل کالج کا پورا رقبہ اس نگر میں شامل کر دیا جائے ۔

کمیشن نے یہ بھی کہا کہ اگر شہر کا یہ حصہ نہ مل سکے تو پھر سنٹرل جیل اور اس کے ساتھ کا ملحقہ علاقہ اور ایف سی

کالج کے رقبے میں یہ یونیورسٹی نگر تعمیر کیا جائے

کمیشن نے سفارش کی ہے کہ اس وقت صوبے میں کوئی نئی یونیورسٹی قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔

ثانوی تعلیمی بورڈ

کمیشن نے سفارش کی ہے کہ اسکول کی تعلیم ۱۲ سال کی ہو ۔ پرائمری ۵ سال ۔ مڈل ۳ سال ۔ لوئر سیکنڈری ۲ سال ۔ ہائر سکنڈری ۲ سال ۔ اس نئی اسکیم کے تحت ایف اے تک کی تعلیم اسکنڈری بورڈ آف ایجوکیشن کے تحت ہوگی ۔ سفارش کی گئی ہے ۔ کہ ہائی اسکولوں کے علاوہ ادارے بھی قائم کئے جائیں جن میں صرف چار جماعتیں ہوں یعنی نویں دسویں گیارہویں اور بارہویں ۔

اسکنڈری جماعتوں کے دو امتحان ہوں گے ایک جونیئر سکول سرٹیفکیٹ اور دوسرا سینئر سکول سرٹیفکیٹ اور اس تمام انتظام کے لئے بورڈ آف اسکنڈری ایجوکیشن قائم کیا جائے ۔

وائس چانسلر

کمیشن نے سفارش کی ہے کہ وائس چانسلر کو ۲۵۰۰ روپے تنخواہ دی جائے ۔ اور وہ کسی انتخاب میں حصہ لینے کا مجاز نہ ہوگا ۔ اور نہ کسی سیاسی پارٹی میں کام کر سکے گا کمیشن نے یونیورسٹی کے سینیٹ کے لئے جو ممبر تجویز کئے ہیں ان میں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بھی شامل ہیں ۔ وائس چانسلر تین سال کے لئے مقرر ہوگا ۔ اور اسے اس عہدے پر زیادہ سے زیادہ دو بار فائز کیا جا سکے گا چھ سال کے بعد وہ اس عہدے پر فائز نہیں ہو سکے گا

کمیشن نے سفارش کی ہے کہ بی اے اور بی ایس سی کا امتحان تین سال کی پڑھائی کے بعد گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب طلباء بی اے ۱۴ سال کی بجائے ۱۵ سال میں کریں گے ۔

اسلامیات

سیکنڈری درجہ کی تعلیم میں اسلامیات ایک لازمی مضمون قرار دینے کی سفارش کی گئی ہے یہ مضمون دینیات

سے قطعی مختلف ہوگا اور اس کے رائج ہونے کے بعد دینیات کا مضمون ختم کر دیا جائے گا اور یونیورسٹی تعلیم میں اس مضمون کا شمار سماجی علوم کی فیکلٹی میں کیا جائے گا۔

یونیورسٹی لائبریری

کمیشن نے سفارش کی ہے کہ ۲۰۰ طلبا کے لئے ایک پروفیسر ملازم رکھا جائے۔ سفارش کی ہے کہ یونیورسٹی لائبریری پر کم از کم ۴۰۰۰۰ روپے سالانہ خرچ کئے جائیں حالانکہ یونیورسٹی نے ۵۹-۱۹۵۸ء میں ۴۶۵۵۴ روپے اور ۶۰-۱۹۵۹ء میں ۵۲۱۸۵ روپے خرچ کئے تھے۔

انتظامیہ پر اخراجات

کمیشن نے سفارش کی ہے کہ انتظامیہ پر اخراجات کل اخراجات کے ۱۰ سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے اور پروفیسری لائبریری اور لائبریری پر جو اخراجات ہو رہے ہیں ان کو بڑھا کر ۸۵ فیصدی کر دینا چاہئے۔

حکومت پنجاب سے سفارش کی ہے کہ وہ ۲۲۱۵۲۴۷ روپے یونیورسٹی کو ہر سال گرانٹ دے۔

معلوم ہوا ہے کہ رپورٹ کے دوسرے حصے کا جو ملخص یونیورسٹی کو بھیجا گیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ یونیورسٹی اس سلسلے میں اپنی رائے سے جون ۶۲ء کے آخر تک حکومت کو مطلع کر دے یاد رہے کہ یہ کمیشن حکومت پنجاب نے نومبر ۵۹ء میں مقرر کیا تھا اس کمیشن میں:

میاں افضل حسین پاکستان پبلک سروس کمیشن۔ ایس ایم شریف پرنسپل اسلامیہ کالج خدیجہ احمد نیشنل کمیشن۔ ایس ملے رحمان سابق وائس چانسلر۔ ڈاکٹر بشیر احمد موجودہ وائس چانسلر۔ خلیفہ شجاع الدین اسپیکر پنجاب اسمبلی اور خلیفہ عبدالحکیم بھی شامل تھے۔

جاپانی درسی کتابیں

——— والٹر کراسبی ایلز

ڈاکٹر ایلز جنھوں نے حال ہی میں امریکہ کو واپس جاتے ہوئے کچھ ہفتے پاکستان میں گزارے چار سال تک جاپان میں اعلیٰ تعلیم کے مشیر تھے۔ وہ اتحادی سپریم کمانڈ کے صیغۂ اطلاعات و تعلیم کے رکن کے طور پر جنرل میکارتھر کے عملہ میں شامل تھے۔ جاپان جانے سے پہلے وہ دس سال تک کیلیفورنیا کی سٹینفورڈ یونیورسٹی میں علم التعلیم کے پروفیسر رہ چکے تھے اور سات سال تک امریکی جونیئر کالجوں کی انجمن کے ایگزیکٹو سکریٹری۔ انھوں نے پندرہ سال تک جونیئر کالج جرنل کی ادارت کے فرائض بھی سرانجام دیئے تھے۔ ہم ڈاکٹر ایلز کے بے حد ممنون ہیں کہ انھوں نے ذیل کا قیمتی مضمون خاص آموزش کے لئے تحریر فرمایا۔ امید ہے قارئین اسے خاص توجہ سے پڑھیں گے۔ (ایڈیٹر)

چونکہ پاکستان اور جاپان، دونوں کی آبادی قریباً قریباً برابر ہے یعنی ۸ کروڑ سے کچھ اوپر اور چونکہ پچھلے پانچ سالوں میں دونوں ملکوں نے نظام تعلیم کی تجدید کا وسیع کام اپنے ذمے لیا ہے اس لیے امید ہے کہ راقم الحروف کو جاپان میں چار سالہ تعلیمی خدمات کے سلسلے میں جاپانی درسی کتابوں کی اشاعت کا جو تجربہ ہوا ہے اس کے بعض پہلوؤں کا علم پاکستانی معلمین کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

زمانہ مابعد جنگ کے جاپان میں درسی کتابوں کی تالیف تیاری اور تقسیم کے مسئلہ کو تین مدارج میں بانٹا جا سکتا ہے پہلا مختصر سا منفی دور جس میں اس جنگجویانہ اور دوسرے قابل اعتراض مواد کو خارج کیا گیا جو زمانہ جنگ کی کتابوں میں شامل تھا۔ ان کتابوں کا استعمال اتحادی قوتوں کی سپریم کمانڈ کے احکامات سے خاص طور پر ممنوع قرار دیا گیا اور عبوری عہد میں پہلے عارضی کتابوں کی تالیف اور تقسیم عمل میں لائی گئی۔ اس کے بعد دوسرا زیادہ تعمیری دور آیا جس میں جاپانی وزارت تعلیم کے ماہرین درسی کتب نے قابض قوت کے ماہرین تعلیم کے ساتھ مل کر جاپان جدید کی تعلیمی ضروریات کی

روشنی میں نئی درسی کتابیں لکھنے کی کوشش کی۔ یہ کتابیں عبوری نوعیت کی تھیں۔ تیسرے دور میں جو ابھی جاری ہے درسی کتابوں کے بارے میں وزارت تعلیم کی اجارہ داری توڑ دی گئی ہے اور عام ماہرین تعلیم جنہیں وزارت کے ساتھ براہِ راست کوئی تعلق نہیں، ان درسی کتابوں کی تالیف تنقید اور ان کے انتخاب میں حصہ لے رہے ہیں جو ملک کے مدرسوں میں پڑھائی جانے والی ہوں۔ وزارت اب درسی کتابوں کی اشاعت کے کام سے بالکل باہر نکل جانے کی حکمت عملی کا فیصلہ کر چکی ہے۔ سوائے ان چند محدود کتابوں کے جو اندھے، بہرے اور دوسرے معذور طلبہ کے استعمال کے لیے ضروری ہوں۔

بحالہ قبضہ کے دوران میں جاپان کے ابتدائی اور ثانوی مدارس میں استعمال ہونے والی ترمیم شدہ کتابوں کی کل تعداد جو شائع ہوئی تقریباً ایک بلیون جلدوں تک پہنچتی ہے۔ تعلیمی سالوں کے اعتبار سے ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:-

سال	جلدوں کی تعداد
۱۹۴۵ — ۴۶	۴۸۰۰۰۰۰۰
۱۹۴۶ — ۴۷	۱۴۱۰۰۰۰۰
۱۹۴۷ — ۴۸	۱۴۴۰۰۰۰۰
۱۹۴۸ — ۴۹	۱۸۰۰۰۰۰۰
۱۹۴۹ — ۵۰	۱۹۷۰۰۰۰۰
۱۹۵۰ — ۵۱	۲۳۹۰۰۰۰۰
میزان	۹۵۶۰۰۰۰۰

۴۸-۱۹۴۷ میں از سر نو تعمیر شدہ ادنیٰ اور اعلیٰ ثانوی مدرسوں کے لیے پہلی بار درسی کتابیں شائع کی گئیں۔ اس وقت سے اب تک چار سال کے عرصے میں مدرسوں کے مدارج کے لحاظ سے شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد مندرجہ ذیل ہے

مدرسے کی نوعیت	تعداد کتب	فی صدی
ابتدائی مدرسے	۲۹۵۰۰۰۰۰	۳۸ ٪
ادنیٰ ثانوی مدرسے	۳۸۲۰۰۰۰۰	۵۰ ٪
اعلیٰ ثانوی مدرسے	۸۹۰۰۰۰۰	۱۲ ٪

یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ گو ادنیٰ ثانوی مدرسے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بارہ سالہ عرصے کے صرف چھ تے

حصے کے لیے ذمہ دار ہیں تاہم آدھی مدرسی کتابیں صرف ان کے استعمال کے لیے ہی لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح نئے قائم شدہ ادنیٰ ثانوی مدرسے کو جبری قرار دینے کی مقبولیت کا ایک اور ثبوت مدرسی کتابوں کی تعداد فی طالب علم سے بھی ملتا ہے۔ ۱۹۵۰ء ـ ۵۱ء میں جو کتابیں ۱۹۵۱ء ـ ۵۲ء میں تعلیم پانے والے طلبہ کے لیے شائع کی گئیں۔ ان کی تعداد فی طالب علم حسب ذیل تھی۔

مدرسے کی نوعیت	درسی کتابیں فی طالب علم
ابتدائی	۸ کتابیں
ادنیٰ ثانوی	۹ کتابیں
اعلےٰ ثانوی	۱۰ کتابیں

اوپر دی گئی میزانوں سے کہیں زیادہ اہم درسی کتابوں کی اشاعت کی ذمہ داری کی تبدیلی اور ان کے مندرجات کی اصلاح ہے۔ جوں جوں امریکی تعلیمی مشیروں اور وزارت تعلیم کے افسروں نے مئی ۱۹۴۷ء سے نافذ ہونے والے نئے دستور کی روشنی میں تعلیم پر غور کیا یہ خیال رفتہ رفتہ ترقی پا گیا کہ صرف ہر درجے کے اساتذہ کے وسیع پیمانہ پر حصہ لینے سے ہی ایسی مدرسی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں جو انفرادی طلبہ اور مقامی جماعتوں کی ضرورتوں کے حسب حال ہوں۔

پانچ سال گذرے مختلف اقسام کے ۱۱۵ عنوان طبع کیے گئے جن میں ۹۰ فی صدی وزارتِ تعلیم نے تالیف کیے لیکن ۱۹۵۱ء ـ ۵۲ء میں ۱۴۴ عنوانوں کی اجازت دی گئی جن میں سے صرف ۱۰ فی صدی کی تالیف وزارتِ تعلیم نے کی جاپان میں تعلیم کو جمہوری بنانے اور اس کے کام کو مرکزی قابو سے نکالنے کے بارے میں یہ امر نہایت پر معنی ہے پہلے درسی کتابیں یا تو وزارت تعلیم خود لکھا کرتی تھی یا وہ اس کی منظوری سے لکھی جاتی تھیں۔ اب کوئی استاد، مصنف یا ناشر کسی درسی کتاب کا مسودہ نئی قائم شدہ مدرسی کتب کی نگرانی اور تحقیقاتی کونسل کے ہاں پیش کر سکتا ہے۔ یہ قومی ادارہ وزارت تعلیم سے بالکل الگ ہے۔ اس طرح ہر کتاب لکھنے والے کو یقین ہو سکتا ہے کہ اس کی کتاب کا اندازہ پہلے سے مقررہ معیاروں کی روشنی میں انصاف کے ساتھ کیا جائے گا۔ کاغذ کی موجودہ کمی کے پیش نظر ابھی تک تھوڑی بہت پابندی ضروری ہے۔ کافی مقدار میں کاغذ حاصل کرنے کی اجازت صرف منظور شدہ کتابوں کے مہیا کرنے کیلئے ہی مل سکتی ہے

مدرسی کتابیں تیار کرنے کا نیا طریق چار سال سے استعمال ہے۔ پہلے تین سالوں میں کونسل نے یا اس کی مشیر مدرسی کتب کی نگران کمیٹی نے ۲۲۰۰ مسودوں کو جانچا۔ ان میں سے کونسل نے ۲۲۴ مسودے نامنظور کیے۔ ۳۹۶ شوریٰ اطلاعات اور تعلیم کے محکمے نے نامنظور کیے۔ اس محکمے نے ۶۱۲ مسودے اس شرط پر منظور کیے کہ مجوزہ ترمیمیں کر دی جائیں گی۔ اور ۴۰۰ مسودے غیر مشروط طور پر منظور ہوئے

عمومی لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مدرسی کتابوں کی تیاری کے نئے نظام کی بدولت چند مستثنیات کو چھوڑ کر تمام مضامین اور تمام درجوں کے لیے مقابلے کی مدرسی کتابیں ملنے لگی ہیں۔ آج ۷۰ آزاد ناشر مدرسی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں باہم مسابقت کر رہے ہیں جبکہ پہلے صرف آٹھ ناشروں کو ہی وزارت تعلیم کی منظور کردہ کتابوں کے چھاپنے کے تمام حقوق کا اجارہ حاصل تھا۔

ملک بھر کے ۵۰ اہم مرکزوں میں مدرسی کتابوں کی سالانہ نمائشیں ہوتی ہیں جہاں ناشر اپنی مدرسی کتابوں اور زائد پڑھنے والی کتابوں کی نمائش کرتے ہیں۔ اساتذہ، تعلیمی بورڈ کے اراکین اور دوسرے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کو موقعہ مل جاتا ہے کہ منظور شدہ کتابوں کا ملاحظہ کریں اور مقامی حالات کی روشنی میں ان کے مندرجات اور موزونیت کا اندازہ لگائیں۔ مثلاً ابتدائی مدرسوں کے اساتذہ ریاضی ہر جماعت کی نو یا بارہ کتابوں میں سے کوئی ایک چن سکتے ہیں اعلیٰ ثانوی مدرسے کے انگریزی پڑھانے والے استاد ساتویں جماعت کی بائیس کتابوں میں سے کوئی ایک پسند کر سکتے ہیں۔ یا آٹھویں اور نویں جماعتوں کی ۲۰ کتابوں میں سے کوئی ایک اعلیٰ ثانوی منزل پر قومی زبان کے استاد ہر سہ جماعتوں کی ۸ کتابوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر سکتے ہیں۔

گذشتہ چار سال میں جب سے اس طریق پر عمل شروع ہے تمام شعبوں کی مدرسی کتابوں میں نمایاں اصلاح ہو چکی ہے ترمیم شدہ مدرسی کتابیں اپنے ذخیرہ الفاظ کو صرف اس حد تک محدود رکھتی ہیں جو زیر نظر طلبہ کے حسب استعداد ہو۔ ذاتی مطالعہ اور تنقیدی فکر کی ترقی کے لیے ایسے سوالات دیئے جاتے ہیں جو ایسے فکر کی پرورش کریں۔ نیز اس غرض کے لیے سیکھنے والوں کو دوسری ایسی سرگرمیاں بھی سُجھائی جاتی ہیں جو مختلف مدارج پر ان کی دلچسپیوں اور تجربات کی وسعت کا باعث ہوں اکثر اوقات عمدہ رنگین تصویریں دی جاتی ہیں۔ اب اساتذہ کو اس ولولے اور ابھار کا تجربہ ہو رہا ہے جو مدرسی کتابوں کی تیاری میں حصہ لینے اور ان پر تنقید کرنے سے حاصل ہوا کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پہلی کی

انفرادی ضروریات اور دلچسپیوں کے ساتھ نباہ کرنے کے معاملے میں حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے موسم بہار سے ۲۳ درسی اور نصابی مرکز جن میں سے ہر ایک میں ۷۰۰ سے زائد امریکی نصاب کی نمائندہ کتابیں موجود ہیں اس غرض سے کام کر رہے ہیں کہ درسی کتابیں لکھنے والوں کو مدد دی جائے۔ ۱۹۵۰ء میں ۹ ایسے مرکز اور قائم کیے گئے۔ کتابوں کا انتخاب امریکی ممتحنوں کے ایک بورڈ نے کیا تھا جنہوں نے خصوصیت سے ایسی درسی کتابوں کی طرف توجہ دی جو کمرہ جماعت میں جمہوری طرز تدریس کے لیے حسب حال تھے۔ حال ہی میں ایک جاپانی کمیٹی نے جاپانی تعلیمی کتابوں کے لیے ۸۰۰ ایسے موضوع چنے ہیں۔ جن کو ان مرکزوں کی کتابوں کے مطابق ڈھالا جائے گا۔ ان مرکزوں سے پیشہ ور ماہرین تعلیم مدرسوں کے منتظمین۔ اساتذہ۔ طلبہ مصنفین۔ ناشر اور دوسرے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ خاص طور پر ان لوگوں کو مرغوب ہیں جو درسی کتابیں لکھتے۔ نصابِ تعلیم کے تیار کرنے اور مدرسوں کے لیے ایسے منصوبے تیار کرنے میں مشغول ہیں جو بچوں کو جمہوری طرز زندگی کا تجربہ سکھلائیں ان مرکزوں کی ماہانہ حاضری اوسطاً ۷۰۰۰ رہی ہے۔

ایک اہم ضمنی کام اندھوں اور گونگوں کے لیے خاص درسی کتابوں کی تیاری کے منصوبے کا آغاز ہے یہ ایک ایسا کام ہے جو پہلے جاپان میں تقریباً بالکل ناپید تھا۔ یہ کتابیں براہ راست وزارت تعلیم کی طرف سے تیار کی جا رہی ہیں کیونکہ ابھی ان کی مانگ اتنی تھوڑی ہے کہ پرائیویٹ ناشر ان کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتے۔ جنوری ۱۹۵۱ء تک ایسی چار درسی کتابیں بمعہ اساتذہ کی دستی کتابوں کے شائع ہو چکی تھیں۔ ایک مکمل سلسلے کی تیاری جاری ہے اور اگلے سال تک اس کی تکمیل کی تجویز ہے

ایک اور خاص پہلو دو جلدوں میں "جمہوریت" کی پہلی کتاب کی اشاعت ہے۔ یہ کتاب جاپانی عالموں نے امریکی مشیروں کی مدد سے معاشرتی علوم پر لکھی ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۴۸ء میں چھپی تھی۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن جن کی مجموعی تعداد ۲۶۰۰۰۰ کو پہنچتی ہے چھپ کر مدرسوں۔ تعلیمی اداروں اور عوام میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ ۵۲-۱۹۵۱ء کے لیے مزید ۸۰۰۰۰ جلدوں کی اشاعت منظور ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب کے کوئی نصف درجن بابوں کو "جمہوریت کی کہانی" کے عنوان سے ۳۰۰۰۰۰ کی تعداد میں چھاپا گیا اور ان باز آمدہ سپاہیوں میں بانٹا گیا جو سائبیریا کے کیمپوں میں جنگی قیدی رہ چکے تھے تاکہ ان اشتمالی اثرات کا کچھ ازالہ ہو جائے جن کے زیر اثر وہ کئی سالوں تک رہ

چکے تھے۔ کتاب کی دوسری جلد ۱۹۴۹ء میں شائع کی گئی۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن ہوئی کی تعداد ..... ۳۴۴ سے زائد ہوتی ہے شائع ہو چکے ہیں اور پچھلے سال .....، جلدوں کی ایک مزید ایڈیشن کی منظوری دی گئی۔ اس دوسری جلد کی ..... ۱۲ جلدیں بھی بازآمدہ جنگی قیدیوں میں بانٹی گئیں۔ یہ دونوں جلدیں زیادہ تر اعلیٰ ثانوی مدرسوں کی درسی کتاب کے طور پر تیار کی گئی ہیں لیکن یہ تعلیم بالغاں کی جماعتوں۔ اساتذہ کے نصابوں۔ اور عوامی کتب خانوں میں بھی وسیع پیمانہ پر استعمال کی گئی ہیں۔ مندرجہ بالا اعداد وشمار سے ظاہر ہے کہ جمہوریت کے بنیادی اصولوں کو واضح کرنے والی اس اہم کتاب کی تقریباً اسی لاکھ جلدیں شائع ہو کر جاپان میں تقسیم ہو چکی ہیں۔

• اجتماعی زندگی میں مذہب بطور ایک سماجی عامل: ایک اور خاص طور پر اہم کتاب ہے جو ۱۹۵۰ء میں جماعت نہم کے معاشری علوم کے نصاب میں استعمال کے لیے تیار کی گئی تھی۔ جاپان میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے اس کتاب میں عیسائیت۔ بدھمت اور اسلام کو بطور عالمگیر مذاہب کے اور شنتوازم کو بطور ایک عوامی مذہب کے پیش کیا گیا ہے۔ ان مذاہب کی ترقی کے مختصر حالات بیان کیے گئے ہیں اور انھوں نے تعلیمی اداروں شفاخانوں بہبود عامہ کے مرکزوں۔ آرٹ۔ موسیقی۔ شان وشوکت۔ شاعری اور ڈرامہ کے ذریعے اجتماعی زندگی میں جو حصہ لیا ہے اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

بچوں کے لیے درسی کتابوں کا مفت بہم پہنچانا بالخصوص نو سالہ جبری تعلیم کے عرصے میں ایک ایسا کام ہے جو مستقبل میں ہوگا لیکن اس پسندیدہ کام کے لیے تجویزوں پر غور کیا جا چکا ہے۔ ۱۹۵۱-۵۲ء کے میزانیہ میں ابتدائی مدرسہ کی پہلی جماعت کے بعض بنیادی مضامین کے لیے اس قسم کی عملی گنجائش بھی نکالی گئی تھی۔ امید ہے کہ آئندہ سالوں میں اسے آہستہ آہستہ اوپر کی طرف توسیع دی جا سکے گی۔

(انگریزی سے ترجمہ)

قسط ۲

مدرسہ اور سماج

محمد عبدالعزیز

لیکن اسکولوں کا کام مدرسی ماحول اور سماج میں یک گونہ مطابقت پیدا کرنے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کا احاطۂ کار بہت وسیع ہے۔ فی الحقیقت یہ تو اس کے سفر کی پہلی منزل ہے۔ اور ابھی اسے ایک نہیں بیسوں منزلیں طے کرنا ہونگی اگر اس کا مرحلۂ شوق پہلے ہی سفر میں آسودۂ منزل ہو جاتا ہے تو سماج کی رونق، اس کی بہار آفرینی اور اس کی بزم آرائی میں کچھ پھیکا پن سا پیدا ہو جائے گا۔ یوں تو موسم گل بھی آئے گا۔ چمن آرائی کا اہتمام بھی ہوگا۔ پھولوں کے آب و رنگ میں رعنائی بھی ہوگی، مگر ان میں باس نہیں ہوگی، ان کی بھینی بھینی خوشبو اپنے گرد و پیش کو عطر بیز اور عنبر افشاں نہیں بنا سکے گی، اور جب سماج کا قافلۂ رواں دواں لق و دق صحراؤں، پہاڑوں اور گھاٹیوں کو عبور کرتا ہوا آگے بڑھے گا۔ عرق آلود پیشانی اور تپ گرما، منجمد منجمد سی فضا اور شدت سرما، باد و باراں اور حوادث امروز و فردا کا مقابلہ اس کی سرشت بن جائے گا۔ تو اس کے ماتھے پہ نور کی ان جھلمل جھلمل کرنوں کا انعکاس ہوگا، جو پورے ماحول کو منور کرنے کے لئے بے تاب نظر آتی ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ مدرسہ کے پیش نظر پورے سماج کی فلاح و بہبود ہو تاکہ مدرسے سے صرف بچے ہی استفادہ نہ کریں بلکہ اس سے پوری سوسائٹی متمتع ہو سکے۔ مدرسہ اور سماج کو ایک ایسے مضبوط رشتے میں باندھ دیا جائے، کہ وہ ایک دوسرے سے الگ نہ ہو سکیں، مدرسہ اور سماج کے اس گہرے رابطے کے متعلق مختلف ممالک میں تجربات ہو رہے ہیں۔ جن میں بعض تجربات بہت زیادہ کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ ان ممالک میں مدرسے نے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔ جن پر ان کی سوسائٹی بجا طور پر فخر کر سکتی ہے، ڈنمارک کے فوک اسکول جرمنی کے واک شول (عوام کے مدارس) اور امریکہ کی گرتے اسکیم اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ امریکہ میں آئے دن نئے نئے تجربات ہوتے رہتے ہیں، اور ان کے سماج اور مدرسے میں وہ ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہے کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے

اس مطابقت کو واضح کرنے کے لئے ان کے ایک دیہاتی سماج اور اسکول کے باہمی تعلقات کو سطورِ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"یہ اپنے گرد و پیش میں بڑھنے اور پھیلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ایسے کاموں میں مدد دیتا ہے جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا" ایک بوڑھے امریکی کسان نے کہا۔ جب اس نے ہرے بھرے کھیتوں کے پار سرخ اینٹوں والے اسکول کو دیکھا "لیکن ہم یہی تو چاہتے ہیں۔ اور جب اسے بہتر بنانے کے لئے ہم سب نے مل کر کام کرنا شروع کیا تھا۔ تو یہی تو ہمارا مقصد تھا۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ کہ ہم اپنے پروگرام کو جاری رکھ سکیں گے۔ دراصل ہماری مراد یہی ہے۔ کہ ضروری امور کو بطریقِ احسن کس طرح سرانجام دیا جاتا ہے۔ اور اب ہم ماضی کے پسماندہ طریقہائے کار کی طرف مراجعت نہیں کریں گے۔"

فی الحقیقت اِس ماحول میں آئے ہوئے ایک مہمان کے استفسارات کے جواب میں یہ جائزہ اسکول کے چلتے ہوئے پروگرام کو واضح کرتا ہے۔ اس سے دیہاتی معاشرہ میں کام کی وسعت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے اور ان اقدامات کا بھی احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ جو اس پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ کیونکہ دیہاتی معاشرہ میں اسکول پھیلنے اور بڑھنے کے مواقع کم و بیش غیر محدود ہوتے ہیں۔ یہ مواقع کہاں تک اور کن خطوط پہ چلتے ہیں۔ اس کا انحصار مختلف عوامل پر ہوتا ہے۔ ان میں اسکول کی پالیسی کو مرتب کرنے والوں کی قائدانہ صلاحیتیں بھی شامل ہیں۔ اور وہ طریقہائے کار بھی جو مدرسہ اور سماج کے درمیان جاری ہوتے ہیں۔ نیز انواع و اقسام کے معاشری مسائل بھی، جن کے لئے مقامی آبادی کو مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ مدد کے طلب گار بھی ہوتے ہیں۔ لیکن جب سماج میدانِ عمل میں ان مسائل کے حل کرنے میں اپنی طاقت کو صرف کرتا ہے، تو نہایت وسیع اور دور رس نتائج معرضِ وجود میں آتے ہیں۔

ریاست نیویارک میں کوہ کیٹسکل کی وادی میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں کے مدرسہ اور اس کے سماج کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا پورا ماحول عمدہ اور اچھے معاشری زندگی کے وسائل کو بروئے کار لانے کا مظہر ہے اور حق یہ ہے کہ تعاون اور خدمت اِس سماج کی تعمیر کے بنیادی پتھر ہیں۔

رات کو تاریکی میں اسکول کی کھڑکیوں سے روشنی چھن چھن کر باہر آتی ہے۔ کوئی معاشری گروہ یا سماجی تنظیم مدرسہ کی عمارت کو تعلیمی یا سماجی مقاصد کے لئے استعمال کر سکتی ہے۔ مقامی آبادی اس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھاتی ہے۔

بتالی ہے۔ ایک سال میں ۲۵ بالغ اور نوجوان معاشرتی اداروں نے اسکول کی عمارت کو ایک سو ستر (۱۷۰) مرتبہ استعمال لیا۔ بالغ اداروں میں سے پانچ نے اپنے سارے اجتماعات کا اہتمام اسکول کی عمارت ہی میں کیا۔

لیکن اس خاکے کو مکمل طور پر پیش کرنے کے لئے اس کے اعداد و شمار کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ مدرسہ کے قہوہ خانے کے ذریعہ معاشی گروہ رات کے کھانے کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ ورزش گاہ اور کھیل کے میدان کی فعالیتوں کی مثال شہر کی بھیتوں کے چھپنے سے دی جا سکتی ہے۔ بالغوں کے لئے ہر ہفتہ باسکٹ بال، والدین اور معلمین کی انجمن اور دوسرے سماجی گروہوں کے اجتماعات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بالغ گروہوں کے پیش کردہ کھیل صنعتی نمائش یا پھولوں کی نمائش کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ اور معاشرے کی مجمن منزلی مدرسے کے سماج خانے سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ طلباء کے بالغ ممبر کتب خانے سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ درسی کمرے کسانوں کے اجتماعات، ڈراموں کے ریہرسل اور دوسرے گروہی مباحث کے کام آتے ہیں۔

مدرسہ کا کتب خانہ سماج کا اپنا کتب خانہ ہوتا ہے۔ ضلع اور شہر دونوں اس کے دیکھ ریکھ کے لئے فنڈ مہیا کرتے ہیں جس میں مہتمم کتب خانہ کی تنخواہ بھی شامل ہوتی ہے۔ سماج کے بالغ افراد کتب خانے سے کتابیں بھی مستعار لے سکتے ہیں۔ ان کی سہولت کے لئے کتب خانہ سال بھر ہفتہ میں دو مرتبہ کھلا رہتا ہے۔ اور تعطیلات گرما میں اتوار کے علاوہ دوسرے دنوں میں یہ کتب خانے کھلے رہتے ہیں۔

فی الحقیقت گرمی کا زمانہ بڑی مشغولیت کا زمانہ ہوتا ہے۔ اسکول بینڈ اس زمانے میں سماج کے زیر اہتمام آجاتا ہے۔ اور ہر شخص کو اس کے بجانے کا موقع ملتا ہے۔ بوڑھے اور نئے گریجویٹ پھر اس میں حصہ لیتے ہیں۔ اور بوقت ضرورت صنعتی ساز کرایہ پر منگا لئے جاتے ہیں۔ دیہاتی تاجروں کا کہنا ہے۔ کہ ہفتہ کو دوپہر کے بعد اسکول کا اجتماع ان کی تجارت کے فروغ کا باعث ہوتا ہے اس طرح یہ لوگ بھی کچھ نہ کچھ زر امدادی مدرسہ کو دیتے رہتے ہیں جس سے ہیڈ ماسٹر کی تنخواہ کی ادائیگی میں کافی مدد ملتی ہے۔ سماج کے قائدین کا عقیدہ ہے۔ کہ یہ مختلف پروگرام معاشرہ کو یک جہتی، اور کلچر اور ان کی ثقافت کے فروغ کا موجب ہوتے ہیں۔ اسکول کے گرمیوں کا پروگرام ایک مشترکہ مہم ہوتی ہے مقامی انجمنوں کی مالی استقامت میں دیہاتی اور شہری دونوں حصہ لیتے ہیں تربیت یافتہ جماعتیں لوگوں کے مشاغل میں مسئلہ پیش آنے کے طفیل کرتی ہیں اور ان کو دوسری فعالیتوں میں ہر گروہ کو ہدایات دیتی ہیں۔ اسکول کی بس تیراک جماعت کو کسی قریب

لی جھیل تک لے جاتی ہے۔ سافٹ بال کی پانچ ٹیمیں ہفتہ میں تین راتوں تک کھیلتی رہتی ہیں۔

یہ گاؤں بطور ایک مثال پیش کیا گیا ہے۔ کوہ ایڈمن ڈیک سے سو میل شمال کی طرف اسی قسم کا ایک چھوٹا سا گاؤں اور ہے جس کا سماجی نظام بھی کچھ اس سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن اس کے مسائل بالکل مختلف ہیں۔ اس کا معاشرہ سب سے الگ تھلگ اور بجا جدا سا ہے۔ اسی کے یہاں کوئی ڈاکٹر بھی نہیں ہے۔ لیکن اسکول کا ڈاکٹر اپنے ہفت روزہ دورہ کے اوقات میں اسکول کے اطاق موت میں سماج کے بیماروں کے لئے بھی کچھ وقت دیتا ہے۔ ان کے یہاں موشن پکچرس کی نمائش کے لئے کوئی تاریک کمرہ نہیں ہے۔ اس لئے اسکول ۱۶ ملی میٹر تصویریں آڈیٹوریم میں دکھا دیتا ہے۔ اس علاقے میں کوئی اخبار بھی نہیں چھپتا۔ لیکن سماج اور مدرسہ کا ایک مشترکہ ہفت روزہ کثیر الخطوط اخبار کا اہتمام اسکول خود کرتا ہے۔ اس اخبار کی اعانت پورا معاشرہ کرتا ہے۔ اور اس کی گھر گھر اشاعت ہوتی ہے۔

تعلیم بالغاں کا پروگرام معاشرتی ضروریات کا ایک اہم جزو ہوتا ہے۔ مستورات یہاں سینا پرونا اور کپڑوں کی مرمت کرنا سیکھتی ہیں۔ ان مراکز میں مائیں اس نیت سے آتی ہیں کہ وہ کسی لباس کے کسی خاص نمونے کو بیلنے میں، ایک بچے کا کوٹ تیار کرنے میں اور فرنیچر کے غلاف کے انتخاب میں یا کھانا پکانے کے کسی نسخے کے تجربے میں ان سے مدد لیں۔ موسم خزاں میں جب فصل کٹ جاتی ہے۔ تو کھیتوں میں کام کرنے والے ٹریکٹروں کی صفائی اور مرمت کے لئے ایک "ٹریکٹر اسکول" کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ تاکہ برف باری کے زمانے میں وہ بڑے راستوں کی گلیوں کو صاف کھلا رکھیں۔

اس کے علاوہ سماج کے بعض غیر اہم پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ بچوں، نوجوانوں اور والدین کی تفنن طبع تفریحی مشاغل کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہاں اجتماعی کھیل اور اسکوائر ناچ سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ فلموں کی نمائش کے بعد بالغوں کے تدریسی سیشن یا سماج کے گروہی اجتماعات کی کارروائی کے اختتام پر ورزش گاہ کے فرش سے کرسیاں اٹھا دی جاتی ہیں۔ مغنی اپنی دھن چھیڑتے ہیں اور اس کے زیر و بم میں قدموں کی چاپ اور اس کے نشانات کا شور شروع ہو جاتا ہے۔

جب کوئی اس معاشرہ کا جائزہ لیتا ہے تو بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر اسکول ان اجتماعی پروگراموں سے زندگی نہیں بڑھاتا تو زندگی میں درشتی اور ناہمواری پیدا ہو جائے گی جس میں ذوق و شوق کا فقدان ہوگا۔ لیکن اگر ایک دلیرانہ جسارت شرمندۂ معنی ہو جاتی ہے۔ تو دوسری مرتبہ زندگی کو مہیب خطروں اور جوکھوں میں ڈالنا آسان ہو جاتا ہے۔ اگر

کے لئے بہت وجاہت ضروری ہوتی ہے۔ ایسی بہت وجرات جس کا دھارا سماجی زندگی کے حقائق سے پھوٹتا ہے۔
ایسے طریقہائے کار جو دیرپا نتائج مرتب کرتے ہیں حاصل انہیں پر انسانی ترقی و بقا کا انحصار ہوتا ہے اور یہ طریقہائے کار انسانی معاشروں میں مستقل گھر کر چکے ہیں۔ وہ کسان جس کا ذکر شروع میں کیا گیا ہے، اس امر کو بخوبی جانتا ہے۔ اور برسوں کے انفرادی تجربے کے پیش نظر اسے اپنے سماجی اسکول کا پروگرام مرتب کرنا بھی آتا ہے۔ کیوں کہ اس سماج میں جو یو ایس۔ اے کے جنوب مشرقی حصہ میں جنوبی کارولینا میں پائیڈمنٹ کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ یک فیصلہ اقتصادی بندشوں کا سوال باقی نہیں رہا۔ وہ کھیت جو کم مقدار میں خام کپاس پیدا کرتے تھے اب الفا الفا سے بھرپور نظر آتے ہیں اور سرسبز مرغزاروں میں اچھی نسل کی گائیں اور شیر خانہ (ڈیری) کے دوسرے جانور چرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ مرغی خانے اور شفتالو کے باغات بھی پورے علاقے میں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یہی سرخ اینٹوں والی عمارت سارے کاروبار کا مرکز ہوتی ہے۔ بالغ اجتماعی اور انفرادی حیثیت سے دن بھر آتے جاتے رہتے ہیں۔ کوئی اسکول کے ذخیرے سے پندرہ سیر آلو لینے کے لئے آتا ہے اور کوئی ایک سور کو کٹوانے کے لئے، تاکہ وہ اس کے گوشت کو سکھا کر اسے اسٹور کر سکے، کوئی سبزی یا پھلوں کو ڈبوں میں بند کرانے کے لئے مدرسہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور کوئی گھریلو مصنوعات کے ماہر استاد سے کرسمس کے لئے پھلوں کے کیک بنانے میں مدد لینے کے لئے اپنے گھر سے چل کر آتا ہے۔

رسمی تعلیم بالغان کی جماعتیں حسب ضرورت مختلف خاندانوں کی غیر رسمی تعلیم کا راستہ کھولتی ہیں۔ ایک باپ اور بیٹا اسکول شاپ میں ایک ٹوٹی پھوٹی مشین کی مرمت کرتے ہیں۔ ایک خاندان پھل یا سبزیوں کو ڈبوں میں بھرنے یا منجمد کرنے میں مصروف ہوتا ہے۔ اور ایک ماں اور بیٹی گھر کی آرائش میں مصروف رہتی ہیں۔

مدرسہ اور سماج کا یہ باہمی تعلق اور ان کی یہ حیرت انگیز ترقی آسان نہیں تھی۔ ابتداً اسے چھوٹے پیمانے پر شروع کیا گیا اور پھر اس اعتماد کے ماتحت برابر آگے بڑھتے رہے۔ کہ اگر لوگوں کو مکمل اطلاعات بہم پہنچائی جائیں گی تو وہ اپنے مسائل کو خود حل کرنا سیکھ جائیں گے۔ مدرسہ اور سماج کے قائدین نے ایک طرف خراب زمین، فرسودہ اقتصادیات، کم آمدنی اور ناکافی کھانا اور دوسری طرف گھر، مدرسہ اور سماج کے حقائق کے باہمی تعلقات کو محسوس کرنا شروع کر دیا ہے۔ دھیرے دھیرے جب اس پروگرام نے ترقی کی اور لوگ افہام و تفہیم کی مدد سے آگے بڑھے تو استعانت اور

خاندان میں بھی اضافہ ہوا۔ چناں چہ امریکہ کے دوسرے دیہاتی علاقوں کی طرح یہاں بھی مدرسہ سماجی زندگی کا مرکز بن گیا۔

یہ دونوں مثالیں امریکہ کے دو دور افتادہ گاؤں میں مدرسہ اور سماج کے تعلقات کا ایک اجتماعی خاکہ پیش کرتی ہیں جس میں نیویارک یا واشنگٹن کے حسین اسکولوں کی دیدہ زیب تصویریں پیش نہیں کی گئیں بلکہ پہاڑیوں کے دامن میں واقع دو ایسے گاؤں کے مرقعے پیش کئے گئے ہیں۔ جہاں موجودہ تہذیب کے تصنع کی پرچھائیاں نہیں پڑیں۔ زندگی کی سادگی خزاں ناآشنا درختوں کے گھنے سائے میں یا کسی نرمک خرام چشمے کے کنارے، اس کی مترنم لہروں کے زیر و بم میں مسرور و شاداں نظر آتی ہے۔ جہاں حسن فطرت کی رعنائی اور قدرت کی گل کاریاں ان کے افکار و خیالات کو متاثر کرتی رہتی ہیں لیکن اس سادگی میں بھی دور جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اِن سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے۔ کہ دوسرے ممالک میں مدارس سماجی زندگی کی روح ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے گھریلو کاموں میں بھی مدرسہ پورے سماج کی مدد کرتا ہے۔ یہ مدارس سینے پرونے، کھانا پکانے اور اسی طرح کے دوسرے چھوٹے بڑے کاموں میں ان کی مدد کرتے ہیں مگر ہمارے معاشرے میں احساس کی یہ کرن ابھی تک نہیں پھوٹی اور اسکول کو ایسی مرکزیت اب تک نصیب نہیں ہوئی۔ یہ اس لئے نہیں کہ ہمیں اسکول کے تعاون کی ضرورت ہی نہیں بلکہ یہ اس لئے کہ ہمارے محدود تخیل نے ہمیں آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے جانا سکھایا ہے۔ ابھی طبقاتی کشمکش ایک ماحول میں بسنے والوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے میں حائل ہو رہی ہے۔ ایک اسکول کے جلسۂ تقسیم انعامات میں شامل ہونے کا موقع ملا۔ معزز مہمانوں کو ریل پیل تھی۔ معزز مہمان واقعی معزز تھے اور سوسائٹی کے ممتاز ترین افراد لیکن اُن کے چہروں کے اُتار چڑھاؤ، اُن کی پیشانی کے بل اور اُن کے ہلکے پھلکے قدم۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کسی ناخوش گوار فرض کی ادائیگی کے لئے تشریف لائے ہیں۔ قدرے۔ ٹھٹکے، بیٹھے، جلسہ کی کارروائی پر مربیانہ نگاہیں ڈالیں۔ طلبہ کی سفید و خاکی وردیاں اور مستک پر جمی ہوئی سبز و کبود ٹوپیاں۔ اسکول بینڈ کی خوش آئند دھن۔ وہ جنت نگاہ اور یہ فردوس گوش۔ خوش ہوئے یا ناخوش بہر صورت خوشی کا اظہار کیا۔ جلسہ ختم ہوا۔ کچھ تو دور کے جلوے کی کسک اپنے دل میں لئے رخصت ہو گئے اور کچھ ایک سجے سجائے ہال میں لائے گئے۔ چائے کا دور چلا، فضا میں قہقہے گونجے۔ اگر یہاں یہ آپس میں محو گفتگو تھے تو ہال کے باہر ان کی کاریں اور ان کے شوفر بھی معانقے میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ مگر محنت کش استاد جس کے خونِ جگر سے اس لالہ زار میں رونق نظر آتی ہے۔ کنکھیوں سے ان بلند و بالا شخصیتوں کو دیکھنے کی جرأت کر رہا تھا۔ اور

رح جیسے کسی گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔ مبادا کوئی اسے دیکھ لے۔ وہ تو اُن کے فلک بوس کنگروں کی طرف ایک نگاہ
بھی نہیں ڈال سکتا۔ حالاں کہ ان اجتماعات کا مقصد مدرسہ اور سماج میں تعاون پیدا کرنا ہوتا ہے۔ والدین اور معلمین کے
بط کو استوار کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ سماج اور مدرسہ دونوں ایک دوسرے کے لئے مفید ثابت ہو سکیں۔ مگر دراصل ہماری
اجتماعی روح بیمار ہے۔ ہم میں اخلاص کا فقدان ہے، بصیرت کی کمی ہے۔

اس میں ہمارے شہر اور دیہات دونوں برابر کے شریک ہیں بلکہ بعض صورتوں میں دیہاتی ماحول زیادہ الم ناک اور
روزِ مناظر پیش کرتا ہے۔ عام طور پر دیہاتوں میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہوتی جہاں گاؤں کے ہر طبقے کے لوگ جمع ہو کر آزادانہ
گفتگو کر سکیں اور خود ہی مل جل کر اپنی فلاح و بہبود کا کوئی واضح پروگرام مرتب کر سکیں۔ چودھری صاحب کی چوپال گنگو
دستیا کی آویزش میں ایک کے لئے دار و رسن کا سامان مہیا کر سکتی ہے۔ اور دوسرے کے سر پر موہوم "تاج زرنگار"
رکھ سکتی ہے۔ لیکن لطف و کرم اور عقیدت و اخلاص کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو جوڑنے میں ممد ثابت نہیں ہو سکتی۔

بہر صورت اب ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ کہ ہمارے مدارس اور ہمارے سماج میں اس قسم کا تطابق یا ہم آہنگی پائی جاتی
ہے۔ یا دونوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہے۔ جس کا پاٹنا کچھ آسان کام نہیں۔ لیکن قومی استحکام کے لئے مغائرت
کے اس لامتناہی سلسلے کو ختم کر دینا ضروری ہے۔ یقیناً دوسرے بھی ان بلندیوں تک ایک دن میں نہیں پہنچ گئے۔
انہیں بھی خود آگاہی کے مختلف مدارج کو طے کرنا پڑا ہوگا لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کسی معجزنما مداری کی طرح جادو کی چھڑی
لے کر یہ بھی منزل تک نہیں پہنچے۔ خرابیوں کو دیکھ کر ہی اچھائیوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ وہ بھی اسی راہ گذر سے
گذرے ہیں۔ ہمارے سامنے گولڈ اسمتھ کا اسکول ماسٹر اور ڈکنس کے مسٹر اور مسز اسکوئیر کی لافانی تصویریں اس عہد کا تفصیلی
نقشہ پیش کرتی ہیں۔ جب تجرد کی جھلک انگریزی مدارس میں نہیں دکھائی دیتی تھی مگر صدیوں کے نشیب و فراز اور زندگی کے
اُتار چڑھاؤ نے انہیں زندہ رہنے کا سلیقہ سکھا دیا۔ اور انہوں نے اپنے اس گھناؤنے ماحول کو باغ و بہار میں تبدیل کر
دیا۔ جہاں بچوں کو ایسی ادویات پلائی جاتی تھیں کہ اُن کی اشتہا کم ہو جائے۔ اور ان کے مصارف میں سے کچھ ناظمین
مدارس کے پیٹوں میں بھی چلا جائے تاکہ وہ اپنے چہرے کی چھائیوں کو مٹا سکیں۔ لیکن ان کے یہاں یہ حالات تا دیر باقی
نہ رہے۔ جدید نظریات نے اُن کے فکر و نظر میں بھی انقلاب پیدا کیا۔ اور عوام کے سوز و ساز نے اس خاکستر میں ایسی چنگاریاں
پیدا کیں کہ انہوں نے قدیم اور بوسیدہ نظام کو نذرِ آتش کر دیا۔ اور ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی جس نے ان میں وہ سب کچھ

بِ تعلیم کا خاصہ ہوا کرتا ہے۔ سینہ دریا پر بھاری بھرکم جہاز چلانے تعلیمی کے منجدھر میں پر اپنی استقامت کے جھنڈے
یئے چٹاں پر جب کسی سماج میں ذوقِ خود آگاہی پیدا ہو جاتا ہے۔ تو وہ زندگی کے متلاطم اور مواج دریا سے پیرتا ہوا۔
ست آگے نکل جاتا ہے۔

تازہ انداز نظر پیدا کند — گلستاں در دشت و در پیدا کند

عقلہا سرمایہ از پیرایۂ — بخشد ایں بے مایہ را سرمایۂ

بندہ ہا از پا کشاید بند را — از خداوندان رہاند بندہ را

گویدش تو بندۂ دیگر نۂ — زیں بتانِ بے زبان کمتر نۂ

ہمیں بھی اپنی اس گرد آلود فضا میں سورج کی اُن کرنوں کو دیکھنا چاہیے جو تاریکیوں کو چیرتی ہوئی مشرق کی بلند و بالا چوٹیوں کو ہی چومتی ہوئی نہیں گذر رہی ہیں۔ بلکہ پہاڑ کی بلندیوں کو چھوڑ کر وہ ان خزف ریزوں میں بھی چمک پیدا کر رہی ہیں جنہیں ہم آئے دن اپنے پاؤں سے روندتے رہتے ہیں۔ جب لندن کی تنگ و تاریک اور غلیظ گلیاں بجلی کے قمقموں سے منور ہو سکتی ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ خاور کی امیدوں کا مرکز آفتابِ تازہ سے جگمگا اُٹھے۔ جب کوئی قوم اپنے آپ کو بدلنا چاہتی ہے۔ اور اس میں بھر پور جھرجھری پیدا ہوتی ہے۔ تو جمود و تعطل کی بندشیں ایک انقلابی دور کی راہ میں متحمل نہیں ہو تیں۔ اور زندگی بھی اپنے تخیلات کی دُنیا میں قلابازی کھاتی نظر نہیں آتی بلکہ اپنے ماحول میں نئی راہیں پیدا کر لیتی ہے۔ ایسی متوازن اور ہموار کر ہر راہی کو اپنی منزل متعین کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مگر یہ سب اسی وقت ممکن ہے۔ جب پورا سماج اپنی ہیئت کذائی میں ایک تعمیری انقلاب لانے کا عہد کرلے۔ اور تعمیری انقلاب اسی وقت ممکن ہے۔ جب سماج کے پاس ایسے سانچے ہوں۔ جن میں وہ اپنے افراد کو اپنے مقتضیات کے مطابق ڈھال سکے اور یہ سانچے صرف مدارس ہی مہیا کر سکتے ہیں جو آنے والی نسلوں کی تربیت کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اور اگر ان دونوں میں ایک دوسرے کو سمجھنے کی صلاحیت نہ ہوئی تو مدرسہ میں جو سنگ و خشت اور چونا گارا تیار ہوگا۔ اس سے مستقبل میں کبھی شیش محل کی تعمیر کا کام نہیں لیا جا سکے گا۔

ہم زندگی کے ایک ایسے ہولناک دور سے گذر رہے ہیں کہ ہماری ایک لغزش پوری قوم کے پائے استقامت کو لرزا کر سکتی ہے۔ دو سو سالہ غلامی نے ہماری ہیئت اجتماعی کو کچھ اس طرح جھنجھوڑ دیا ہے۔ کہ قوم کے مردہ دلوں میں زندہ

احساس بھی باقی نہیں رہا۔ اس کی صورت اس بیمار کی سی ہے۔ جو مہینوں سے بیمار ہو اور اس کے مناسب علاج کی طرف کسی نے توجہ بھی نہ کی ہو۔ اس کے جسم میں اب استخوان و پوست کے سوا کچھ اور باقی نہیں رہا۔ لیکن معلوم نہیں اسے یہ احساس کس طرح پیدا ہو گیا ہے کہ وہ صحت مند ہے۔ اور صحت مندی کا یہ بے جا احساس مرض کو اور زیادہ شدید بناتا جا رہا ہے۔ ہمارا معاشرہ بھی بیمار ہے۔ اور اسے بھی اپنی بیماری کا احساس نہیں۔ آج جب وہ اقوام مغرب کو فضاؤں میں محو پرواز دیکھتا ہے۔ تو اس کے دل میں باد پیمائی کی خواہش تو ضرور پیدا ہوتی ہے۔ لیکن وہ انہیں سے بال و پر بھی مستعار لینے کی آرزو کرتا ہے۔ اور اس مانگی ہوئی خوشی کو ابدی مسرت متصور کرتا ہے۔ اسے احساس بھی نہیں ہوتا کہ دوسروں کے مارے ہوئے شکار سے کب تک کام و دہن کو لذت بخشتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے نے آج تک اپنے مدارس کو ان بلندیوں تک لے جانے کا عزم نہیں کیا۔ جس کے ذریعے وہ خود ایک بلندی سے دوسری بلندی تک پہنچ سکتے ہیں۔ ہمارے ملک کی بیشتر آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے۔ ہمارا کام ہے کہ زندگی کی اس برقی رو کو ان علاقوں میں بھی پہنچائیں جہاں چرواہوں کی مدھر تانیں اب بھی فضا کو مسحور کرتی رہتی ہیں اور درس و تدریس کا ایک ایسا نظام قائم کریں جس سے پورا سماج فائدہ اٹھا سکے اور یہ اجنبیت جان پہچان کی شکل اختیار کرے۔ جب کسی بوسیدہ دیہاتی مدرسے کے بچے کسی تالاب کے کنارے سنگ ریزوں سے گرداب پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہوں تو تالاب کے پانی کو گدلاتے ہوئے دیکھ کر گاؤں کے چودھری صاحب کی پیشانی پر غضبناک شکنوں کی بجائے، ہونٹوں پر تبسم کھیلتا نظر آئے کہ سماج کے بچے قدرت کی فیاضیوں سے اپنا دل بہلا رہے ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر کہ ہمارے مدارس میں فکر و نظر کی وہ گہرائی نہیں پائی جاتی جس کی ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے اور ہمارا سماج بھی اب تک اپنی قدروں کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکا۔ اور نہ ان دونوں میں مطابقت پائی جاتی ہے۔ ہم افراد میں ایسی شدید سری پیدا کر سکے کہ اس مسموم فضا میں بھی تر و تازگی اور شادابی کے امکانات قوی ہو جائیں اور باوجود ان دشواریوں کے جو ہمارے ماحول میں موجود ہیں ہمیں ایک ساز گار فضا پیدا کرنے کے لئے کوشاں رہنا چاہیئے۔ یہ فرض سب سے زیادہ مدارس پر عائد ہوتا ہے۔ اس تعاون کے حصول کے لئے پورے مدرسہ کو ان تھک کام کرنا ہوگا۔ اور اس میں صرف مدرسین ہی نہیں اسکول کے منتظمین کو بھی اپنے انتہائی شفقت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ اور پورے سماج کا جائزہ لیتے ہوئے ہر کام کو اس شخص کے سپرد کرنا ہوگا۔ جو اسے بطریق احسن سرانجام دے سکے۔ گویا ہمیں

کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور جب تک اجتماعی طور پر اہلِ مدرسہ اس کام کو اپنے ہاتھوں میں نہ لیں گے۔ سماج کی بے حسی کو مرتعش نہیں کیا جا سکے گا۔ اور نہ کوئی مدرسہ کوئی مناسب اور مفید مطلب خدمت سرانجام دے سکے گا۔ ہم ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں۔ ہر شعبۂ زندگی میں ایک انقلابی روح کارفرما نظر آتی ہے تعلیم کو بھی نئے حالات کا ساتھ دینا ہوگا۔ خذ ما صفا ہمیں ہر معدن سے لعل و در ہر دریا سے موتی نکالنے ہوں گے۔ اگر ہم مغرب کے ظاہری ٹیپ ٹاپ کو اپنی زندگی کا ایک جزو بناتے چلے جا رہے ہیں تو ہمیں مغرب کے اس آدرش کو بھی اپنانا ہوگا جس سے ان کا سازِ زندگی مرتعش ہوتا ہے۔ اس وقت مغرب کے پورے تجربات کو ہم اپنی سماجی زندگی میں منطبق نہیں کر سکتے، اور یہ کچھ قرینِ مصلحت بھی نہیں ہے کہ مغرب کی ڈھیلی ڈھالی قبا سے ہم اپنے نحیف اور منحنی جسم کو ڈھکنے کی ناکام کوشش کریں۔ اس میں کافی قطع و برید اور کتر بیونت کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ لباس ہمارے اپنے جسم پر راست آ جائے۔ آج جب کہ ہماری اقتصادی حالت بھی اتنی عمدہ نہیں ہے۔ کہ ملک کے طول و عرض میں اچھے اور مثالی مدارس قائم کئے جا سکیں اور انہیں ان بنیادوں پر استوار کیا جا سکے۔ جس سے ہماری سماجی زندگی متمتع ہو سکے۔ انہیں ٹوٹے پھوٹے مدارس سے ہی عظمت و بلندی کے محل تعمیر کرنے ہوں گے۔ ہر صورت ان مدارس کی افسردہ فضاؤں میں زندگی کا سوز و ساز پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی مدارس ہماری سماجی ضروریات کو پورا کرنے والے مراکز بن سکتے ہیں۔

اس ملک کی بیشتر آبادی اَن پڑھ اور جاہل ہے۔ اور جنہیں پڑھا لکھا تصور کیا جاتا ہے۔ ان میں زیادہ تر ایسے لوگ شامل ہیں جو اپنے روزمرہ کے کاروبار میں بھی دوسروں کی استعانت کے محتاج ہوتے ہیں اور جس قوم میں تعلیم کا ایسا عالمگیر فقدان ہو اس کا زندگی کے کسی شعبہ میں ترقی کرنا ناممکن نہ ہوگا۔ بہر صورت تعلیم کو ارزاں کرنے کے لئے شہری اور دیہاتی علاقوں میں مدارس کو تعلیم بالغاں کا مرکز بن جانا چاہیئے۔ ان پر جہالت کے خلاف مسلسل جہاد کرنے کا عظیم فرض عائد ہوتا ہے۔ انہیں اپنی نگاہوں کو بالغوں کے تعلیمی مسائل پر مرکوز کر دینا چاہیئے۔ بالغوں کو تعلیم دینا دراصل ان کے بچوں کو تعلیم دینا ہوتا ہے۔ کیوں کہ جب ان میں کچھ لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہو جائے گا اور وہ اس پہنا ورفضا میں ہم صفیران چمن کے ساتھ زیادہ اونچے اونچے، شفق کے قرمزی پھولوں تک پر افشاں نہ ہو سکیں تو کوئی مضائقہ نہیں البتہ یہ ہوگا ہے کہ دوسروں کو محوِ پرواز دیکھ کر وہ اپنے بال و پر کو سمیٹے بیٹھے رہنے کی عادت کو چھوڑ دیں گے۔ اس طرح وہ اپنے بچوں کی زندگی میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ ایک مسلّمہ تعلیمی اصول ہے کہ بالغوں میں کام کرنے کی زیادہ صلاحیت

لی ہے ۔ وہ ہر چیز کو ایک مخصوص زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں ۔ اور زمانہ کے اونچ نیچ کا مشاہدہ کرنے
کے بعد، وہ تعلیم کی افادیت سے بھی بخوبی واقف ہو جاتے ہیں ۔ ایک بالغ جلد لکھ پڑھ کر سماج کی ذہنی اخلاقی اور
اقتصادی حالت کے درست کرنے میں ممد و معاون ہو سکتا ہے ۔ قوموں کی زندگی میں ایک لمحہ بھی بہت قیمتی ہوتا ہے
اگر ہم اپنے ہر کام کو اس وقت کے لیے اٹھا رکھیں گے ۔ کہ جب نئی پود علم و فن میں مہارت حاصل کر لے گی ۔ تو پھر وہ
ان ہمت آزما کاموں کو سر انجام دے گی ۔ تو گویا ہم خود بہت بڑی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں بلکہ ہم خود ہی قومی خودکشی
کے موجب بن جاتے ہیں ۔ آنے والی نسل کی تعلیم پر زور دے کر اپنی فوری تعلیمی پروگرام کو معرضِ التوا میں ڈالنا بعید از عقل
فہم ہے ۔ روس، ترکی اور میکسکو کے تجربے ہمارے سامنے ہیں میکسکو اتنا ترقی یافتہ ممالک نہیں ہے ۔ اور اس کے مسائل
بھی بڑی حد تک یہی ہیں ۔ جن سے ہمیں دوچار ہونا پڑتا ہے چناں چہ صحیح جمہوریت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ پورے سماج
کو اس قدر متوازن بنا دیا جائے کہ ہر شخص، اخلاقی اور اقتصادی توازن کو قائم رکھ سکے ۔ ان پڑھ اور جاہل افراد میں
جمہوریت کو فروغ دینا، جمہوریت کا منہ چڑھانا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک ہم آزادی کے صحیح مفہوم کو نہیں سمجھ سکے
اور حالانکہ اس آزاد فضا میں زندگی کے پورے پانچ سال گزارے جا چکے ہیں ۔ لیکن ہمارے چہروں پر اب بھی غلامی کی
گرد جمی ہوئی ہے ۔ چہرے کی اس دھول کو دھونے کے لیے تعلیم کے صاف شفاف، اور بہتے ہوئے چشمے کی ضرورت ہے
تعلیم بالغاں دیہاتوں کی تعمیر نو میں ایک کامیاب اور نمایاں حصہ لے سکتی ہے ۔ ان کی اقتصادی اور ثقافتی قدروں
کو بروئے کار لانے میں ایک موثر اقدام کر سکتی ہے ۔ اور دراصل جب ان کی سماجی اخلاقی اور ذہنی تربیت میں زندگی
کا دور ہوگا ۔ جسے قومی ترقی کی درمیانی کڑی منصور کیا جا سکتا ہے ۔ تو بڑی آسانی سے دیہاتی زندگی میں ایک انقلاب
برپا کیا جا سکتا ہے ۔ تعلیم بالغاں سے صرف یہ مفہوم مقصود نہیں ہے ۔ کہ جوان اور ادھیڑ عمر انسانوں کو لکھنا پڑھنا یا حساب
کے چند اصول سکھا دیئے جائیں اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے ۔ کہ ان میں حفظانِ صحت، سماجی تنظیم، باہمی تعاون
اور اشتراکِ عمل کے جذبات کو برانگیختہ کیا جائے تاکہ وہ اس تعلیم کے صحیح مصرف کو سمجھ سکیں معلمین کے ساتھ ساتھ
کمیونٹی طلبہ کو بھی اس سماجی خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیئے ۔ اگر تعلیم بالغاں کا رضاکارانہ نظام کامیاب ثابت نہ
ہو تو اسے لازم قرار دیا جائے کیونکہ تعلیم بالغاں کے سلسلے میں اب تک جو کوششیں ہوئی ہیں ۔ ان سے کوئی خاص
نتیجہ برآمد نہیں ہوا ۔ اور فی الحقیقت ایک دو تقریروں سے یا کاغذی خانہ پری سے کسی اچھے نتیجے کی توقع بھی نہیں کی

جا سکتی۔ حکومت نے بھی اس سلسلے میں ایک اسکیم مرتب کی ہے جس کی رو سے تنگ و تاریک گوشوں میں علم کی شمع روشن کرنے کا عزم کیا گیا ہے۔ لیکن گوناگوں سیاسی اور اقتصادی مسائل اور اچھے کارکنوں کا نہ ملنا ترقی کی بڑھتی ہوئی رفتار کو روک دیتا ہے۔ بہرصورت آگے چل کر تعلیم بالغاں کا جو نظام بھی منظرِ عام پر آئے۔ مدرسہ کو اس سلسلہ میں ایک اہم تم بالشان پارٹ ادا کرنا ہوگا۔ اسے اپنی زندگی کا ثبوت دینا ہوگا۔ اسے اپنے سوز دروں سے وہ شعلہ پیدا کرنا ہوگا۔ جس سے پورا ماحول تاباں ہو جائے۔ اور بقول خواجہ غلام السیدین "اگر مدرسہ اس محنت کو عین محبت تصوّر کر کے اس تحریک کی بنیاد ڈالتا ہے۔ اور اگر اس کی تکمیل کی بھی کوشش کی گئی تو مجھے یقین ہے کہ انہیں مختلف صورتوں میں اس کا معاوضہ ضرور مل جائے گا"

تعلیم بالغاں سے قطع نظر، چوں کہ مدرسہ کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے کام کے بہتر بنانے میں مدد دے تاکہ وہ سماج کے زیادہ متمدن اور کار آمد ممبر بن سکیں۔ اس لئے اسے سماجی اداروں میں سب سے اونچا مقام دینا چاہئے اور انہیں سماجی خدمات کا مرکز بن جانا چاہیئے۔ اس میں شکستہ سڑکوں کی مرمت، ٹوٹے ہوئے پلوں کی تعمیر، بہم رسانی آب، اپنے علاقے کی صفائی، حفظانِ صحت اشیاء خوردنی کا بندوبست، پانی کے نکاس کا اہتمام اور اسی قسم کی دوسری معمولی مگر ضروری چیزیں شامل ہوں کیوں کہ یہی وہ امور ہیں جن پر ہمیں زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ دیہاتی ماحول میں جہاں زندگی اس قدر مشکل ہے۔ کہ بعض اوقات ضرورت کی معمولی چیزیں بھی میسّر نہیں آتیں۔ رسل و رسائل کے ذرائع اتنے محدود ہیں کہ ان غریبوں کے لئے طبّی امداد جوئے شیر لانے سے کم دشوار نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہروپئے حکیم اور مارکوپولو کے اتار ے ہوئے کوٹ پتلون اور بوسیدہ ہیٹ اوڑھنے والے ڈاکٹر اپنی دوکان سجا کر بیٹھتے ہیں۔ اگر کسی مریض نے اپنی بیماری پر غلبہ پالیا تو ان کی عیسیٰ نفسی مسلم اور اگر ان کی اکسیر نے اپنا اعجاز نہ دکھایا تو "مشیت ایزدی کو یہی منظور تھا" ایڈرن ڈیک کے کوہستانی گاؤں کے مدرسہ کی طرح ہم اپنے مدارس کو بھی عوام کی صحت و صفائی کا مرکز بنا سکتے ہیں۔ ان مختلف سماجی کاموں میں طلبہ اور معلمیں اور معاشرہ کے دوسرے سنجیدہ حضرات کی مساعی سے پورے علاقے میں ایک تعمیری انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ اور اس تعمیری انقلاب کی اس وقت ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ شہروں میں طلبہ آئے دن سیاسی الجھنوں میں پڑ کر مقاطعات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ جس سے تخریبی عناصر کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے۔ اگر انہیں طلبہ کی توجہات کو سماجی خدمات کی طرف منعطف کر دیا جائے

تو وہ اپنی فالتو توانائی کے اخراج کے لئے ایک وسیع میدان پا کر اس میں اپنا اپنا مقام تلاش کریں گے۔

زراعت دیہاتی زندگی میں رگِ جاں کا درجہ رکھتی ہے۔ سائنس کی محیر العقول معلومات نے ہر شعبۂ زندگی کو متاثر کیا ہے۔ جدید ایجادات کی روشنی میں زراعت نے بھی کافی ترقی کر لی ہے۔ ٹریکٹر اور کنبر پلر اور دوسری زرعی مشینوں کے استعمال نے کھیتی باڑی کو آسان مفید اور زیادہ قابلِ قدر بنا دیا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں کاشت کے ہزار سالہ پرانے طریقے اب بھی رائج ہیں۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ ہو یا کڑاکے کی سردی، لو کے تند و تیز جھونکے ہوں یا سرما کے زمہریری جھکڑ، پسینے میں شرابور ہو یا سردی سے منجمد، کسان اپنی قدیم روایات پر کاربند زندگی کی شاہ راہ پر رینگتا دکھائی دیتا ہے۔ جو کام ایک آدمی تھوڑی سی محنت سے تھوڑی سی دیر میں کر سکتا ہے۔ وہ اس میں دن رات لگا رہتا ہے۔ اور پھر بھی وہ اُسے پورا نہیں کر سکتا اور اس میں صرف وہی مصروفِ کار نہیں رہتا۔ بلکہ اس کا پورا گھر اس کا ہاتھ بٹاتا رہتا ہے۔ اور یہ محنت کش پھر بھی حوادثِ روزگار کا شکار رہتے ہیں۔ اس لئے جہاں مدرسہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ انہیں آدابِ معاشرت سکھائے اس کا فرض ہے کہ وہ انہیں زراعت کے جدید طریقوں سے بھی روشناس کرائے۔ لیکن ان طریقوں کو محض بیان کر دینا کافی نہیں ہوگا۔ بلکہ جب تک اس کی عملی تشریح نہیں کی جائے گی۔ وہ اسے بعید از فہم سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ لیکن جب اس کی افادیت ان کی اپنی آنکھوں کے سامنے ہوگی۔ تو باہمی اشتراک و تعاون سے وہ خود اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ یہی عملی توضیحات ان کے خیالات کے دھارے کو موڑ سکتی ہیں۔ اور وہ خود دوسروں سے کاندھا ملانے کے لئے اپنی خمیدہ کمر کو سیدھا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور کچھ دنوں کے بعد ہمارے کسان بھی زندگی کے جدید نظریات کے حامل نظر آنے لگیں گے۔ کیوں کہ اگر ان کے مزاج و آہنگ میں کوئی بنیادی تغیر واقع نہ ہوا تو یہ فطری وسائل جن کی اس دیس میں کثرت ہے۔ ہمارے لئے غیر ممنوعہ ہو کر رہ جائیں گے۔ بقول مسز رائٹ سنگر۔

"زمین کا ایک قطعہ ممکن ہے زرخیز ہو۔ اس میں پانی کی فراوانی بھی ہو، معدنیات کے خزانے بھی ہوں لیکن اگر اس میں بسنے والوں میں اسے وسعت دینے کے لئے اس کی بنیادی اہمیت کا ہی فقدان ہو تو اس قوم کو غیر ترقی یافتہ اقوام میں شمار کرنا بے جا نہ ہوگا اور اس کے برعکس ایک علاقہ جس کے ارضی وسائل بہت ہی معمولی اور حقیر ہوں۔ لیکن اگر اس کے باشندے توانا، تندرست، چست و چالاک اور عقیل و فہیم

ہوں گے تو ان میں تخلیقی قوتیں بھی ہوں گی ۔ اور زندگی کے اچھے مقاصد کے حصول کے لئے ان میں اتحاد بھی ہوگا ۔ تو پھر وہ بنی نوع انسان کی قیادت میں رواں دواں آگے بڑھ سکتے ہیں ۔

فطری وسائل ، زندگی کو سہولت بہم پہنچانے کے لئے ضروری ہوتے ہیں ۔ لیکن یہ اس وقت مفید کارآمد اور اہم ہوتے ہیں ۔ جب عوام کو تعلیم دی گئی ہو ۔ کہ وہ اس کی آرزو کریں اور جب انہیں ہنرمند ہاتھوں نے انہیں ایک خاص شکل میں ڈھال دیا ہو ۔ مادی وسائل ایک مرتبہ استعمال میں آئے اور ختم ہو گئے ۔ لیکن اگر فہم و فراست سے اسے ترقی دینے کی کوشش کی گئی تو ان وسائل کو بہت زیادہ بڑھایا جا سکتا ہے ۔ کلچر اور زیادہ کلچر پیدا کرتا ہے ۔ جب سینکڑوں گھروں میں صوت ، بصیرت ، اخلاص و تحسین اور حسن کردار کی جلوہ نمائی ہوگی تو آنے والی نسلوں کا اس سے فائدہ اُٹھانا یقینی ہے ۔ اور اگر انسانی وسائل کو بروئے کار لانے میں تغافل برتا گیا تو اس سے الم ناک نتائج ظہور میں آ سکتے ہیں ۔ ایک بھولی بھٹکی سوسائٹی میں کبھی ایمان و ایقان نہیں پیدا ہو سکے گا ۔"

مالی و اقتصادی اعتبار سے بھی ہمارا معاشرہ کچھ زیادہ خوش حال نہیں ہے ۔ جہاں ہم میں چند افراد ایسے ہیں کہ خوش قسمت لوگ ہیں زندگی مسرتیں خنداں خنداں نظر آتی ہیں ۔ تو ہم میں کچھ ایسے بھی ہیں کہ جنہیں اگر صبح کو روٹی میسر ہوتی تو شام کو وہ نان شبینہ کے محتاج ہوتے ہیں ۔ اور حق یہ ہے کہ اکثریت انہیں کی ہے ۔ جن کے وسائل محدود اور ذرائع مفقود ہوتے ہیں جو اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کی وجہ سے تعلیم گاہوں کی سجی سجائی دوکانوں سے اپنے بچوں کے لئے کوئی سودا نہیں خرید سکتے ۔ اور اول تو بہت کم ایسے ہوتے ہیں جنہیں اپنے بچوں کی تعلیم کا خیال ہوتا ہے اور اگر خال خال ایسے بیدار مغز نظر بھی آتے ہیں ۔ تو وہ اپنی معاشی مشکلات کا شکار ہو کر اپنے بچوں کو بھی وہی طریق و آداب سکھاتے ہیں ۔ جو خود ان کی زندگی میں نمایاں ہے ۔ دیہاتی اور شہری مدارس میں "بنیادی تعلیم" کے نظریہ کے پیش نظر ایسے صنعتی ادارے کا انتظام کرنا چاہیئے ۔ جس میں ایسے بچے بھی حصہ لے سکیں جو ان میں گھر کی معاشی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے یا گھر کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اپنے والدین کا ہاتھ بٹاتے ہیں ۔ تو دات میں مدرسہ کی پرسکون فضا میں کچھ ایسے ہنر سیکھ سکیں جس سے انہیں اپنے مستقبل کے پیشہ کو متعین کرنے کا موقع مل سکے ۔ معاشی بحران اور اقتصادی زبوں حالی ہمارے دیہاتوں کے دوش بدوش ہیں ۔ اگر انہیں مدارس کو درسی تعلیم کے ساتھ ساتھ گھریلو صنعتی تعلیم کا بھی مرکز بنا دیا جا

غالباً اس سے پوری قوم کو معتدبہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ زندگی کی بہت سی الجھنوں کا مداوی ہو سکتا ہے۔ اور ایسے مسائل جنہیں اس وقت ہم لاینحل سمجھتے ہیں صاف اور واضح معلوم ہوں گے۔ ہمارے موجودہ سماج میں اہل حرفہ کا مقام، مجلس میں جوتیوں کے قریب قریب ہوتا ہے۔ ہم ان کی صناعی اور ان کی محنت کے محتاج ہوتے ہیں ان کی بنائی ہوئی چیزوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن اس کے عوض میں ہمارے دل میں ان کے لئے حقارت اور نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ہمیں ملک کی توسیع و بقا کے لئے اپنے اُس نظریہ کو بدلنا ہوگا۔ صنعتوں کی اہمیت کو سمجھنا ہوگا۔ اور انہیں اپنی روزمرہ زندگی کا ایک جزو قرار دینا ہوگا۔ گھریلو صنعتوں میں موزے بنیان بننا، پارچہ بافی کا اہتمام کرنا، لکڑی کا کام سکھانا، نقش و نگار بنانا مستورات کے لئے خیاطی، کشیدہ کاری اور اس قسم کی اور صنعتوں کے سکھانے کا انتظام بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح مجموعی طور پر سماج کی اجتماعی زندگی پر اس کا نہایت عمدہ اثر پڑے گا۔ زندگی محض تصورات کا گورکھ دھندا نہیں ہوگی۔ مدارس محض تخیلی ایوان نہیں ہوں گے۔ بلکہ اس کے تربیت یافتگان اپنے مسائل کو خود حل کرنا سیکھ جائیں گے۔ اور جب وہ اپنے اقتصادی بکھیڑوں میں اس قدر الجھے ہوئے نہیں ہوں گے۔ تو وہ سماج کے لئے بھی زیادہ اچھا کام کر سکیں گے۔ لیکن اگر سماج کی اس روح کو ہی بیمار رکھا گیا اور اس کے علاج کی طرف توجہ نہ کی گئی تو اگر اس کی بیماری ایک وبائی صورت اختیار کر کے پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لے تو ہمیں اس وقت اپنے مقدر کی شکایت میں لب کشائی زیب نہیں دے گی۔ بے محل نہ ہوگا اگر اس جگہ زیر لب یہ بھی کہہ دیا جائے کہ مدرسہ کو سماج کے لئے مفید مطلب بنانے کی زیادہ تر ذمہ داری موجودہ پڑھے لکھے طبقہ پر وارد ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنے آرام گاہوں کے بلند و بالا جھروکوں سے اس زندگی کا مشاہدہ کریں جو اپنی بے کسی اور اپنی کس مپرسی کا رونا روتی نظر آتی ہے۔ ان خاردار جھاڑیوں کو دیکھیں جس میں پورا معاشرہ پھنسا ہوا ہے اور ان کانٹوں کی چبھن اپنے دل میں محسوس کریں۔ اس الجھاؤ کا تجزیہ کریں اور پھر ان بندگان خدا کے الجھے ہوئے دامنوں کو ان کانٹوں سے نجات دلانے کا عزم کریں تو ان ہونٹوں پر بھی تبسم کھیلتا نظر آئے گا۔ جو آج قنوطیت کا شکار ہو رہے ہیں۔ انہیں اس سلسلے میں آگے بڑھنا ہوگا۔ اور مجاہدانہ عزم کے ساتھ۔ کیوں کہ یہ صرف انہیں کا کام ہے۔ کہ وہ تعلیم کی ماہیت اور اس کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ایک واضح اور متعین پروگرام مرتب کریں۔ اور انہیں مدارس کے ذریعے ایک ایسی ہم آہنگی پیدا کریں کہ سماج کی متوازن زندگی میں کوئی سقم پیدا نہ ہونے پائے۔

لیکن اس ارتباط کے لئے افہام و تفہیم ہی کافی نہیں ہوتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سماج کو مدرسی پروگرام کا پورا پورا علم ہو

لیکن اس کے باوجود اس سے بے اتفاقی کی توقع بعید از قیاس نہیں ہے ۔ صرف آپس کا میل جول اور باہمی اقتدار ہی اس مطابقت کا ضامن ہو سکتا ہے ۔ بہر حال یہ سماج کی توجہات کو اپنی طرف منعطف کرنے میں مختلف فعالیتوں کا اہتمام ایک زبردست قوت ثابت ہو سکتا ہے ۔ کسی کام کی تکمیل کے لئے پہلا قدم ضرورت کا احساس ہوتا ہے ۔ اور دوسرا قدم اس ضرورت کو پورا کرنے کی آرزو ۔ اور جب سماج مقامی تعلیمی سہولتوں اور اس کے معیار سے پوری طرح واقف ہو جاتا ہے ۔ اور اپنی ضرورت کا احساس بھی شدید ہو جاتا ہے ۔ تو مشکل سے مشکل اور سخت سے سخت کام بھی اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے ۔ اور پھر اس کے کوہ وقار عزائم کو کوئی طاقت متزلزل نہیں کر سکتی ۔ اپنی قوت اپنا مال اور اپنا وقت صرف کرنا آسان نہیں ہوتا ۔ لیکن اگر ضرورت کا احساس پیدا ہو جائے تو ذاتی مساعی ، دولت اور وقت سماجی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وقف کی جا سکتی ہیں ۔ دراصل اگر ہم ان جذبات سے سرشار ہو کر آگے بڑھیں گے ۔ تو ایک اچھے مدرسے کے قیام کی آرزو ہمارے دلوں میں آپ سے آپ پیدا ہو جائے گی ۔ اور ہماری ان تھک کوششوں کے سامنے مصائب کی تند و تیز آندھیاں بھی انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گی ۔ اور اس طرح اگر اسے کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنا ہے اور اگر اس ملک میں بسنے والوں کو کامیاب اور ہوش مند زندگی بسر کرنی ہے ۔ تو ہر تعلیمی ادارے کے لئے دیہات کی تعمیر نو میں حصہ لینا ناگزیر ہوگا ۔ اور شہری اور دیہاتی مدارس کو سماجی خدمات کے اہم مراکز میں تبدیل کرنا ہوگا ۔

ایمیل
یا
روسو کی تعلیم

مسلسل ۱۰

محتاجی

یہ امور نہایت وزنی اور اہم ہیں اور ان ہی میں ہمارے مابہ النزاع سماجی مسائل کا حل موجود ہے۔ محتاجی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو اشیا کی محتاجی جو قدرت کا فعل ہے اور دوسری لوگوں کی محتاجی جو سماج یا تمدن کا فعل ہے۔ اشیا کی محتاجی اخلاقیات سے غیر متعلق ہونے کے باعث آزادی کو ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچاتی اور نہ ہی اس وجہ سے کوئی بری خصلت یا عادت پیدا کرتی ہے۔ لیکن لوگوں کی محتاجی غیر منظم[1] ہونے کی وجہ سے ہر قسم کی برائی پیدا کر دیتی ہے اس کے باعث آقا غلام یا دونوں ہی تباہ اور برباد ہو جاتے ہیں۔ اس سماجی خرابی کا کوئی علاج اگر ہے تو وہ یہی ہے کہ قانون کو افراد کا نمائندہ بنایا جائے اور عوام کی مرضی کو ایسی حقیقی طاقت سے مسلح کیا جائے جو ہر انفرادی مرضی کی قوت سے آزاد ہو۔ اگر قانون قدرت کے مانند قوانین اقوام کو بھی کوئی انسانی قوت پامال نہ کر سکے تو لوگوں کی محتاجی بھی اشیا ہی کی محتاجی کے مانند ہو جائے۔ اور قدرتی نظام کے جملہ فوائد جمہوری سماجی زندگی کے فوائد میں پیوستہ ہو جائیں اور آدمی کو بدی سے محفوظ رکھنے والی آزادی آدمی میں جوہر پیدا کرنے والے اخلاق سے متحد ہو جائے۔ بچے کو صرف اشیا کا محتاج رکھیے۔ اس نصاب تعلیم سے آپ قدرتی نظام کی اتباع فرمائیں گے۔ بس اس کی غیر معقول خواہشات کی مدافعت صرف طبعی رکاوٹوں کے ذریعہ فرمائیے یا ان سزاؤں کے ذریعہ فرمائیے جو اس کے ذاتی اعمال کا قدرتی نتیجہ ہوں۔ یہ سب ایسے سبق ہوتے ہیں جو اسی قسم کے حالات کے دوبارہ رونما ہونے پر فوراً خود بخود ہی یاد آ جاتے ہیں بس اتنا ہی کافی ہے کہ عملاً منع کیے بغیر اسے برے کام سے روک دیا جائے۔ تجربہ یا ناتوانی قانون کی جگہ حاصل کرے۔ جو چیز وہ حاصل کرنی چاہتا ہے اسے وہ نہ دیجیے بلکہ جب چیز کی اس کو ضرورت ہو وہ فراہم کیجیے۔ نہ اس کی اطاعت کا سوال ہو اور نہ آپ کی محکومی کا۔ پس اس کی آپ اتنی ہی کمزوری کو پورا کریں

[1] روسو نے اپنی کتاب "معاہدہ عمرانی" (اصول قانون سیاسی) میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ سماجی نظام میں کوئی شخص اپنی خانگی مرضی کے مطابق حکومت نہیں کر سکتا ہے۔

جتنی کہ اسے آنا دی کے لئے درکار ہو اور وہ بھی اس طرح کہ آپ کی خدمات کو فخر ماتے ہوئے قبول کرے اور اس وقت کا شدت سے انتظار کرتا رہے جس وقت کہ وہ ان خدمات سے بیگانہ ہو کر اپنی خدمات اپنے آپ انجام دے سکنے کا شرف حاصل کر سکے گا۔

فطرتی اور غیر فطرتی حاجتوں میں تفریق

بچے کی نشوونما کا قدرت بطور خود اہتمام کرتی ہے اس کام میں اس کی کبھی مزاحمت نہ ہونی چاہئے پس جس وقت وہ بچہ کا دوڑنا چاہے اس وقت آپ اُسے خاموش نہ بیٹھنے دیں اور نہ جب کہ وہ خاموش بیٹھنا چاہے آپ اُسے دوڑائیں اگر اپنی فاش غلطیوں سے ہم اپنی اولاد کی طبیعت نہ بگاڑیں تو ان کی خواہش تاثرات سے آزاد رہی ہے۔ ان اپنی آرزو کے موافق آپ دوڑنے کودنے اور چلانے دیجئے۔ یہ سارا چلبلا پن اور شوخی ان کی جسمانی قوت کی نشوونما کے لئے طبعی ہوتی ہے۔ لیکن اُن امور کو آپ مشتبہ نگاہ سے دیکھئے جن کی تکمیل وہ بذات خود نہ کر سکتے ہوں بلکہ جو ان کے لئے دوسروں کو پورا کرنے پڑتے ہوں۔ اس کے بعد آپ کو فطرتی اور غیر فطرتی حاجتوں میں تمیز کرنا بھی بے حد ضروری ہے یعنی ابھرتے ہوئے تاثرات کی پیدا کردہ ضروریات اور محض بالائی اسباب زندگی کے باعث وجود میں آنے جانے والی ضروریات کے مابین امتیاز کرنا بہت ضروری ہے۔

ضد اور مچلنے سے متاثر نہ ہونا چاہئے

یہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ جب کبھی بچہ اس چیز یا اس چیز کے لئے چیخ پکار مچائے یا ضد کرے تو اس وقت کیا کرنا چاہئے اب میں اس میں صرف اتنا اور اضافہ کرتا ہوں کہ جب وہ اپنی ضرورت زبان سے بیان کر سکتا ہو اور وہ اس کا مطالبہ کر اور ساتھ ساتھ آنسو بھی بھروئے تاکہ اس کا کام فوراً ہی پورا کر دیا جائے یا اس لئے کہ اس کا کام پورا کرنے سے کوئی انکار نہ کر سکے تو اس کا سوال کسی حال بھی پورا نہ کیا جانا چاہئے۔ اور اگر اس کا سوال حقیقی حاجت پورا کرانے کے لئے ہو تو آپ کو لازماً اس چیز کو پہچاننا چاہے اور فوراً ہی اسے پورا کر دینا چاہئے۔ لیکن اس کے آنسوؤں پر ترس کھا کر اس کی خواہش کو پورا کرنا تو گویا رونے چلانے کی اُسے اور بھی زیادہ ترغیب دینا ہے۔ اور اسے یہ سکھاتا ہے اور وہ آپ کی نوازشوں اور مہربانیوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھے اور یہ سمجھے کہ اپنے ذاتی نیک ارادے کی نسبت آپ اس کے مچلنے اور ضد کرنے کا زیادہ اثر لیتے ہیں۔ اگر وہ آپ کا شفیق دیکھے گا تو فوراً ہی وہ آپ کو نامہربان خیال کرنے لگے گا۔ اور اگر وہ آپ میں کمزوری دیکھے گا تو فوراً ہی وہ

ضدی اور ہٹ دھرم بن جائے گا جو کچھ آپ اس کو دینا چاہیں وہ فوراً آپ کو دے دینا چاہیئے ۔ انکار کرنے میں آپ بہت احتیاط سے کام لیں لیکن ایک مرتبہ انکار کر دینے کے بعد پھر آپ اپنا ارادہ ہرگز نہ بدلیں ۔ سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ چیز ہے کہ آپ اخلاق اور تہذیب کی وہ مصنوعی اور لایعنی لفاظی بچے کو ہرگز ہرگز نہ سکھائیں جو بچے کے حالی موالیوں کو مطیع کرنے اور بچوں کی خواہشیں کی فوری تکمیل کرانے کے لئے جادو کا کام دیتی ہے ۔ امیروں اور رئیسوں کی مصنوعی تعلیم و تربیت انہیں ایسے الفاظ اور جملوں سے آشنا کرا کر جن کی عدم تعمیل سے کوئی منہ نہ موڑ سکے ان لڑکوں میں ہمیشہ تحکمانہ شائستگی پیدا کر دیتی ہے ۔ ان کی اولاد درخواست کرنے کے نہ تو لہجے سے واقف ہوتی ہے نہ طریقے سے ۔ ان کی درخواست ایک حکم کے مانند بلکہ اس سے بھی زیادہ پُر رعونت اور خود سرانہ ہوتی ہے ۔ گویا کہ انہیں اپنی بات کے مانے جانے کا اور بھی زیادہ یقین ہوتا ہے ۔ پس آپ یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ "اگر آپ کو تکلیف نہ ہو" کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ "ہماری یہ مرضی یا حکم ہے" اور "میں استدعا کرتا ہوں" کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ "میں حکم دیتا ہوں" یہ بھی بھلا کیا عجیب اخلاق ہے کہ محض الفاظ کے معنوں کے الٹ پھیر ہی میں تحکمانہ شان پیدا ہو جاتی ہے ۔ اپنی حد تک خود بین اور مغرور ہونے کی بجائے میں ایمیل کا گنوار رہنا ہی زیادہ پسند کرتا ہوں یعنی یہ کہ "اگر تکلیف نہ ہو" کے حاکمانہ الفاظ استعمال کرنے کی بجائے وہ استدعاً "فلاں کام کر دو" کہے مجھے ایمیل کے مستعملہ الفاظ سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ مجھے تو ان الفاظ کے مطالب سے غرض ہے ۔

تشدد اور لاڈ دونوں میں مبالغہ نہ کرنا چاہیئے

بے حد جبر و سختی اور بے حد لاڈ و پیار ہر دو سے احتراز کرنا ضروری ہے اگر آپ بچوں کو تکلیف میں رکھیں گے تو ان کی صحت اور جان دونوں خطرے میں پڑ جائیں گی اور آپ ابھی سے انہیں مصیبت زدہ بنا دیں گے ۔ اور اگر آپ ان کی چھوٹی سے چھوٹی تکلیف دور کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ سعی فرمائیں گے تو آپ ان کے مستقبل کے لئے ہجوم مصیبت کا سامان مہیا فرما دیں گے اور انہیں نازک مزاج اور نہایت ذی حس بنا دیں گے ۔ آپ انہیں آدمیت کے اس رتبے سے گرا دیں گے جس کی طرف باوجود آپ کی ساری کوششوں کے بھی ان کو دیر سویر رجوع ہونا ضروری ہے آپ کو اس نوبت پر شاید یہ خیال پیدا ہو کہ میں بھی اسی مغالطہ میں پڑ گیا ہوں جس میں کہ وہ نالائق والدین مبتلا ہو جاتے یا پھر مجھ کو بھی اسی وجہ سے مورد الزام ٹھہرا چکا ہوں کہ وہ محض ایسے مستقبل کے حصول کے لئے جو شاید ان کی اولاد کو کبھی نصیب نہ ہو اپنے بچوں کی خوشیاں قربان کر دیتے ہیں ۔

یہ بالکل غلط ہے کیوں کہ جو آزادی میں نے اپنے بچے کو دے رکھی ہے وہ اسی تھوڑی سی تکلیف کا معاوضہ ہے جو اس کو پہنچ چکی ہے۔ میں بچوں کو دیکھتا ہوں کہ برف میں کھیلتے وقت مارے سردی کے نیلے پڑ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ انگلی تک بمشکل ہی ہلا سکتے ہیں۔ وہ اگر چاہیں تو آگ کے پاس جاکر سینک سکتے اور گرم ہو سکتے ہیں۔ لیکن اسے وہ کبھی پسند نہیں کرتے۔ پس اگر آپ ان بچوں کو مکان کے اندر آنے کے لئے مجبور کریں تو اس پابندی کی تکلیف اس سردی کی شدت کی نسبت انہیں صدہا درجہ زیادہ محسوس ہوگی اب فرمائیے کہ آپ کا اعتراض کہاں گیا؟ اب آپ کے بچے کو اس مصیبت میں ڈال کر جسے کہ وہ بدل و جان جھیلنے کو تیار ہے کیا میں مصیبت زدہ بنا دوں؟ بچے کو آزادی دینے کے عمل سے میں وقتیہ بھلائی میں اس کی معاونت کرتا ہوں اور ان تکالیف اور مصائب کے خلاف جو آئندہ زندگی میں اسے پیش آنے والے ہیں اسے مسلح کر کے میں اس کی آئندہ کی بھلائی بھی حاصل کر لیتا ہوں۔ اب اگر اس کو میرے اور آپ کے مابین اس کی مرضی کے مطابق اختیار دے دیا جائے تو کیا منٹ بھر بھی وہ انتخاب میں دیر لگائے گا؟

کیا آپ کے خیال میں کسی کو قدرتی نظام کے باہر کہیں اور بھی کوئی حقیقی مسرت حاصل ہو سکتی ہے اور یہ کہ جب آپ کسی کو تمام مصائب سے محفوظ رکھنے کی سعی فرماتے ہیں تو کیا آپ قدرتی نظام سے علیحدہ نہیں کر دیتے ہیں؟ اتنا تو بیشک میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ عظیم الشان خوش نصیبی سے لطف اندوز ہونے کے لئے ایک شخص کو خفیف ترین مصائب کا تجربہ ہونا چاہیے جو فطرتی چیز ہے۔ جسمانی تندرستی کی زیادتی اخلاق خراب کر دیتی ہے ایک شخص جو تکلیف ہی سے بالکل ناآشنا ہو وہ خلق اللہ اور اپنے بھائیوں پر رحم کھانے کے قابل کبھی نہ ہوگا۔ اور ہمدردی و خدا ترسی کے مزے سے ہی انجان ہوگا۔ وہ نہایت سنگدل۔ اکھل کھرا بلکہ انسانوں کے لئے ایک عذاب عظیم یا خونخوار دیو ہوگا۔

کیا بچے کو مصیبت زدہ بنانے کے سہل ترین طریقہ سے آپ واقف ہیں؟ وہ یہ ہے کہ جو وہ مانگے آپ دیدیا کیجئے اس لئے کہ جب اس کی خواہشات تکمیل کی سہولت سے متجاوز ہو جائیں گی تو دیر سویر آپ اس کے مطالبوں کی تکمیل سے انکار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ پس یہ غیر متوقع انکار اس کے مطالبے کی عدم تکمیل سے بھی زیادہ اس کو تکلیف پہنچائے گا۔ علاوہ آپ کی چھڑی طلب کرے گا پھر گھڑی مابعد اڑتی ہوئی چڑیا یا آسمان کے چمکتے ہوئے تاروں کو مانگے گا الغرض جو دیکھے گا وہ مانگے گا اور جب تک آپ خود خدا مطلق نہ بن جائیں بھلا آپ اس کو کس طرح مطمئن کر سکیں گے؟

آدمی ہر قابل حصول شے کو فطرتاً اپنا ہی خیال کرتا ہے۔ اس لحاظ سے ہابس کا یہ کلیہ ایک حد تک صحیح ہو جاتا کہ اپنی خواہشات

العنان کی تکمیل کے ذریعوں کو بڑھانے سے ہر شخص کُل کا مالک بن سکتا ہے۔ پس بچہ بھی جس کو محض سوال کرنے کی دیر ہوتی ہے
کہ اس کی خواہش پوری کر دی جاتی ہے خود کو کائنات کا مالک اور تمام لوگوں کو اپنا غلام خیال کرنے لگتا ہے اور بالآخر جب
آپ اس کی خواہشات کی تکمیل سے انکار کرتے ہیں تو وہ آپ کے انکار کو ایک قسم کی بغاوت خیال کرنے لگتا ہے۔ اس
لئے کہ وہ اپنے آپ کو محض ایک حکم دینے والا خیال کرتا ہے جب کہ ہنوز وہ بہت نادان ہوتا ہے آپ دلائل پیش
کر کے اسے جس قدر قائل معقول کرنے کی سعی فرماتے ہیں وہ سب اس کی نظر میں محض عذرات لنگ اور بہانے ہی معلوم
ہوتے ہیں۔ اور وہ ان سب کو محض بیدردی اور بے رحمی پر محمول کرتا ہے۔ یہ احساس ناانصافی اسے ترش مزاج بنا دیتا
ہے اور بالآخر وہ سب سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اور گو کسی شفقت و عنایت پر کبھی شکر گزار تو نہیں ہوتا ہے تاہم ہر مخالفت
پر بے حد چڑنے لگتا ہے۔

میں یہ کیوں کر فرض کر لوں کہ اس قسم کا بچہ کبھی خوش حال بھی ہو سکتا ہے؟ یہ تو غصہ کا غلام اور خونخوار خواہشات کا شکار
ہوتا ہے۔ خوش مزاج! استغفر اللہ۔ یہ تو ایک مطلق العنان ہے جو ایک ذلیل ترین غلام اور ساتھ ہی ساتھ بدترین
مخلوق ہوتا ہے۔ میں اس قسم کی پرورش پائے ہوئے بچوں سے واقف ہوں جو آپ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ ان
مکان ڈھا ڈالیں گے۔ چمن پر سے باد نما مرغ انہیں لا کر دیں گے یا محض باجہ سننے کی خاطر ان کے لئے چلتی ہوئی فوج
کو روک لیں گے۔ پھر اگر ان کی ضد پوری نہ ہو تو دھاڑیں مار مار کر چیخنے اور چلانے لگتے ہیں اور کسی کی پروا بھی نہیں کرتے
ہیں۔ ہر متنفس انہیں خوش کرنے کی لاحاصل کوشش کرتا ہے۔ لیکن کیوں کہ ان کی خواہشات کی محرک محض وہ سہولت ہوتی
ہے جس کے ذریعہ ان کی ہر بات پوری کر دی جاتی تھی اس لئے وہ ناممکنات کی ٹھان لیتے ہیں۔ اور مخالفت میں شدائد
مصائب اور رنج کو اپنا مد مقابل پاتے ہیں۔ غراتے۔ قسم کھاتے اور غصہ میں سارا سارا دن روتے اور چلاتے ہوئے
گزار دیتے ہیں۔ کیا حقیقتاً یہ بڑے چہیتے اور اللہ آمین ہی کے بچے ہیں؟ ناتوانی اور طاقت کی محبت مشترکہ حماقت
مصیبتوں کے سوا کوئی اور مفید نتیجہ نہیں بخشتی ہے۔ لاڈ اور پیار کا بگاڑا ہوا ایک بچہ میز دھڑ دھڑاتا ہے قدم دھما
پر ہاتھ مارتا ہے۔ یہ مارنا پیٹنا قبل اس کے کہ قناعت حاصل ہو انہیں کافی عرصہ تک اسی طرح جاری رکھنا
قوت اور مطلق العنانی کے ان تصورات کے باعث اگر بچپن ہی اس قدر افسردہ اور اندوہناک ہو جائے تو
شباب کا کیا حشر ہوگا جب کہ ان کا تعلق دیگر ہمعصر انسانوں سے قائم یا بڑھنا شروع ہوگا اپنے مقابلے میں

لو ہیچ سمجھنے کے عادی ہو جاتے ہیں یہ ان کے لئے کس قدر دردناک تجربہ ہوگا کہ سماج میں شریک ہوتے ہی ہر سمت سے
مخالفتوں کا ان پر ایک ایسا ہجوم ہو جائے کہ جس کائنات کو وہ اپنے انگلی کے اشاروں پر نچانے کی توقع رکھتے تھے اس
می کے بوجھ سے وہ کچل جائیں۔ ان کا سرکشانہ چلن اور ان کی طفلانہ رعونت محض ان کی ندامت، ذلت اور تضحیک
کا باعث ہوتی ہے ذلت کو وہ پانی کے گھونٹ کے مانند پی جاتے ہیں اور تلخ تجربہ انہیں جلد ہی بتا دیتا ہے کہ وہ
ز تو اپنے مقام اور مرتبے ہی سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنی قوت سے۔ اور کیونکہ ہر ایک کام وہ خود انجام نہیں
دے سکتے اس لئے یہ قیاس کر لیتے ہیں کہ وہ کوئی بھی کام انجام نہیں دے سکتے ہیں وہ غیر متوقع مخالفت سے خوفزدہ
ہو جاتے ہیں اور لوگوں کی نفرت کے باعث ذلیل اور بالآخر اس طرح کمینے بزدل اور مکار بن کر اپنی حقیقی سطح سے
اتنے ہی گر جاتے ہیں جتنے کہ ابتداً بلند ہوتے ہیں۔

آئیے اب پھر حقیقی اصولوں کی طرف رجوع کریں۔ قدرت نے بچوں کو بے بس اور محبت کا حاجتمند بنایا ہے۔
کیا قدرت نے انہیں اس لئے پیدا کیا ہے کہ ان کی اطاعت کی جائے اور اُن سے ڈرا جائے؟ کیا قدرت نے انہیں کوئی
رعب دار چہرہ، مقناطیسی آنکھ یا بلند اور ڈراؤنی آواز بخشی ہے کہ لوگوں کو وہ خوفزدہ کر سکیں؟ میں خوب جانتا ہوں
کہ شیر کی آواز دوسرے جانوروں کو اتنا ہیبت زدہ کیوں کرتی ہے کہ اس کا چہرہ دیکھتے ہی وہ لرزنے اور تھرتھرانے
لگتے ہیں لیکن اس سے زیادہ مضحکہ انگیز اور ذلیل کیا کوئی اور نظارہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک سیاسی جماعت معہ اپنے
ہادی سردار کے کسی کلکاتے ہوئے بچے کے روبرو سرِ تسلیم خم کئے کھڑی ہو اور موٹے موٹے نمائشی الفاظ اور جملوں میں
خطاب کر رہی ہو اور بچہ جواب میں محض چلّا اور رال بہا رہا ہو۔

اگر ہم محض بچپن ہی پر ذرا غور کریں تو بچے سے زیادہ ناتواں اور بدنصیب کیا کوئی اور شے بھی ایسی نظر آتی ہے جو اپنے
پاس والوں کے رحم و کرم۔ ان کی شفقت، خبرگیری اور دیا کی اس قدر محتاج ہو؟ کیا اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ بچے
کا معصوم چہرہ اور جاذب صورت اسی لئے بنائی گئی ہے کہ اس کی ناتوانی کے باعث لوگوں کو اس سے دلچسپی ہو اور وہ
امداد کرنے کے ہر وقت آرزومند اور مشتاق رہیں؟ پھر بھلا اس سے زیادہ مکروہ اور بدنما اور کون سا منظر ہو سکتا ہے
کہ بد مزاج اور مغرور بچہ اپنے متعلقین پر حکومت کرتے رہنے کے باعث ان لوگوں کے ساتھ گستاخانہ طور پر
وہ اسالیب و لہجہ استعمال کرنے لگے جن کے وجہ بغیر شاید وہ کبھی کا ہلاک ہی ہو گیا ہوتا؟

اس کے برخلاف کیا آپ یہ نہیں دیکھتے کہ بچپن کی ناتوانی کے باعث بچے کس قدر لاچار اور بے بس ہوتے ہیں؟ کیا آپ یہ نہیں سوچتے کہ ذاتی توہمات اور قیاسیات کی تکمیل میں آزادی سے محروم کر کے بچوں کی مشقتوں اور مصیبتوں میں اضافہ کرنا کس قدر بے دردی کا فعل ہوتا ہے؟ بچوں کی یہ آزادی ایسی ہوتی ہے جس کا کہ وہ بے جا استعمال نہیں کر سکتے ہیں اور جس کی محرومی سے نہ انہیں کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے اور نہ ہمیں۔

ضدی بچے سے زیادہ بیہودہ اگر کوئی اور شے نہیں ہو سکتی ہے تو ایسی بھی کوئی چیز نہیں ہو سکتی جو بزدل بچے کے مانند ہمارے رحم وکرم کی زیادہ مستحق ہو۔ سن شعور کو پہنچتے ہی بچہ خود بخود جماعت کا غلام بن جاتا ہے۔ ایسی صورت میں بھلا پہلے ہی سے گھر کے اندر اُسے غلام بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس مختصر اور ذرا سی گھڑی کے لئے اس کی گردن اس جوئے سے خالی ہی رکھئے جو خود قدرت ہی نے اس پر نہیں رکھا ہے۔ بچے کو آزادی کا فائدہ اٹھانے دیجئے تاکہ کم از کم تھوڑی دیر تک تو غلامی کی ذلتوں سے وہ محفوظ رہے۔ سخت گیر اساتذہ اور ان باپوں کو جو اپنے بچوں کے غلام ہوتے ہیں ہر دو کو معہ ان کے ناکارہ اور ادنیٰ عذرات کے میرے سامنے لائیے اور قبل اس کے کہ وہ اپنے ذاتی طریقوں میں کسی تعلّی یا فخر سے کام لیں ایک دفعہ انہیں یہ قدرتی سبق سیکھ لینے دیجئے۔

اب میں عملی پہلوؤں پر نظر ڈالتا ہوں۔ یہ پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ جو چیز بچہ مانگتا ہو اسے وہ ہرگز نہ ملنی چاہئے۔ بلکہ اس کو صرف وہ چیز ملنی چاہئے جس کی کہ اسے ضرورت ہو[1] اور یہ کہ اس کا کوئی فعل تعمیل حکم نہ ہونا چاہئے بلکہ تکمیل ضرورت ہونا چاہئے۔

حکم اور تعمیل کے الفاظ لغت ہی سے نکال دینے چاہئیں۔ اسی طرح حقوق اور فرائض کے بھی لیکن قوت۔ ضرورت ناتوانی اور مزاحمت کے الفاظ خوب اچھی طرح اُسے ذہن نشین کرا دینے چاہئیں۔ قبل حصول سن شعور اخلاق کے وجود یا سماج کے تعلقات کا کوئی تخیل پیدا ہونا ہی غیر ممکن ہے۔ پس حتی المقدور آپ ایسے الفاظ کے استعمال کرنے سے بھی گریز کریں جو ان کا تخیل پیدا کرتے ہوں۔ اس لئے کہ کہیں صغر سنی ہی میں بچہ ان الفاظ کے متعلق کوئی ایسا غلط اور گمراہ کن تخیل نہ قائم کر لے جو بڑے ہونے پر آپ کے مٹائے بھی نہ مٹ سکے۔ بچے کے ذہن میں پہلا ہی گمراہ کن تصور جو نمود

---

[1] ہمیں یہ جان لینا چاہئے کہ مشقت کی اکثر اور راحت کی کبھی کبھار ضرورت رہتی ہے پس بچوں کی خواہشوں میں صرف ایک ہی خواہش ایسی ہوتی جو کبھی پوری نہ ہونی چاہئے یعنی قوت کی خواہش۔ لہذا جب کبھی وہ کوئی خواہش ظاہر کرے ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کی نیت کیا ہے۔ اے حقیقی آرام اور آسائش کی خاطر جو کچھ وہ مانگے حتی المقدور پورا کر دیجئے لیکن جب کبھی وہ کوئی چیز کسی دھن یا خواہش قوت کے تحت طلب کرے تو صاف انکار کر دیجئے۔

ہوتا ہے وہی مجلہ گمراہی اور غرابی کا آغاز ہوتا ہے ۔ وہ یہی پہلا قدم ہوتا ہے جس کی سخت نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے ۔ آپ کا عمل ایسا ہونا چاہیئے کہ بچہ جب بیرونی اشیا کو دیکھنے میں مشغول ہو تو اس کے تصورات محض ان اشیا کی حسیات ہی میں محدود رہیں آپ اس کے اطراف کی صرف مادی دنیا ہی سے اُسے واقف کرائیں ۔ اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو یقین مانئے کہ وہ یا تو آپ کی قطعاً کوئی پروا ہی نہ کرے گا ۔ یا جس اخلاقی دنیا کی آپ اس قدر رٹ اس لگاتے ہیں اس کی بابت وہ ایسے خیالی توہمات قائم کر لے گا کہ جیتی دنیا اس کے دل سے آپ انہیں محو نہ کر سکیں گے ۔

بچوں کی تعلیم مادی ہونی چاہیئے عقلی نہیں

بچوں سے منطق چھانٹنا اور سوال وجواب کرنا ”لاک“ کا اہم ترین اصول ہے ، اور آج کل اس کا فیشن انتہا کو پہنچ گیا ہے ۔ میری رائے میں واقعات سے تو اس کی بمشکل ہی تصدیق ہوتی ہے ۔ جن بچوں سے متواتر سوال وجواب کئے جاتے ہیں مجھے تو وہ بے حد بے وقوف ہی نظر آتے ہیں ۔ انسان کی جملہ قوتوں میں (عقل) جو سب کا مجموعہ ہے سب سے آخری اور منتخبہ قوت ہے ۔ اسی کو بچے کی تعلیم کے لئے آپ اس قدر جلد استعمال کرنے لگتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ بچے کو اس کے ادراک و فہم کے ذریعہ تعلیم دیتے ہیں ۔ آپ الٹا راستہ اختیار کرتے ہیں اور انتہا کو ابتدا بنا دیتے ہیں اگر بچے دلیل اور ادراک سے کام لے سکتے تو بھلا انہیں تعلیم ہی کی کیا ضرورت ہوتی ۔ لیکن ابتدائی عمر ہی میں بچوں سے ایسے الفاظ میں گفتگو کرکے جنہیں کہ وہ نہیں سمجھتے محض مغالطوں سے مطمئن ہو جانے اور ہر بات میں جو اُن سے کہی جائے بحث کرتے اور خود کو اپنے استاد کے برابر دانشمند خیال کرنے کی آپ عادت ڈال دیتے ہیں انہیں بحثی اور باغی بننے کی تعلیم دیتے ہیں اور جو کچھ آپ دلیل کے ذریعہ حاصل ہونا خیال کر لیتے ہیں وہ درامل آپ لالچ خوف یا اس ریاکاری سے حاصل کرتے ہیں جس کے ذریعہ مجبوراً آپ اپنی دلیل کو تقویت پہنچاتے ہیں ۔

اخلاقی سبق جو بچوں کو اکثر دئے جاتے ہیں وہ ذیل میں مختصراً بیان کئے جاتے ہیں :۔

استاد ۔ تم کو یہ کام ہرگز نہ کرنا چاہیئے ۔

شاگرد ۔ کیوں ؟

استاد ۔ کیونکہ یہ نامناسب اور ناجائز ہے ۔

شاگرد ۔ ناجائز ! جناب ناجائز کسے کہتے ہیں ؟

استاد۔ جس کی تم کو ممانعت کر دی گئی ہو۔

شاگرد۔ ممنوعہ کام کو کرنا ناجائز کیوں ہوتا ہے؟

استاد۔ تم کو نافرمانی کی سزا ملے گی۔

شاگرد۔ تو میں یہ اس وقت کروں گا جب کوئی نہ دیکھتا ہوگا۔

استاد۔ ہم تمہاری نگرانی رکھیں گے۔

شاگرد۔ میں چھپ جاؤں گا۔

استاد۔ ہم تم سے دریافت کریں گے کہ تم کیا کر رہے تھے؟

شاگرد۔ میں جھوٹ بولوں گا۔

استاد۔ تم کو جھوٹ کبھی نہیں بولنا چاہیئے۔

شاگرد۔ میں جھوٹ کیوں نہ بولوں۔

استاد۔ کیوں کہ یہ ناجائز ہے وغیرہ وغیرہ

یہ بالکل ناگزیر دائرہ ہے۔ آپ اس کے باہر ہو لئے کہ بچہ آپ کو نہ سمجھ سکے گا۔ اس طرح کی تعلیم سے کیا فائدہ؟ میں یہ معلوم کر کے بیحد خوش ہوں گا کہ محولہ بالا بول چال کے عوض آپ اور کیا سوال و جواب استعمال کریں گے۔ لاک خود بھی اس سے الجھن میں پڑ جاتا۔ کسی حالت میں بچے کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ جائز اور ناجائز سے واقف ہو وہ آدمی کے فرائض میں دلیل یا معقولیت تلاش کرے۔

آدمی بننے کے قبل قدرت اس کو بچہ ہی رکھنا چاہتی ہے۔ اگر ہم اس نظام کو الٹنے کی سعی کریں گے تو ہم زبردستی ایسے کچے اور بے مزہ پھل پیدا کریں گے جو پختگی کے قبل ہی گل سڑ جاتے ہیں۔ اور ہم میں نو آموز استاد اور بوڑھے شاگرد پیدا ہو جائیں گے بچوں میں مشاہدہ خود اور محسوس کرنے کی ایک نرالی طرز ہوتی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی حماقت نہیں ہو سکتی کہ اُسے چھوڑ کر اپنے طریقے رائج کیے یا آزمائے جائیں۔ ایک دس سالہ بچے میں قوت فیصلہ کے وجود کی میں اس سے زیادہ توقع نہیں رکھتا جتنا کہ میں اس کا پانچ فٹ لمبا قد دیکھنے کا متمنی ہو جاؤں۔ حقیقتاً خیال تو فرمایئے کہ اس معاملہ میں اس کے لئے بھلا منطق کس کام کی ہو سکتی ہے؟ منطق تو قوتوں کی انعام ہوتی ہے۔ بچے کو اس انعام کی ضرورت نہیں ہوتی۔

سرکاری جریدے کے اعلانات

شعبۂ سکول — صیغۂ رجال و نساء

نمبر اور تاریخ	نام اور عہدہ	کس جگہ تبادلہ یا تقرری ہوئی	کس تاریخ سے	کیفیت
۹۲۱۹ ۳.۵.۵۲	م۔ منورالدین بی۔ اے۔ بی ٹی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول۔ مٹھہ ٹوانہ	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول بھیرہ۔ بمشاہرہ خود	تاریخ حاضری سے	ایک موجودہ آسامی پر
۹۲۳۹ ۱۰.۵.۵۲	م۔ محمد شمیم۔ جنہوں نے بی ایس کا امتحان دیا ہے۔ اور جن کی تقرری گورنمنٹ ہائی سکول حضرو میں بطور معلم انگریزی بمشاہرہ ۱۰۰ روپے ماہوار ہو چکی تھی۔	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول ہری۔ بمشاہرہ خود	”	م۔ عبدالرحیم کی جگہ جن کی تبدیلی ہو چکی ہے۔
۸۸۶۲ ۲۸.۴.۵۲	م۔ محمد حسین ایس۔ وی۔ قائم مقام اردو۔ مدرس گورنمنٹ ہائی سکول حضرو	قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی سکول بھکر بمشاہرہ خود	۵.۵.۵۲ یا بعد کی تاریخ حاضری سے	م۔ فتح محمد کی جگہ جن کو سبکدوشی سے پہلے رخصت مل چکی ہے۔
”	م۔ فتح محمد فتح معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی سکول بھکر	معلم السنہ شرقیہ۔ گورنمنٹ ہائی سکول حضرو۔ بمشاہرہ خود	”	م۔ محمد حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
گ - ۶۲	م۔ عبدالخالق۔ قائم مقام معلم	قائم مقام معلم عربی گورنمنٹ	تاریخ حاضری سے	م۔ محمد حسن کی جگہ جن کا تبادلہ

تاریخ اور نمبر	نام اور عہدہ	کس جگہ تبادلہ یا تقرری ہوئی	کس تاریخ سے	کیفیت
۲۸.۳.۵۲	عربی۔ گورنمنٹ ہائی سکول شاہپور	ہائی سکول جھنگ	تاریخ حاضری سے	ہو چکا ہے۔
۱۹ / ۷ ۲.۴.۵۲	م۔ محمد بخش۔ قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی سکول تلہ گنگ جن کا تبادلہ پھر ہو چکا تھا	قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی سکول نوشہرہ	"	م۔ محمد دین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
۱۷ / ۷ ۲.۴.۵۲	م۔ محمد عاصم عثمانی معلم دستکاری گورنمنٹ ہائی سکول کھوڑ	ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول بمشاہرہ خود	تاریخ حاضری سے	م۔ محمد عارف کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
"	م۔ محمد عارف۔ ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول شاہ پور	ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول نوشہرہ بمشاہرہ خود	" "	م۔ شاہ محمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
"	م۔ شاہ محمد ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول نوشہرہ	ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول جہلم بمشاہرہ خود	"	م۔ محمد علی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
"	م۔ محمد علی۔ قائم مقام زائد ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول جہلم	قائم مقام معلم دستکاری گورنمنٹ ہائی سکول کھوڑ بمشاہرہ خود	"	م۔ محمد عاصم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
۲۷ / ۷۹ ۲۲.۴.۵۲	چوہدری سردار خاں بی۔ اے معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول پسرور	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول ڈسکہ بمشاہرہ خود	"	م۔ محمد منیر کی جگہ جنہیں لوکل ملازمت میں بھیج دیا گیا ہے
"	ایم بشیر حسین بی۔ اے بی ٹی قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول ڈسکہ	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول پسرور	"	چوہدری سردار خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے

تاریخ اور نمبر	نام اور عہدہ	کس جگہ تبادلہ یا تقرری ہوئی	کس تاریخ سے	کیفیت
۳۷۷۹ ۲۲.۴.۵۲	ایم شفیق اللہ خاں بی اے بی ٹی قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول اکال گڑھ	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول ڈسکہ بمشاہرہ خود	تاریخ حاضری سے	ایم ممتاز اللہ کی جگہ جنہیں بورڈ ملازمت میں بھیج د گیا ہے
″	ایم محمد شفیع فیض بی اے بی ٹی قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول ڈسکہ	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول اکال گڑھ	تاریخ حاضری سے	ایم شفیق احمد کی جگہ جن تبادلہ ہو چکا ہے
۳۷۸۳ ۲۲.۴.۵۲	ایم فضل کریم - ایچ - پی - ایچ اے - ایس - وی - او - ٹی گورنمنٹ ہائی سکول ننکانہ صاحب	اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول رینالہ - بمشاہرہ خود	″	ایس خورشید عالم شاہ فاروقی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
″	ایم عبدالوحید خاں - ایچ - پی قائم مقام او - ٹی گورنمنٹ ہائی سکول ننکانہ صاحب	قائم مقام اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ننکانہ صاحب بمشاہرہ خود	″	ایم فضل کریم کی جگہ جن کا تبا ہو چکا ہے۔
۳۷۸۶ ۲۲.۴.۵۲	ایم اقبال اللہ خاں ایس، وی قائم مقام معلم اردو گورنمنٹ ہائی سکول پسرور	قائم مقام معلم اردو گورنمنٹ ہائی سکول ڈسکہ بمشاہرہ خود	″	ایک خالی آسامی کو پُر کیا گیا
۴۳۴۰ ۵.۵.۵۲	ایم محمد نواز قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول پسرور	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول ڈسکہ	″	ایم عطاء اللہ کی جگہ جنہیں بلا ملازمت میں بھیج دیا گیا ہے
″	مرزا اللہ صابر بی - اے بی ٹی قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول ڈسکہ	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول پسرور	″	ایم محمد نواز کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے

تاریخ	نام اور عہدہ	جس کی جگہ تبدیلی یا تقرری ہوئی	کس تاریخ سے	کیفیت
۱ء ۲.۴.۰	ایم محمد اکرم ملت انی ایچ-ٹی-آئی گورنمنٹ ہائی سکول کھوڑہ	ڈرائنگ ماسٹر-گورنمنٹ ہائی سکول شاہ پور بشاہرہ خود	تاریخ حاضری سے	ایم محمد عارف کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
″	ایم محمد عارف گورنمنٹ ہائی سکول شاہ پور ڈرائنگ ماسٹر	ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول نوشہرہ بشاہرہ خود	″	ایم شاہ محمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
″	ایم شاہ محمد ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول-نوشہرہ	ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول جہلم بشاہرہ خود	″	ایم محمد علی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
″	ایم-محمد علی قائم مقام نائب ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول جہلم	قائم مقام ایم-ٹی-آئی گورنمنٹ ہائی سکول کھوڑہ-بشاہرہ خود	″	ایم محمد اکرم عثمانی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
۱۹ء ۲۰.۴.۵۲	ایم-محمد بخش قائم مقام معلم اردو گورنمنٹ ہائی سکول تلہ گنگ	قائم مقام معلم اردو گورنمنٹ ہائی سکول نوشہرہ	″	ایم-محمد دین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
۵۲-۳-۲۸ ۲۸.۰۳.۵۲	ایم عبدالخالق ایچ-اے قائم مقام معلم عربی گورنمنٹ ہائی سکول شاہ پور	قائم مقام معلم عربی گورنمنٹ ہائی سکول جہلم بشاہرہ خود	″	ایم محمد حسن کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے

صیغہ نساء

شعبہ سکول

نمبر اور تاریخ	نام اور عہدہ	کس جگہ تبدیلی یا تقرری ہوئی	کس تاریخ سے	کیفیت
۲۲۰۴ ۲۶.۴.۵۲	مسز جی۔ آر بیگ ایف۔ ایس۔ سی اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول گجرات	معلمہ اُردو گورنمنٹ گرلز ہائی اینڈ نارمل سکول راولپنڈی	تاریخ حاضری سے	ایک نئی آسامی کو پُر کیا گیا
″	مسماۃ صغرا بیگم ایس وی معلمہ اُردو گورنمنٹ گرلز ہائی اینڈ نارمل سکول جہلم	معلمہ اردو گورنمنٹ گرلز مڈل سکول پھالیہ	″	″
ع - ۱۸۴۶ ۱.۵.۵۲	مسماۃ نذیر بیگم صدیقی ایس وی اُردو معلمہ گورنمنٹ سکول گوجرہ	اردو معلمہ زنانہ گورنمنٹ ہائی سکول لائل پور۔ بمشاہرہ خود	″	مسماۃ مقرب بیگم کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا۔
″	مسماۃ مقرب بیگم ایس وی اردو معلمہ زنانہ گورنمنٹ ہائی سکول۔ لائل پور	اردو معلمہ زنانہ گورنمنٹ ہائی سکول۔ چیچا وطنی بمشاہرہ خود	″	مسماۃ فیض الہیٰ کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے
″	مسماۃ فیض ایم۔ ایس، وی	قائم مقام اُردو معلمہ زنانہ	″	مسماۃ رسول بیگم کی جگہ

آموزش

نمبر اور تاریخ	نام اور عہدہ	کس جگہ تبدیلی یا تقرری ہوئی	کس تاریخ سے	کیفیت
۱۸۴۶-ای 1.5.52	قائم مقام اردو معلمہ زنانہ گورنمنٹ ہائی سکول چیچاوطنی	گورنمنٹ ہائی سکول پاکپتن	تاریخ حاضری سے	جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
"	مسماۃ رسول بیگم - ایس وی قائم مقام اردو معلمہ زنانہ گورنمنٹ ہائی سکول پاکپتن	قائم مقام اردو معلمہ زنانہ گورنمنٹ ہائی سکول گوجرہ - بمشاہرہ خود	"	مسماۃ نذیر بیگم صدیقی کی جگہ ان کا تبادلہ ہو چکا ہے
"	مسماۃ حمیدالدین ایف۔ اے پی ٹی سی۔ وی قائم مقام اردو معلمہ زنانہ گورنمنٹ ہائی اور نارمل سکول جھنگ	قائم مقام اردو معلمہ زنانہ گورنمنٹ ہائی سکول ٹوبہ ٹیک سنگھ	"	مسماۃ محمد بی بی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
"	مسماۃ محمد بی بی ایس وی اردو معلمہ زنانہ گورنمنٹ ہائی سکول ٹوبہ ٹیک سنگھ	اردو معلمہ زنانہ گورنمنٹ ہائی اور نارمل سکول جھنگ بمشاہرہ خود۔	"	مسماۃ حمیدالدین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
"	مسماۃ دل بی بی ایس پی اردو معلمہ زنانہ گورنمنٹ ہائی سکول چیچاوطنی (رخصت پر ہیں)	اردو معلمہ زنانہ گورنمنٹ ہائی اور نارمل سکول ڈیرہ غازیخان	"	مسماۃ غلام زہرہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
"	مسماۃ غلام زہرہ ایس وی اردو معلمہ زنانہ گورنمنٹ ہائی اور نارمل سکول ڈیرہ غازی خان	اردو معلمہ زنانہ گورنمنٹ ہائی سکول خانیوال مشاہرہ خود	"	ایک نئی آسامی پر جو حکومت نے منظور کی۔

[شمارہ ۷] لاہور [جولائی ۱۹۵۲ء

اس شمارہ میں

مدیر : بشیر ہاشمی

معاونین : عبدالغفور چوہدری
فضل احمد

یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور

ایچ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کر یونیورسٹی بک ایجنسی کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا۔

ہمارے تین پروفیسروں کا عزمِ امریکہ

ادارہ

قومی زندگی کی تعمیر نو کے لئے نظام تعلیم کی تجدید شرط اول ہوا کرتی ہے لیکن یہ تجدید نئی عمارتوں اور طرح طرح کے ساز و سامان کے مہیا کر دینے سے ہی صورت پذیر نہیں ہو سکتی بلکہ ان مادی لوازمات سے زیادہ اہم وہ دل و دماغ ہے جسے ان سے کام لینا ہے۔ گویا استاد کی شخصیت اور اس کی ذہنی استعداد کو اس کام میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ جب ہم ذرا آگے تجزیہ کریں تو یہ بات صاف دکھائی دیتی ہے کہ استاد خود بعض تعلیمی اداروں کی پیداوار ہے اور جب تک یہ ادارے صحیح قسم کی تربیت نہیں دیتے اس وقت تک ہمارے نظام تعلیم کا یہ مرکزی نقطہ صحت مند اور صحت بخش صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ گویا کسی ملک کی تعلیمی زندگی میں یہ امر بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے ہاں اساتذہ کے تربیتی اداروں میں کس قسم کے لوگ بھرتی کئے گئے ہیں۔ کیا وہ زیر تربیت مدرسوں کے دلوں کو ایک نئے جذبے اور نئے تصور حیات سے بھرپور کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں یا نہیں؟ ہمارا ملک نظام عالم میں ایک نئے مقصد کا علمبردار بن کر آیا ہے۔ لیکن یہ مقصد پورا اسی صورت میں ہوگا جب مدرسین کی تربیت گاہیں اس بلند نصب العین کی جیتی جاگتی تصویریں بن جائیں گی۔

سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور پاکستان بھر میں مدرسین کی قدیم ترین تربیت گاہ ہے۔ چونکہ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے لوگ ہی آگے چل کر محکمہ تعلیم کے تدریسی اور انتظامی شعبوں کی باگ ڈور سنبھالتے ہیں اس لئے اسی ادارے کی اہمیت ناقابل انکار ہے۔ حصول آزادی کے بعد ہماری یہ مسلسل کوشش رہی ہے کہ تدریسی اور فنی نقطہ نگاہ سے اچھے سے اچھے اساتذہ کو کالج میں پڑھانے کے لئے بلایا جائے۔ تاہم یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ ان لوگوں کو دوسرے ممالک کے نظامہائے تعلیم کو قریب سے دیکھنے کے مواقع دیئے بغیر بعض شعبوں میں کچھ کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ یہ امر

ت بخش ہے کہ اضلاع متحدہ امریکہ کی ایجوکیشن فاؤنڈیشن نے اس سال کالج ہذا کے تین پروفیسروں کو وظیفے
دے کر اس حقیقی ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ شیخ معز الدین۔ جناب فضل احمد اور جناب آلیف۔ ایم خان ماہ اگست
امریکہ پہنچ جائیں گے اور اپنے چھ ماہ کے قیام میں امریکی ثانوی تعلیم کا مطالعہ کریں گے۔ ہماری دلی خواہش
کے باقی پروفیسروں کو بھی اس قسم کی سہولیت میسر آ سکے تاہم سردست یہی غنیمت ہے کہ اگلے تعلیمی سال
سے پہلے ہمارے یہ تینوں دوست بیش قیمت غیر ملکی تجربہ سے مالا مال ہو کر واپس تشریف لے آئیں گے۔

بارہا گفتہ ام و بار دگر مے گویم

موزش کے پچھلے چند شماروں میں پے در پے یہ درخواست دہرائی جا چکی ہے کہ نارمل سکولوں کے
ین اور اساتذہ اپنے ہاں کی تعلیمی اور فنی مشکلات پر قلم اٹھائیں تاکہ ہم ان کے مسائل کو بہتر طور پر سمجھ کر
کو زیادہ مؤثر طریق سے ان کی خدمت کے لئے وقف کر سکیں۔ نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ
درخواستیں صدا بصحرا ثابت ہوئی ہیں۔ صرف ایک صدر معلم صاحب نے عنوانوں کی ایک فہرست روانہ کی
ریں۔ مدرسین کی تربیت گاہوں کا یہ سکوت کوئی اچھی علامت نہیں کیوں کہ اس سے یہ رنج دہ شبہ پیدا ہونے
کہ شاید انہوں نے اپنے مسائل کے بارے میں کبھی کچھ سوچا ہی نہیں۔ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ ان اداروں کو
ندگی کے تعمیری سرچشموں کا کام دینا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا فخر ہے لیکن ساتھ ہی بہت بھاری ذمہ داری
ہم ان احباب سے دوبارہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے فرض کو پہچانیں۔ اگر آغاز سال کی مصروفیتوں نے
پہلے مہلت نہیں دی تو اب رخصتیں قریب آ رہی ہیں۔ اس فرصت کے زمانے میں وہ قومی ضرورتوں
پتے وسائل پر اچھی طرح سوچ و چار کریں اور ان وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی راہیں ڈھونڈیں
ن منصوبوں کو عملی شکل دے کر دوسرے لوگوں کو نتائج سے آگاہ کریں۔

ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ ہمارے فرائض سبق پڑھا دینے پر ہی ختم نہیں ہو جاتے۔ ہم
زبردست انقلابی دور میں سے گزر رہے ہیں۔ انسانی معاشرے کے خدوخال اس تیزی کے ساتھ بدل رہے
کہ پوری طرح چوکس رہے بغیر معلم کے لئے قطعی طور پر ناممکن ہے کہ زندگی کی رفتار کا ساتھ دے۔ اور

زندگی کا ساتھ دیئے بغیر تعلیم ایک مہمل چیز بن کر رہ جاتی ہے ۔ دوسرے ملکوں نے "آن ماٹش اور سہو" کا راستہ اختیار کر کے تعلیم کو مہمل ہونے سے بچایا ہے ۔ آج یہ فرض پاکستانی اساتذہ پر بھی شدت کے ساتھ عائد ہوتا ہے ۔ اس میدان میں راہنمائی کا کام قدرتی طور پر تربیتی درس گاہوں کو بھی کرنا ہوگا ۔ پس جس قدر جلد ہمارے نارمل سکول اس فرض کا احساس کریں گے اسی قدر یہ چیز ملک و قوم کے لئے فائدہ مند ہوگی ۔ ہماری تعلیمی مشکلوں کا حل یہ نہیں کہ ہم دوسرے کے وضع کردہ نظریوں کو آنکھیں بند کئے صحیح مان لیں اور انہی کی تدریس پر سارا زور صرف کر دیں بلکہ ہوش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم خود اپنے مخصوص مسائل کا تجزیہ کریں اور دوسرے ملکوں کی مثال سے راہنمائی حاصل کر کے اپنا طریق کار خود متعین کریں ۔ یہ پسندیدہ صورت حال اسی صورت میں پیدا ہوگی جب نارمل سکولوں کے اساتذہ بحث و تبصرہ کا راستہ اختیار کریں گے ۔

علم اور تعلیم حدیث کی روشنی میں

عبدالغفور چودھری

اسلامی سوسائٹی میں معلم کی حیثیت اور اہمیت کی وضاحت متعدد احادیث سے ہوتی ہے۔ عام طور پر معلم کو ایک مجسمۂ نور سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ جو دوسروں کی راہوں کو اجاگر اور ضوفشاں کرتا ہے۔ وہ شہروں قصبات کے روشنی کے مینار ہوتے ہیں۔ اور ان کا مقابلہ ستاروں اور ماہتاب شعاعوں سے کیا جا سکتا ہے جو بحر و بر میں راہ دکھاتی ہیں اور جن کے اوجھل ہوتے ہی خود رہبر کی راہ گم ہو جاتی ہے۔ "معلم ملک کے لئے شمع ہدایت اور شہر کے لئے تازہ پانی کا چشمہ ہے"[1]

ان تشبیہات و تمثیلات کا استقصاء ممکن نہیں جن سے معلم کی سوسائٹی میں اجتہادی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کا شمار قدرت کے ان اہم قویٰ میں سے ہے جن کی اختراعی کوششوں سے عالم میں تازگی اور ایک نئی زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک بار آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت لقمانؑ کی نصیحت نقل کی کہ انہوں نے اپنے بیٹے سے اس کی رحلت کے وقت فرمایا کہ اے بیٹے علماء و فضلاء کی صحبت تلاش کر اور عقل کی باتیں پوچھیاں سن اس لئے کہ اللہ تعالیٰ مردہ کے دل کو علم کی روشنی کے ساتھ اس طرح اجاگر کیا کرے گا جس طرح کہ خوشگوار بارش کے بعد خشک اور بنجر زمین میں سبزہ اور ہریالی پیدا ہو جاتی ہے"[2]

ایک دوسری حدیث میں علماء کی مجالس کو جنت کے باغیچے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو حکم دیا گیا ہے کہ جب بھی انہیں موقع ملے وہ اس خوشگوار باغ کی خوشہ چینی کریں۔

معلم ہر طرح کے ہوتے ہیں۔ ان کے مراتب میں بہترین فرق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک استعارہ سے کیا ہے فرماتے ہیں "علم ایک شہد کے مانند شیریں چشمہ ہے جس کے کنارے معلمین صرف چہل قدمی کیا کرتے ہیں متکلمین نہ جانے کتنے غوطے لگاتے ہیں اور عارفین نجات کی کشتی کی سیر سے لطف اندوز ہوتے ہیں"[3]

(۱) المختصر صفحہ ۵ (۲) موطا مالک صفحہ ۳۹۱ (۳)

دوسروں کو تعلیم دینے کا بدلہ روحانی انعام قوس وقزح کے رنگ کے بادل کی روشنی یا بارش کی طرح خوش گوار ہوتا ہے
ابو حنیفہ فرماتے ہیں قیامت کے دن جب اچھے اور برے اعمال ترازو میں رکھے جائیں گے تو ایک شخص کے اعمال بد کا
پلہ جھکتے جھکتے ایک بار دفعتاً چڑھ جائے گا۔ اور یہ اس بادل سے ہوگا جو ایک معلوم جگہ سے پیدا ہوگا۔ یہ بادل اس کی اس
علم کا نتیجہ ہوگا جو اس نے دوسروں کو دی ہے۔

ہم نے کسی اور جگہ ذکر کیا ہے کہ کائنات عالم کا ذرہ ذرہ عمل تعلیم میں لگا ہوا ہے جس کا مقصد مخلوق کی معاشرتی و اخلاق تخلیق ہے
انسان اور معلم کے لئے جو اس تبدیلی کے عمل میں آنے کا خدائی آلہ ہے اور فرشتے چیونٹیاں اپنے بلوں میں اور مچھلیاں غیر سمندر
میں اچھے معلم کے لئے دعائے رحمت کرتی ہیں۔

بنی نوع انسان کی حیات و بقا کے لئے ایسے محرک جزو کا ہونا ناگزیر ہے اور تمام لوگ معلم یا متعلم کی حیثیت سے
اس میں عملی حصہ لینے والے ہیں اس لئے زندگی اپنے معززو مقدم نام کی اہل نہیں رہتی اگر آدمی اس بے حس و ساکن حالت پر اتر
آئے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کے مطابق لوگوں کے بڑے بڑے تین طبقے کئے جا سکتے ہیں۔ خدائی معلم، متعلم
جو راہ نجات پر چل رہا ہے۔ بقیہ لوگ جو نرے احمق ہیں اور ہر کس و ناکس کی ہدایت قبول کر لیتے ہیں

ایک حدیث میں انسان سے عمل تعلیم میں عملی جزو بننے کا مطالبہ کیا گیا ہے جو لیل و نہار کی گردش کے ساتھ ساتھ سرگرم
عمل رہتا ہے اور ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ نوجوان گلاہاد (GALAHAD) کی طرح اپنے آپ کو ہر ذہنی و اخلاقی سیاحت
کی مہم کے لیے آمادہ رکھے۔

کچھ علماء ایسے بھی ہیں جو اس شخص کو انسانیت کا مرتبہ ہی نہیں دیتے جو اپنی زندگی میں معلم نہ رہ چکا ہو۔ امام غزالیؒ ابن
مبارک کا ایک قول نقل فرماتے ہیں کہ "تمام مخلوق میں صرف معلم ہی انسانیت کے رتبہ کا مستحق ہے اس لئے کہ صرف علم ہی
سے انسان و حیوان کے درمیان امتیاز ہوتا ہے۔

معلم کی ابتدائے اسلام ہی سے بہت عزت و توقیر ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق اپنے آپ کو بیچ دینا
وہ ادنیٰ معاوضہ ہے جو ایک متعلم معلم کے قدموں پر رکھ سکتا ہے۔ میں اس کا ادنیٰ ترین خادم ہوں جو مجھے ایک لفظ کی بھی تعلیم
دیتا ہے اگر وہ چاہے تو مجھے بردہ فروشی کے بازار میں بیچ دے۔ مجھے آزاد کر دے یا مجھ سے خدمت لیتا رہے
ایک اور موقع پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بہت شستگی و پاکیزگی کے ساتھ معلم سے ملنے کے قواعد بیان

[illegible] جب تم اس کے پاس پہنچو تو تمام حاضرین کو عام طور پر اور معلم کو خاص طور پر دعائے خیر سے یاد کرو۔ اس کے سامنے [illegible] سے بیٹھ جاؤ۔ اپنی انگلی یا آنکھ سے اس طرف اشارہ نہ کرو۔ کبھی یہ نہ کہو کہ فلاں فلاں لوگوں کی رائے اس کی رائے کے خلاف ہے اس کے کپڑوں کو نہ چھوؤ اور اس پر سوالات کی بوچھاڑ نہ کرو۔ در حقیقت اس کی مثال ایک لدے ہوئے کھجور کے درخت کی سی ہے جو تم پر مسلسل بارش کرتا رہتا ہے۔

تدریس کا مالی معاوضہ

مالی معاوضہ کا مسئلہ ایک بہت متنازعہ فیہ مسائل میں سے ہے اور اس بارے میں متضاد مذاہب اختیار کیے گئے ہیں، ابتدائے اسلام میں جب کہ ہر مسلمان کے سینہ میں اشاعت و تبلیغ کی لو لگی تھی انہوں نے یہ کام فی سبیل اللہ انجام دیا لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ سے بھی بارگاہ خلافت کے وہ فرمان ملتے ہیں جن میں حمص کے والی کو حکم دیا گیا ہے کہ ان تمام لوگوں کو جو فی سبیل اللہ دوسروں کو تعلیم دینے کے مقدس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ بیت المال سے سو دینار دیئے جائیں

لیکن جہاں تک مذہبی تعلیم کے معاوضہ کا تعلق ہے اس بارے میں البتہ کچھ اختلاف رائے کا پتہ چلتا ہے جن کے لیے بمشکل دو روایتیں خالص [illegible] ی تعلیم کے جواز میں ملیں گی ابن ماجہ نے "باب معاوضۃ التعلیم" کے تحت عبادہ بن صامت جنہوں نے اصحاب صفہ کو تعلیم دی تھی کی حدیث پیش کی ہے کہ ان کے ایک شاگرد نے انہیں ایک کمان پیش کی جب آنحضرتؐ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے حضرت عبادہؓ کو حکم دیا کہ وہ اسے قبول نہ کریں۔ اس لیے کہ اصحاب صفہ بہت ہی غریب تھے اور دن بھر پیٹ پالنے کی خاطر مشقت کرتے تھے۔ اس لیے ان لوگوں کی تعلیم کے لیے ایک شبینہ اسکول کا انتظام لازمی تھا۔

مذکورہ بالا مثال اور چند احادیث ہی اس اسلامی تعلیم کی روح ہیں جس نے معلموں اور فاضلوں کو پشت در پشت بے لوث و بلا معاوضہ خدمت کرنے پر آمادہ رکھا۔ ان اداروں سے طالب علموں کے غول کے غول نکلتے تھے جن کے اساتذہ سادگی و خاکساری کا مرقع ہوتے تھے اور ان تنگ و کوٹھریوں میں وہ علم کی شمعیں روشن کیں جن کی شعاعیں چار دانگ عالم میں پھیلیں۔ پست پھیٹ تکلیں اور طلبا بھی اپنی باری پر ان اعلیٰ معیاروں کے متحمل تھے کہ بلا معاوضہ خدمت خلق پر کمر بستہ رہتے اس کے باوجود اسلام تعلیم کے اقتصادی تقاضوں سے بالکل چشم پوشی نہیں کرتا جو دو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی ان

مشکلات کا امکان تھا جو تعلیمی نظام کے خاص معیاری بنیاد پر قائم کرنے سے پیش آئیں گی خصوصاً اس زمانہ میں جب
کہ مذہبی جوش و ولولہ سرد پڑ جائے گا اور اقتصادی و معاشرتی پہلو زیادہ قابل غور ہو جائیں گے۔ ہمیں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں
کہ نہ صرف قرآن پاک کی تعلیم بلکہ خالی تلاوت پر معاوضہ دیا گیا ہے

مالی معاوضہ کے جواز میں سب سے زیادہ واضح دلیل ابن سعید خدری کی حدیث ہے جس میں ایک ایسے قبیلہ نے تیس
بکریاں پیش کیں جس کے سردار کو بچھو نے ڈس لیا تھا اور جب ابن سعید خدری نے قرآن کی چند آیتیں تلاوت کیں تو وہ ٹھیک
ہو گیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے اس کو جائز قرار دیا۔ جب لوگوں نے ابن سعید سے تلاوت قرآن
کر کے روزی کمانے پر رد و قدح کی تو انہوں نے کہا کہ کتاب اللہ پر تو سب سے زیادہ معاوضہ طلب کیا جا سکتا ہے۔
ابوداؤد و نسائی میں ہے کہ ایک مسلمان نے سورۂ فاتحہ پڑھ کر ایک پاگل آدمی کو اچھا کر دیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
نے انعام لینے کو جائز قرار دیا اور اپنی جان کی قسم کھا کر فرمایا " دوسرے لوگ۔ جادو اور منتروں سے کماتے ہیں اور یہ تو
اللہ کے کلام کی تلاوت ہے ایک اور حدیث میں اس کا زیادہ وضاحت کے ساتھ پتہ چلتا ہے کہ تعلیم کی بنیاد اقتصادی اصول
پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے زمانہ ہی میں پڑ چکی تھی یا پڑنے والی تھی۔ اس لئے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ
واصحابہ وسلم نے ایک عورت کا نکاح ایک مرد سے اس وعدہ پر پڑھا دیا تھا کہ وہ مہر کے معاوضہ میں اسے قرآن پڑھا دے گا۔
اس معاہدہ سے تعلیم کے اقتصادی رخ پر روشنی پڑتی ہے اس لئے کہ معاوضہ کا دارومدار جانبین کی ذاتی و مالی حیثیت کے
مطابق طے ہوتا ہے اسی طرح جنگ بدر میں وہ قیدی جو فدیہ نہ دے سکتے تھے اس شرط پر چھوڑ دیئے گئے کہ ان میں سے ہر
ایک مدینہ کے دس دس آدمیوں کو لکھنا سکھا دے گا۔ اس بات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ
وسلم نے تعلیم کی تاسیس دنیاوی تشکیل کی کھلم کھلا امداد کی

امام نووی کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ، مالکؒ اور اسحاقؒ کے نزدیک معاوضہ لینا جائز ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک
جائز نہیں۔ بعد کے دور میں ہمیں کافی مواد ملتا ہے جس سے اس کی تقویت ہوتی ہے کہ مالی معاوضہ طریقہ تعلیم کا لازم خصوصیت
بن چکا تھا۔ ہمیں اس بات کے متعلق تفصیلی ریکارڈ ملتا ہے کہ ان استادوں کو جو عثمانی عہد کے مدارس میں تعلیم دیتے تھے متعین
مشاہرہ ملتا تھا۔ پروفیسر ریبیرا نے اسپین میں ایک قلمی نسخہ دیکھا جس سے اس قسم کی خدمت پر معاہدوں کے طریقہ کے عام
رواج کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب میں ان معاہدوں کی قانونی شکلیں ہیں جو استاد و شاگرد یا اساتذہ کے درمیان تعلیمی مقصد

ہوتے تھے۔ اس میں معاہدوں کی رقوم کا بھی صریحاً ذکر ہے بلکہ ان کی تعیین مقدار بھی بتائی گئی ہے ان معاہدوں کے اصل متن ڈاکٹر اگرا کی کتاب STUDIES IN ISLAM کے تین ضمیموں میں دیئے گئے ہیں یہ فارم بالکل غیر شخصی نوعیت کے ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ تعلیمات میں معاہدہ کا طریقہ عام طور پر ملک میں رائج تھا۔

تربیتِ کردار

فضل احمد

کیا تعلیم کا مقصد کچھ مطلوبہ واقفیت، معلومات اور ذہنی اور بدنی مہارتیں پیدا کر دینا ہی ہے یا تربیت کردار بھی اس میں شامل ہے؟ عہد حاضر کی صنعتی تہذیب کے لئے یہ سوال دن بدن بڑی اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے موجودہ ٹیکنیکل تہذیب کا امتیازی نشان مہارت خصوصی ہے۔ ہر فرد کو صنعت، تجارت، علم وغیرہ کی کسی ایک شاخ میں مہارت خصوصی پیدا کرنی پڑتی ہے کیونکہ اس کے بغیر کسی معاشرے کی ٹیکنیکل استعداد کا برقرار رہنا محال ہو جاتا ہے اور یہ خصوصی مہارت اس قدر وقت اور توجہ جذب کر لیتی ہے کہ فرد کی شخصیت کے کئی ایک پہلو تشنۂ توجہ رہ جاتے ہیں۔ اس لئے گو عام طور پر وہ ایک ماہر ڈاکٹر، یا انجینئر یا علم مشین کا ماہر تو بن جاتا ہے لیکن پسندیدہ انسانی اطوار سے اکثر محروم رہتا ہے۔ برطانیہ اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملکوں میں جدید تعلیم کی اس کمی کو بڑی طرح محسوس کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس معاملہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک بہت بڑے صنعت کار نے حال ہی میں کہا تھا کہ اگر میرے ٹائپسٹ کو انگریزی کے کسی لفظ کے ہجے اچھی طرح نہ بھی یاد ہوں تو بھی میرا کام چل سکتا ہے کیونکہ وہ میز سے لغات اٹھا کر ہجے کر دیکھ لیا کرے گا لیکن اگر اس میں اعتماد نفس، تعاون، وفاداری اور دیانتداری کے سے پسندیدہ اوصاف موجود نہیں تو پھر ایسے ملازم کے ساتھ نباہ مشکل ہے کیونکہ یہ اوصاف اسے بوقت ضرورت اُدھار نہیں مل سکتے۔

غرض ٹکنالوجی کی اہمیت پر حد سے بڑھے ہوئے زور نے مغربی دنیا میں تربیت کردار کے مسئلے کو پھر اہمیت دے دی ہے اور ماہرین تعلیم اس فکر میں ہیں کہ ٹکنالوجی کی اہمیت کو کم کئے بغیر تربیت کردار کی کوئی مناسب راہ تلاش کریں۔

...کیا ہے؟

...جہاں تک قدرتی طور پر یہ پوچھا جائے گا کہ کردار میں کون کون سے اوصاف شامل ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اس بارے میں ماہرین تعلیم یک زبان نہیں۔ کردار بعض پسندیدہ اطوار کے مجموعے کا نام ہے۔ لیکن اس مجموعے کی حد بندی کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔

انسان ایک معاشرتی حیوان ہے۔ دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنا اس کے ضمیر فطرت میں داخل ہے تنہائی کی زندگی اس کے لئے اجیرن ہے لیکن دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنے سے فوراً بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر انسان کو بلا شرکت تنہا ہی زندگی گذارنی ہوتی تو وہ جس طرح بھی اپنا وقت کاٹ لیتا اچھا تھا لیکن موجودہ صورت میں اس کا ہر فعل دوسروں پر ردعمل پیدا کرتا ہے۔ غالباً اس کی زندگی کا کوئی کام بھی ایسا نہیں جو گردوپیش کے ماحول کو تھوڑا بہت متاثر نہ کرے۔ یا دوسرے لفظوں میں اس کا کوئی فعل ایسا نہیں جو دوسروں کی زندگیوں پر تھوڑا بہت اثر ڈالنے والا نہ ہو۔ معاشری زندگی کا یہ نکتہ ہر شخص کے کندھوں پر ایک بہت بھاری ذمہ داری ڈال دیتا ہے۔ اس سے اس کا یہ اختیار یک دم چھن جاتا ہے کہ وہ جو جی میں آئے کرے۔ اسے ہر قدم اٹھانے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے کہ اس کا اثر دوسروں پر کیا ہوگا۔ پس اگر اس کی ذہنی تربیت اس طرح ہوئی ہے کہ اس کا ہر فعل معاشری زندگی کی خوشی اور لطافت کو بڑھانے والا ہو یا کم از کم اس کی مسرت کو کم کرنے والا نہ ہو تو وہ ایک پسندیدہ کردار کا مالک کہلائے گا۔

کردار کے اس تصور سے یہ بات صاف ہو جانی چاہیئے کہ کردار کا اخلاقی پہلو باقی تمام پہلوؤں سے نمایاں ہے۔ ہم کردار میں خواہ کچھ اقدار ہی شامل کریں ان میں اخلاقی اقدار کو پہلا درجہ دیئے بغیر اجتماعی زندگی کی زیادہ سے زیادہ بھلائی کا حصول ممکن نہیں۔ گویا تربیت کردار میں اخلاقی تربیت کو اولیت کا مقام حاصل ہونا چاہیئے۔

ہم نے یہ بھی کہا ہے کہ اچھا کردار اجتماعی زندگی کے لئے خیر و برکت کا ذریعہ ہونا چاہیئے۔ لیکن کونسی اجتماعی زندگی؟ کیا اس سے مراد کنبہ کی زندگی ہے یا اپنے شہر اور قریہ کی زندگی یا ساری قوم کی زندگی یا نوع انسان کی زندگی؟ تاریخ کے ابتدائی دور میں اجتماعی زندگی کی حدیں بے شک کنبہ پر ہی ختم ہو جاتی تھیں لیکن

جوں جوں انسان نے معاشرتی زندگی میں ترقی کی اس کی اجتماعی زندگی کا دائرہ بھی بڑھتا گیا تا آنکہ وہ دور حاضر میں قوم پر آکر رک گیا۔ اجتماعی زندگی کا نصب العین بے شک کل نوع انسان کی زندگی بھی ہونا چاہئے لیکن دنیا ابھی اس منزل سے دور ہے۔ آج ایک اچھے کردار کا حامل وہ شخص ہے جس کے افعال اپنے ملک اور قوم کے لئے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند ہوں۔ مثلاً کلائو ہمارے نقطہ نگاہ سے بہت سنگین سیاسی جرائم کا مجرم ہے مگر وہ انگریز قوم کا ہیرو ہے کیونکہ گو اس کے افعال نے ہمیں نقصان پہنچایا مگر ان سے انگریز قوم کی سیاسی عظمت کو چار چاند لگ گئے۔

آج کل انجمن اقوام متحدہ کی سیادت میں بین الاقوامی شہریت کا بہت کچھ چرچا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے ہر فرد کی تربیت اس طرح کی جائے کہ وہ اپنے اقوال و افعال سے عالمی بھلائی کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کی کوشش کرے۔ یہ نصب العین نہایت خوبصورت اور پسندیدہ ہے لیکن ابھی اس کے حصول کے لئے غالباً بہت وقت اور کوشش درکار ہے۔ عموماً ابھی ہر قوم یہی کوشش کرتی ہے کہ اس کے تمام شہری ایسی ذہنی ساخت کے مالک ہوں کہ ان کے اقوال و افعال نادانستہ طور پر قومی اور ملکی مفاد کو زیادہ سے زیادہ ترقی دیں۔ ایک برطانوی باپ کی سب سے بڑی خواہش آج بھی یہی ہے کہ اس کا بیٹا "ایک اچھا عیسائی اور ایک اچھا محب وطن" ثابت ہو۔

اسلامی نقطہ نگاہ

اسلام نے بلاشبہ کردار کو ہر قسم کی تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیا ہے۔ قرآن مجید دنیا جہان کے لئے ہدایت کا پیغام لے کر آیا ہے مگر اس ہدایت کے لئے ایک ضروری شرط کا اعلان بھی ساتھ ہی کر دیا جاتا ہے۔ ہدایت صرف ان لوگوں کو نصیب ہوگی جو صاحب تقویٰ ہوں گے۔ گویا ہر قسم کی ہدایت اور روشنی حاصل کرنے کے لئے تقویٰ پہلی شرط ہے۔ پس اسلام کے نزدیک کردار کا خلاصہ صرف ایک لفظ میں بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے "خوف خدا"۔ اگر کوئی شخص ہر قدم اٹھانے سے پہلے یہ سوچ لیتا ہے کہ مجھے بہت جلد خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا تو لازمی طور پر وہ جان بوجھ کر کبھی کوئی قدم ایسا نہیں اٹھائیگا جس سے اجتماعی مفاد کو دھکا لگے۔ وہ محض اپنے فائدے کے لئے دوسرے کے مفاد کو کبھی قربان

نہیں کرے گا۔

پس اسلام میں سب سے زیادہ زور روحانی اقدار پر ہے۔ یہی دیکھیے خدا پر ایمان لانا اور اس طرح ایمان لانا کہ گویا وہ ظاہر و باطن کی ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو دیکھ رہا ہے یہاں ہر قسم کی تعلیم کا حرف اول ہے۔ یہ حرف اوّل خلاصۂ کردار ہے اور اسلام کسی ایسی تعلیم کا قائل نہیں جو اس سے خالی ہو کیونکہ باقی ہر طرح کی اخلاقی اقدار اس ایک روحانی قدر کے پیچھے پیچھے خود بخود ہاتھ باندھے چلی آئیں گی۔ مغرب نے چند ایک اخلاقی اقدار کو کردار کی بنا قرار دے رکھا ہے مگر اسلام معاملے کی تہ کو پہنچ کر صرف ایک بنیادی روحانی قدر کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے جو باقی تمام پسندیدہ اقدار کی ہر طرح سے ضامن ہے۔

اسلام نے جس بنیادی روحانی قدر کو کردار کی اساس بنایا ہے اس کے نتائج و عواطف اس قدر ہمہ گیر ہیں کہ وہ ہر قسم کی تنگ حد بندیوں کو توڑتے ہوئے پوری نوع انسان کی بھلائی کو اپنے احاطے میں لے آتے ہیں جس دل میں خدا کا خوف موجود ہے وہ نہ اپنی ذات کے لئے، نہ خویش و اقربا کے لئے، نہ قبیلہ اور قریہ کے لئے اور نہ ملک و قوم کی خاطر ہی کوئی ایسا کام کرے گا جس کے لئے اسے خدائی مواخذہ کا ڈر ہو۔ خوف خدا وہ فوق العادة قوت محاسبہ ہے جس کے سامنے ہر قسم کے جذباتی ہیجان اور ہر طرح کے ہنگامی طوفان سرد پڑ جاتے ہیں اور انسان معاملہ کو اس کے اصل رنگ روپ میں دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہی وہ پاکیزہ جذبہ ہے جو قومی نسلی ملکی لسانی جغرافیائی غرضیکہ ہر قسم کے چھوٹے خداؤں کی اکڑی ہوئی گردنوں کو جھکا کر تمام نوع انسان کو صرف ایک چوکھٹ کا پرستار بنا دیتا ہے۔ اور اس طرح وہ پاکیزہ اور بلند کردار جنم لیتا ہے جس کے لئے اجتماعی زندگی کا دائرہ عالمگیر وسعت سے کم تر حدوں پر ٹھیرنا جانتا ہی نہیں۔ یہاں ٹیکنیکل اور سائنسی علوم کے بارے میں تحمل سے کام نہیں لیا جاتا البتہ ان سب کی بنیادیں لامحالہ اسی کردار پر اٹھائی جاتی ہیں۔

ہماری روایات

کردار کے اس اسلامی تصور پر جو معاشرہ تعمیر ہوا اس کی داستان تاریخ کے صفحوں میں موجود ہے مسلمانوں نے علمی اور فنی مہارت کے میدان میں دنیا بھر کو راستہ دکھایا مگر یہ علمی اور فنی مہارت ان کے کردار کے بنیادی نقطہ کو اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکی۔ خواہ آپ رومی و غزالی کو دیکھیں اور خواہ بو علی سینا و ابن رشد کو۔ دونوں جگہ آپ کو ایک

ایسا کردار نظر آئے گا جو اپنی تمام تر قوت تقویٰ سے حاصل کر رہا ہے۔

یہ انہی روایات کا نتیجہ تھا کہ صدیوں تک ہمارے نظام تعلیم پر اخلاقی رنگ غالب رہا۔ خواہ کسی طالب علم کو سیاست و حکمرانی کے لئے تیار کرنا ہوا در خواہ طب۔ علم دین یا کسی اور چیز کے لئے۔ بہرحال اس کے لئے مذہبی اور اخلاقی تعلیم اس زینے کی پہلی سیڑھی ہوا کرتی تھی۔ قرآن۔ حدیث اور فقہ کا تھوڑا بہت علم ہر اس شخص کے لئے ضروری خیال کیا جاتا تھا جو لکھ پڑھا ہونے کا دعوے دار بننا چاہیئے۔ سعدی اور رومی نے اسلامی اخلاقیات کی روح کو اپنے شیریں کلام میں منتقل کر دیا جس کے بعد مثنوی، گلستان۔ اور بوستان صدہا سال تک ہند و ایران کے مکتبوں میں داخل نصاب رہیں۔ ہندوستان میں اس اخلاقی نصاب نے مدتوں تک ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے کردار کی تربیت کی۔ اور انگریزی عملداری کے شروع ہو جانے کے کئی سال بعد تک بھی یہ حالت باقی رہی۔

جو شخص اس نصاب میں سے گذر جاتا تھا اس کا کردار ایک خاص وضع کا حامل بن جاتا تھا۔ اس کے اوضاع و اطوار اور اس کے طور طریقے اس مخصوص رنگ میں رنگے جاتے تھے جسے عرف عام میں ہم ہند و اسلامی ثقافت کے نام سے پکارتے ہیں۔ ہرچند کہ یہ ثقافت استبداد زمانہ کے باعث خالص اسلامی رنگ کو بہت کچھ کھو چکی تھی۔ لیکن پھر بھی اس کی ایک نمایاں جھلک اس میں موجود رہی۔ اگرچہ اس کردار کا تجزیہ کرنا مشکل ہے تاہم اس چیز سے انکار محال ہے کہ اس کردار میں ایک خاص قسم کے حیا و شرم اور ایک مخصوص وضع داری، حفظ مراتب اور رواداری کا رنگ نمایاں تھا۔

موازنہ

مغرب کی قوم پرستی نے جس کردار کو جنم دیا ہے اس کی طرف پیچھے اشارہ گذر چکا ہے۔ آج ہم ترقی یافتہ مغربی ملکوں کے قومی کردار کو دیکھ کر سر دھنتے ہیں اور بڑی حسرت کے ساتھ اس بات کا گلہ کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں یہ چیز سرے سے ناپید ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ شکایت بجا ہے۔ قوم پرستی کا نصب العین بہت اونچا نہ سہی لیکن بہرحال یہ ایک نصب العین ضرور ہے اور مغربی دنیا پر مذہب کی گرفت ڈھیلی ہو جانے سے جس ذہنی انتشار کا خطرہ ہو سکتا تھا اس نصب العین نے اس کا راستہ صدیوں تک روکے رکھا۔ اس نے مغربی

قوموں کی بدنی اور ذہنی صلاحیتوں کو ایک ایسے کڑے ضبط کے تابع کر دیا جس کی بدولت ان میں ایک نمایاں نظم و ترتیب پیدا ہو گئی۔ چنانچہ قومی اطوار کی یہ ہم آہنگی ہر دیکھنے والے کی نگاہ کو متاثر کرتی ہے۔ کوئی انگریز امیر ہو یا فقیر۔ اجتماعی زندگی کے اکثر امور میں ایک خاص نہج پر چلے گا۔ مثلاً ٹکٹ گھر سے ٹکٹ لیتے وقت ہر شخص اپنی جا سے قطار میں کھڑا ہوتا جائے گا۔ قطع نظر اس سے کہ وہ مزدور ہے یا حکومت کا کوئی وزیر۔ اور جب آہستہ آہستہ سرکتا ہوا کھڑکی کے سامنے آئے گا۔ اپنا ٹکٹ خرید لے گا۔ اگر اس دوران میں کسی ضرورت کے لئے اسے قطار میں سے نکل کر چند منٹوں کے بعد واپس آنا پڑے تو وہ اپنی جگہ کو جوں کا توں محفوظ پائے گا۔ ہماری طرح یہ نہیں کہ کھڑکی کے سامنے افراتفری۔ اور گتھم گتھا کا عالم ہے جس میں ہر شخص دوسروں کو روند کر سب سے آگے بڑھ جانے کی دھن میں ہے۔ اور اگر پولیس کا کوئی سپاہی ڈنڈا پکڑے کچھ نظم و ترتیب قائم بھی کر دے تو ہر شخص اس موقع کی تاک میں رہے گا کہ سپاہی کی نگاہ ذرا دوسری طرف ہو اور میں فرصت کو غنیمت جان کر دو چار لوگوں سے آگے بڑھ جاؤں۔

یہ صورت حال بے شک افسوسناک ہے مگر اس کے اسباب بالکل ظاہر ہیں۔ جدید زندگی کے چند در چند تقاضے میں اس وقت نمودار ہوئے جب مغربی اثرات ہمارے روایتی اخلاقی نصاب کو پارہ پارہ کر چکے تھے۔ چنانچہ قوم کو ان تقاضوں سے ایسی حالت میں دوچار ہونا پڑا جب ان کی بجا آوری کی تربیت سرے سے غائب تھی۔ مغرب میں مذہب کی جگہ قوم پرستی نے لے لی تھی اور جو کام اب مذہب سرانجام نہ دے سکتا تھا وہ جذبہ حب وطنی اور قومی تفاخر کے نام پر پورا ہونے لگا۔ لیکن یہاں خلا جوں کا توں باقی رہا جس کا لازمی نتیجہ افراتفری ہی ہو سکتا تھا۔ جب کوئی نصب العین پیش نظر نہ ہو اور عوام کے سامنے کوئی مشترک نقطہ موجود نہ ہو تو کردار میں ہم آہنگی آئے تو کیونکر؟

نئی ذمہ داری

آج ہم ایک آزاد ملت ہیں اور یہ آزادی اس چیز کی دہائی دے کر حاصل کی گئی ہے کہ ہمارے رہنے سہنے کے طور طریقے ہمسایہ قوم سے بالکل الگ ہیں اس لئے ہم اپنے لئے ایک الگ وطن چاہتے ہیں تاکہ یہ مخصوص طرز زندگی بلا روک ٹوک بڑھے پھولے۔ دنیا آج یہ جاننے کے لئے بے قرار ہے کہ وہ مخصوص اسلامی اقدا

کون سی ہیں جن کو ہم اپنے ہاں زندہ رکھنا اور فروغ دینا چاہتے ہیں۔ بیرونی ملکوں سے جو لوگ پاکستان میں آتے ہیں ان کی نگاہ قدرتی طور پر اس مخصوص قومی کردار کی تلاش کرتی ہے اور جب انہیں کوئی ایسی شے نظر نہیں آتی تو وہ متعجب ہو کر یہ سوال پوچھتے ہیں کہ آخر یہی اسلامی اقدار کی عملی کارفرمائی دیکھی کہاں جائے! اس سوال پر ہر محب وطن پاکستانی ندامت کے ساتھ سر جھکا لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ حق یہ ہے کہ پاکستان نے اپنے ذمہ ایک ایسا بھاری فرض لے رکھا ہے جس کی بجا آوری اس کے عزم و خلوص کا کڑا امتحان لے گی۔ یہ ایک بہت بڑی آزمائش ہے۔ ایسی آزمائش جس میں ہر شہری برابر کا شریک ہے۔ اگر ہماری اجتماعی زندگی میں کوئی ایسی خصوصیات پیدا نہیں ہو جاتیں جو اسے دوسری نوعیت کی اجتماعی زندگیوں سے ممتاز کریں تو پھر پاکستان کا سب سے بڑا دعوےٰ باطل قرار پاتا ہے اور قومی آبرو کے لئے غالباً اس سے زیادہ سیاہ دھبہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

ماضی و حال

یہ اشارہ پیچھے گذر چکا ہے کہ کردار کی کوئی بندھی ٹکی تعریف کرنا مشکل ہے۔ ہاں اس قدر ضرور ہے کہ اعلیٰ کردار کی آئینہ داری وہ اعمال و افعال کیا کرتے ہیں جو اس سے مترتب ہوتے ہیں۔ آج برطانوی قوم اپنے قومی کردار کی تعریف کرتی نہیں تھکتی اور دنیا بھی اس کردار کی پختگی اور بلندی کی عام طور پر مداح ہے۔ وجہ بالکل عیاں ہے۔ پچھلی تین چار صدیوں میں اس قوم نے تاریخ عالم میں ایک اہم اور فعال عنصر کا کام کیا ہے۔ زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں اس کے کارنامے دوست و دشمن ہر ایک سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں اگرچہ یہ کارنامے بالعموم افراد ہی کے کارنامے ہیں لیکن فرد کے کردار اور قومی کردار میں جو گہرا رشتہ ہے اس کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہیں کہ ان افراد کا کردار قومی کردار کی ہی عکاسی کر رہا تھا۔

اس روشنی میں جب ہم اپنے بیتے ہوئے قومی کردار پر نگاہ ڈالتے ہیں تو بڑی حسرت کے ساتھ یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم کس بلندی سے پستی میں گر گئے ہیں۔ عرب کے صحرا نشینوں کا شمار دنیا کی مہذب اقوام میں کبھی نہ ہوا تھا۔ ان کی قومی ہستی یا دوسرے الفاظ میں ان کا قومی کردار ایک گمنام اور نامعلوم مقدار تھی۔ لیکن اس ریگ زار میں توحید کا چشمہ ابلنے کی دیر تھی کہ اس قوم کے رگ و پے میں زندگی کی ایک ایسی لہر دوڑ گئی جس نے

ے کردار کی کایا پلٹ دی۔ یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اس کردار کی بنیاد سراسر روحانی نوعیت کی تھی جس کا
رہ تھا تقویٰ۔ یہ اسی کردار کا کرشمہ تھا کہ عربی فتوحات کے سیلاب نے معلوم دنیا کے بڑے حصے کو لپیٹ
ے میں لے لیا اور کوئی ایک صدی کے عرصے میں ہلالی پرچم ایشیا۔ افریقہ اور یورپ کے براعظموں پر لہراتا
نظر آنے لگا۔ عربوں کے بعد جن قوموں نے اسلام کا جھنڈا سنبھالا ان سب کو یہ کردار ورثہ میں ملا اور گو وقتاً فوقتاً
ساتھ اس میں اور اقدار بڑھتی رہیں تاہم اس کی روحانی بنیاد بدستور باقی رہی۔ تا آنکہ مغرب کی مادی تہذیب کے
اثر نے اس کی بنیادیں ہلا دیں اور بالآخر اس کی جگہ ایک ایسا لایعنی خلا پیدا ہوا جس نے ہر قسم کے ذہنی اور
ری انتشار کے دروازے چوپٹ کھول دیئے۔

یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ آج قومی کردار کے معاملے میں ہم بالکل خالی ہاتھ ہیں۔ ہمارے ہاں تعمیر
ردار کا بڑا سہارا مذہبی اور اخلاقی تعلیم تھی جس کا آغاز گھریلو زندگی میں ہی ہو جایا کرتا تھا۔ بچہ ہوش سنبھالتے
ی ماں۔ باپ۔ بھائی۔ بہنوں اور کنبہ کے دوسرے لوگوں کو نماز۔ روزہ اور دوسرے شعائر دین کا پابند
یکھتا۔ اسے اجتماعی زندگی کی جن مجلسوں میں جانا پڑتا وہاں اکثر بزرگانِ دین کے تذکرے کان میں پڑتے۔
ر گھر میں کچھ پڑھے لکھے لوگ موجود ہوتے تو سعدی اور رومی کے کلام کی شیرینی سے اس کو آگاہی ضروری ہو جاتی۔
گھر اور معاشرے کے بعد مدرسہ اس کی تربیت کا بوجھ اٹھاتا تو وہاں بھی یہی رنگ جھلکتا نظر آتا۔ غرض پہلے دن
سے کردار کی تعمیر ان اخلاقی اقدار پر شروع ہوتی جو صدیوں سے پسندیدہ شمار ہوتی چلی آ رہی تھیں۔ اس ہمہ گیر معاشرتی
رنگ سے خالی رہنا کسی شخص کے لئے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ معاشرے کو اپنے ہر شہری پہ بھروسہ ہوتا کہ اس میں کم از کم
فلاں اخلاقی اقدار ضرور موجود ہوں گی۔

لیکن آج حالت کیا ہے؟ کردار کی تعمیر کے سلسلے میں خشت اول گھر میں ہی رکھی جا سکتی ہے۔ کیا آج یہ
اینٹ سیدھی رکھی جا رہی ہے یا ٹیڑھی؟ یوں تو موجودہ صدی کی پچھلی چند دہائیوں نے دنیا میں ہر جگہ معاشری
زندگی کے تانے بانے کو بری طرح جھنجوڑا ہے لیکن ہمارے ہاں اس مدت میں جو معاشری افراتفری پیدا ہوئی
ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ گھریلو زندگی کا خاکہ ہی سرے سے بھول گیا ہے۔ اچھے کھاتے پیتے
گھرانوں کی عام حالت یہ ہے کہ شعائر دین کا چرچا ہونے کی بجائے اب رات دن سینما کے ستارے زیر بحث

رہتے ہیں۔ بچہ ذرا ہوش سنبھالتا ہے تو قرآنی آیات اور سعدی اور رومی کے کلام کی بجائے اب فلمی گیت اس کے کان میں پڑنے لگتے ہیں۔ گھر میں۔ گلی محلے میں۔ سڑک اور بازار میں ہر جگہ اسے انہی فردوس گوش نغموں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ چنانچہ وہ غریب بھی اپنی توتلی زبان میں انہی کو گنگنا سیکھ جاتا ہے۔ اول اول وہ ان کے مطالب سے بے خبر ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ "کیسی خوشی کی رات" "اور دو گناں کہ میر یار" وغیرہ کے رموز و اسرار بہت جلد اس پہ کھلنے لگتے ہیں کیوں کہ سماعت کے ساتھ ساتھ "بصری امدادیں" بھی اس کی مشکل کشائی کو آن موجود ہوتی ہیں۔

شہروں اور قصبوں میں اچھے اور متوسط طبقے کے بچوں کی تربیت کا سنگ بنیاد تو عام طور پر یہی ہے۔ رہا نچلا طبقہ تو یہاں حالت اس سے بھی زیادہ ناگفتہ بہ ہے۔ ماں باپ کو پیٹ کے دھندوں سے فراغت نہیں۔ بچے کو بالکل اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وہ گلی کوچوں میں جہاں جی چاہے خاک چھانتا پھرے اور بُرے بھلے جیسے کچھ تاثرات چاہے اخذ کرے ان کی بلا سے۔

مدرسے کے لئے معمہ

اب یہ بچے مدرسے کے سپرد کئے جاتے ہیں اور اس سے توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ صحیح کردار کی تربیت کرے۔ مدرسے کے لئے یہ امر بہت بڑا معمہ بن رہا ہے۔ وہ اکیلا اس بوجھ کو کیوں کر اٹھائے؟ جب خشت اول ہی ٹیڑھی رکھی گئی ہے تو وہ اس پر سیدھی دیوار کیوں کر کھڑی کرے؟ اور جب مدرسے سے یہ کام بن نہیں پڑتا تو ہر طرف سے اس پہ لے دے شروع ہو جاتی ہے کہ قومی کردار کی تشکیل مدرسوں میں ہوا کرتی ہے۔ ہمارے مدرسے اس اہم قومی فریضہ سے غافل ہیں وغیرہ۔

مدرسے کے لئے صرف یہی ایک مشکل نہیں کہ جو بچے اس کے سپرد کئے جاتے ہیں انہیں گھر پر درست اخلاقی اقدار سے عموماً آشنا نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے لئے ایک اور مشکل بھی موجود ہے۔ تعمیر کردار میں گھر کو دو وجوہ سے صدر درجہ کی اہمیت حاصل ہے۔ اول تو اخلاقی اقدار سے پہلا تعارف کرانے کے معاملے میں جس کا ذکر ہو چکا ہے دوسرے محبت اور شفقت کے ماحول میں بچے کے دل میں خود اعتمادی پیدا کرنا۔ جو بچہ شفقت والدین سے محروم رہے گا وہ اعتماد نفس سے بھی خالی رہے گا۔ گو ہمارے ہاں ماں باپ کی حد سے بڑ

بھی صحبت ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے لیکن جدید صنعتی تہذیب بڑے شہروں کے محنت کاروں میں ایک ایسا طبقہ بھی پیدا کر رہی ہے جو بچوں کو اس ابتدائی فطری ضرورت سے بھی محروم رکھتا ہے۔ اور جس کے بچے اعتماد نفس سے بالکل اسی طرح کورے ہوتے ہیں جس طرح یتیم اور لاوارث بچے۔ ایسے بچوں کی موزوں تربیت کے لئے استاد کو شفقتِ پدری کا سامان کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

غرض مدرسے کے لئے بڑی دشواری یہ ہے کہ گھر کا اخلاقی ڈھانچہ دن بدن ڈھیلا پڑتا جارہا ہے اور تربیت کردار کے معاملے میں اسے جو مدد گھر سے ملا کرتی تھی وہ بہت حد تک ختم ہو چکی ہے۔ تو کیا اس صورت میں مدرسہ بھی یہ کہہ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکتا ہے کہ جس چیز کی خود والدین کو پرواہ نہیں اس کی مجھے کیوں فکر ہو؟ ظاہر ہے کہ مدرسہ کے لئے ایسا کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ والدین بچے کے مستقبل سے غافل ہو سکتے ہیں لیکن اساتذہ نہیں ہو سکتے۔ بلکہ جوں جوں میکانکی تہذیب کی کارفرمائیاں والدین اور بچے میں بُعد پیدا کرتی جائیں گی اسی قدر اساتذہ کے فرائض بڑھتے چلے جائیں گے۔ مغربی ملکوں میں مدرسوں نے بچوں کی جسمانی اور اخلاقی پرورش کے بہت سے فرائض اپنے ذمے لے رکھے ہیں اور ایسے فرائض کی فہرست دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہمارے ہاں بھی مدرسہ کو یہ سب کچھ کرنا ہوگا ورنہ تربیت کردار کی کوئی راہ باقی نہ رہے گی۔ اگر ہمارے مدارس کی موجودہ تنظیم اس فرض کو انجام دینے سے قاصر ہے تو اس تنظیم کو تبدیل کرنا ہوگا لیکن اس نتیجہ سے مفر نہیں کہ مستقبل کے شہریوں کا کردار اب گھروں کی بجائے زیادہ تر مدرسوں میں ڈھلا کرے گا جس قدر جلد ہم اس حقیقت کو تسلیم کر کے اس کے ساتھ نباہ کرنے کی راہیں سوچیں گے اسی قدر اچھا ہوگا۔

دو نقطہ ہائے نگاہ

تعمیر کردار کے بارے میں ماہرینِ تعلیم دو مدرسہ ہائے فکر میں بٹے ہوئے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ انسانی فطرت سرتاپا خیر ہی خیر ہے اس میں شر کا وجود نہیں۔ تعلیم کا کام صرف یہ ہے کہ اس فطری خیر کے بڑھنے پھولنے میں جو رکاوٹیں حائل ہوں انہیں دور کر دے تاکہ بچے کے فطری اوصاف آزادانہ بڑھیں پھولیں شر صرف اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب ان فطری میلانوں کی تشفی کا راستہ روکا جائے۔ پس بچے کے فطری جوہروں کو بلا روک ٹوک بڑھنے پھولنے کے مواقع جس قدر زیادہ ہوں گے اسی قدر تعمیر کردار زیادہ کامیابی

کے ساتھ ہو سکے گی ۔

اس کے برعکس دوسرا نظریہ یہ ہے کہ انسانی فطرت خیر و شر کے اجزا سے مرکب ہے اور استاد کا کام یہ ہے کہ شر کے عناصر کو دبائے اور خیر کے عناصر کو ابھارے اور اس طرح کردار کو ایک مطلوبہ سانچے میں ڈھال دے ۔ دونوں فریق اپنے اپنے نظریے کی تائید میں وزنی دلائل پیش کرتے ہیں ۔ ہمیں یہاں اس بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں ۔ ہمارے نقطۂ نگاہ سے صرف اس قدر معلوم کر لینا ہی کافی ہے کہ گو اسلام انسان کی فطری بھلائی کا قائل ہے تاہم وہ تادیب کی ضرورت سے غافل نہیں ۔ ہر چند کہ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ اس کی صحیح تربیت پر بھی زور دیتا ہے ۔

خواہ ہم دونوں نظریوں میں سے کسی ایک کو بھی درست مانیں یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ کردار کے ڈھالنے میں استاد کی شخصیت کو بڑا دخل ہے ۔ استاد دانستہ طور پر اپنے شاگردوں کے اطوار کو کسی خاص سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے یا نہ کرے اس کی شخصیت کے اثرات دو صورتوں سے باہر نہ ہوں گے ۔ یا تو شاگرد اس کی ذاتی مثال سے تنفر پکڑ کر اس سے دور بھاگیں گے اور یا اس سے متاثر ہو کر اس کی تقلید کریں گے ۔ استاد کا اپنا کردار جس قدر زیادہ پسندیدہ اطوار پر مشتمل ہوگا اور جس قدر اس کا نقطۂ نگاہ ہمدردانہ ہوگا اسی قدر زیادہ اس کی ذاتی مثال شاگردوں کے لئے نمونہ کا کام دے گی اور ان کے کردار غیر محسوس طور پر اس کے اپنے کردار کے سانچے میں ڈھلتے چلے جائیں گے ۔

استاد کی اہم ذمہ داری

یہ بحث پیچھے گذر چکی ہے کہ عصر حاضر کے صنعتی تمدن نے گھر کے روایتی اخلاقی اثرات کو بہت حد تک مفلوج کر دیا ہے اور اب یہ امید رکھنا غالباً ایک خوش فہمی ہے کہ گھر کے اخلاقی پہلو کو دوبارہ اس کی پہلی سطح پر واپس لایا جا سکے گا ۔ تاہم ایک صحت مند معاشری زندگی کے لئے کردار کی تربیت لازمی ہے ۔ جب تک نئی پود کا کردار ایک مطلوبہ ساخت اختیار نہیں کرے گا ہماری اجتماعی زندگی کی بے نظمی ختم نہ ہوگی ۔ تربیت کردار کے اس اہم فریضہ کی بجا آوری کا بوجھ آخر الامر استاد کے کاندھوں کو بھی اٹھانا پڑے گا کیونکہ

موجودہ معاشرتی نظام کے ماتحت اور کوئی صورت کارگر ہوتی دکھائی نہیں دیتی ۔

یہ بھی دیکھا جا چکا ہے کہ تربیت کردار میں سب سے اہم چیز استاد کی اپنی مثال ہے ۔ اس غرض کے لئے پند و نصائح اور لفظی تلقین چنداں سود مند نہ ہوگی اگر اس کے پہلو بہ پہلو ناصح کا اپنا نمونہ عملی توضیح پیش نہیں کرے گا ۔ یہ فرض بے شک بہت اہم ہے اور یہ استاد کو باپ سے بھی بلند تر مقام عطا کرتا ہے ۔ ہمارے روایتی نظام تعلیم میں استاد کو پہلے ہی یہ درجہ حاصل تھا لیکن دور حاضر کے معاشرتی تقاضوں نے استاد کے اس مقام کو اور بھی زیادہ اونچا کر دیا ہے ۔ ہر استاد کو اپنی جگہ یہ سوچنا ہوگا کہ وہ کون سے پسندیدہ اطوار ہیں جو کردار کو حسن و لطافت عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اجتماعی اور گھریلو زندگی کی صحت و پائداری کے لئے ضروری ہیں ۔ اگر اس کا اپنا کردار ان اوصاف کی آئینہ داری کرے گا تو طلبہ کے کرداروں میں یہ خوبیاں خود بخود جگہ حاصل کرتی جائیں گی اور رفتہ رفتہ قومی کردار ایک معین شکل اختیار کرے گا ۔

تاہم یہ خیال کرنا بیکار ہے کہ کسی مدرسہ میں صرف ایک آدھ استاد کی مثال یا ذاتی سعی سے کوئی پائدار نتائج مترتب ہو سکیں گے ۔ مدرسہ بذات خود ایک چھوٹا سا معاشرہ ہوا کرتا ہے جس کی اپنی الگ اجتماعی زندگی ہوتی ہے ۔ قومی کردار کی ساخت زیادہ تر ایسے اوصاف پر زور چاہتی ہے جن کا تعلق اجتماعی زندگی کے ساتھ ہو ۔ طلبہ ان اوصاف کو جبھی اخذ کریں گے کہ مدرسہ کی اجتماعی زندگی میں انہیں ان اوصاف کی عملی کارفرمائی نظر آئے ۔ محض ایک اکیلے استاد کی مثال کچھ زیادہ فائدہ رساں نہ ہوگی ۔ پس تربیت کردار میں استاد کی جس ذمہ داری کا ذکر کیا گیا ہے وہ فی الواقع مدرسہ کی ذمہ داری ہے جس میں ہر استاد برابر کا شریک ہے ۔

عظمت رفتہ کا احساس

قومی اور ملی عظمت رفتہ کا سچا شعور بھی تربیت کردار میں بڑی کارآمد شے ہے ۔ اس کی تاثیر کا کچھ اندازہ حالی اور اقبال کی مقبولیت سے کیا جا سکتا ہے ۔ اس پُر تاثیر عامل سے کماحقہٗ کام لینے کے لئے مدرسہ کو چاہئے اسلامیات اور تاریخ اسلام کے سے مضامین کا مطالعہ تمام طالب علموں کے لئے لازمی قرار دے ۔ یہ مطالعہ طلبہ کے سامنے عمل و کردار کے ایسے بلند نمونے پیش کرے گا جو انہیں عمر بھر بلند سے بلند تر اخلاق کی طرف دعوت دیتے رہیں گے اور جن کی روشنی میں وہ خود اپنے اور دوسروں کے کرداروں کا محاسبہ

کر سکیں گے۔

خاتمہ کلام

کردار کو انفرادی اور قومی زندگی میں جو کلیدی حیثیت حاصل ہے وہ کسی لمبی چوڑی شرح کی محتاج نہیں کوئی ملک قدرت کے مادی عطیوں سے لاکھ مالامال ہو جب تک اس میں بسنے والے اچھے ذہنی اطوار کے مالک نہ ہوں گے اس وقت تک اس کی قدرتی دولت اسے کچھ فائدہ نہ دے سکے گی۔ اس کے برعکس اگر کوئی ملک قدرتی دولت کے معاملے میں زیادہ خوش نصیب نہ بھی ہو لیکن اس کے باشندے ایک مضبوط اور بلند کردار کے مالک ہوں تو وہ بڑی حد تک اپنی محرومی کا ازالہ کرلیں گے۔ پس آج ہمیں مادی ترقی سے زیادہ ضرورت تربیت کردار کی ہے۔ اس اہم قومی خدمت کی بجا آوری میں مدرسہ کو دن بدن بوجھل سے بوجھل فرائض اپنے ذمہ لینے ہوں گے کیوں کہ جدید صنعتی تمدن کے تقاضوں نے اس کے سوا اور کوئی صورت باقی ہی نہیں چھوڑی۔ کیا ہمارے اساتذہ اس بار امانت کو اٹھانے کی صلاحیت پیدا کریں گے یا وہ بدستور "ظلوماً جہولاً" کے مقام پر ہی قناعت کئے رکھیں گے؟ یہ وہ اہم سوال ہے جس کا جواب ہر اُستاد کو اپنے دل میں ڈھونڈنا چاہئے۔

اُستاد کی ذہنی صلاحیت

برطانیہ کے مشہور تعلیمی رسالے "جرنل آف ایجوکیشن" میں ایک نہایت پرمغز لیکن مختصر مضمون مندرجہ با
عنوان سے شائع ہوا ہے۔ قارئین آموزش کے استفادہ کے لئے اس کا ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔ مضمون نگ

(ایڈیٹر)

ایک برطانوی مدرس ہے۔

میرا پڑھانے کا تجربہ جس قدر وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اسی قدر یہ یقین بھی بڑھتا جاتا ہے۔ کہ سب سے
ضروری چیز خود استاد کی ذہنی صلاحیت ہے۔ نفس مضمون، طریقۂ تعلیم اور ساز و سامان جیسی دوسری چیزیں
فی الحقیقت زیادہ وزن نہیں رکھتیں۔ (آج کل سمعی اور بصری امداؤں پر جو زور دیا جا رہا ہے۔ وہ اس
تکلیف دہ شک کی غمازی کرتا ہے کہ بعض اوقات اُستاد اور بالخصوص جدید قسم کے استاد کی ذہنی صلاحیت
مطلب پورا نہیں کر سکتی)

خود اُستاد کا ذہن ہی وہ آئینہ ہے جس کی مدد سے طالب علم دنیا کا ذہنی عکس دیکھتے ہیں۔ لیکن آئینے کے
مقابلے میں یہاں ایک فرق ہے۔ وہ یہ کہ اُستاد کا ذہن نہ صرف حقیقت کو منعکس کرتا ہے۔ بلکہ وہ امر
حقیقت کے خدّ و خال کو بدل کر دیکھنے والوں کے دل و دماغ پر بھی ایک پُر اسرار اثر ڈالتا ہے۔ گویا ورڈ
ورتھ کے الفاظ میں ہم یہ سوال پوچھ سکتے ہیں۔ کہ اُستاد اور شاگرد کے لطیف تعلقات میں کونسی ناقابلِ تجز
صناعی کام میں آتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں نہ صرف خیالات اور اُن کی وسعت بلکہ اُن کے انداز اور خوبی میں بھ
انقلاب پیدا ہونے لگتا ہے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ کہ ان تمام فکری اوصاف کی پرورش ہی اُستاد کی ذ

صلاحیت سے ہوتی ہے۔ جب اُستاد ایک مضبوط کردار کا مالک ہو۔ اور طلبہ نہ صرف اس کا احترام کرتے ہوں۔ بلکہ اس کے ساتھ محبت بھی تو اس صورت میں یہ بات اور بھی زیادہ درست بن جاتی ہے۔ ایسی صورت میں چند ناقابلِ اصلاح بچوں کو چھوڑ کر جو تعداد میں بہت ہی کم ہوں گے۔ باقی بچوں کی ذہنی ساخت تمام تر استاد کے ہاتھوں ڈھلے گی۔ اور وہی اُن کی روشنِ فکر کو شکل دینے والا ہوگا۔

اگر اُستاد کی ذہنی استعداد گھٹیا اور عامیانہ ہے۔ جس کا امکان موجود ہے تو طلبہ بھی گھٹیا قسم کے اثرات قبول کریں گے۔ اس کے برعکس اگر استاد ایک حسین نفیس اور بے لاگ طبیعت کا مالک ہے۔ تو ان خوبیوں کا کچھ نہ کچھ اثر ان بچوں پر بھی پڑے گا جو بظاہر غیر اثر پذیر دکھائی دیتے ہوں۔ یہ پُر اسرار۔ ناقابلِ تجزیہ صناعی بہرحال اپنا کام کرے گی۔ چونکہ خود استاد اور شاگرد کا رشتہ اس چیز کا ضامن ہے۔ یہ چیز بالکل غیر اہم ہے کہ اُستاد کونسا مضمون پڑھاتا ہے۔ ایک گھٹیا ذہن علم کیمیا اور شعر پڑھاتے وقت بھی گھٹیا ہی رہے گا۔

اُستاد کی ذہنی استعداد کو جو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اِس کا اعتراف آج کل نہیں کیا جا رہا بلکہ زیادہ زور طریقہ ہائے تعلیم پر ہے گویا طریقہ تعلیم کسی اندرونی روح کی ضرورت نہیں۔ اگر ہمارے مدرس صحیح دل و دماغ کے مالک ہوں تو ایک ہی پشت کے اندر اندر معاشرتی انقلاب پیدا ہو جاتے۔

اِس امر کا کافی ثبوت موجود ہے۔ کہ اسلوبِ گفتگو اور کثیر الاستعمال الفاظ اندازِ فکر اور ذہنی عادتوں کے ڈھالنے میں بڑی تاثیر رکھتے ہیں۔ زبان کو نفسِ مضمون سے کبھی بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ ایک جزو ہوتی ہے۔ کسی بات کے بیان کرنے کا انداز بالکل ایسا ہی اہم ہوتا ہے۔ جس قدر کہ وہ بات۔ جب ایک زود حس طبیعت متواتر ایک ایسے اعلیٰ ذہن کے زیرِ اثر رہے۔ جو اظہارِ خیال کے لئے عمدہ بندشوں اور متوازی الفاظ سے کام لیتا ہو تو اول الذکر کا اندازہ فکر خود بخود آخر الذکر شکل میں ڈھلنے لگے گا۔ جب کوئی ذہن دوسرے شخص کی مخصوص روشِ فکر اور اس کے مخصوص الفاظ سے واقف ہو جاتا ہے۔ تو اس کے اپنے خیالات بھی یہی نہج اختیار کرنے لگتے ہیں۔ الفاظ باقی ہر ایک چیز کی نسبت ذہنی استعداد کی زیادہ جز دیتے ہیں۔ یہاں مراد خوش بیانی سے نہیں۔ کیونکہ یہ مہارت بعض نا اہل لوگ بھی پیدا کر لیتے ہیں۔ ایک عمدہ ذہن عمدہ خیالات کا حامل ہوگا۔ اور اس کی ذہنی استعداد پُر اسرار طریقوں میں کام کرتی نظر آئے گی۔ ایسے ذہن کی تاثیر

[illegible] بھی متردد تھی - کلاسیکی مضامین کا مطالعہ محض اس وجہ سے جائز قرار دیا جا سکتا ہے -

یہ امر افسوس ناک ہے کہ دان بدان صحیح قسم کے دل و دماغ عقلی کے پیشے کی طرف کم توجہ دے رہے ہیں - اگر یہ رجحان اسی طرح باقی رہا تو پیشہ گھٹیا - بھدّے - بے بھک - نکمّے اور تنگ نظر لوگوں کا اجارہ بن کر رہ جائے گا -

---

تدریس سائنس

——— انیس الدین انصاری

سائنس کی تدریس کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ میں یہ قابلیت پیدا کر دی جائے کہ ماحول کی مادی اشیا کی ترکیب کو بخوبی سمجھ سکیں اور مادی ماحول میں جو تغیرات پیدا ہوتے رہتے ہیں ان کے اسباب و علل کو اچھی طرح معلوم کر سکیں۔ نیز ان میں یہ خواہش پیدا کر دی جائے کہ وہ اپنے مادی ماحول کو اپنی ضروریات کے مطابق تبدیل کرنا ممکن سمجھیں اور ماحول پر قابو پانے کے لئے پوری جد و جہد کرنے کے عادی بن جائیں۔

متذکرہ بالا مقصد کی تکمیل کے لئے مدرس سائنس کو حسب ذیل امور پیش نظر رکھنا چاہئے۔

۱۔ سائنسی طریقہ فکر سے طلبہ کو واقف کیا جائے۔

۲۔ سائنس کی مربوط معلومات سے طلبہ کو روشناس کیا جائے۔

معلمین سائنس کو یہ حقیقت یاد رکھنا چاہئے کہ بچہ کی فطرت ہے کہ وہ نہایت ہی کم عمری میں گرد و پیش کی اشیاء کا گہرا مطالعہ شروع کر دیتا ہے اور جو روزمرہ کے واقعات رونما ہوتے ہیں ان کے اسباب و وجوہ کے سمجھنے کی لگاتار کوشش کرتا رہتا ہے۔ بچہ کی یہ جستجو اور اشتیاق معلومات اگرچہ اس کی فطری صلاحیتوں پر منحصر ہوتی ہے لیکن ہر بچہ میں اس کا اظہار یقینی ہے اور یہ جستجو اور اشتیاق معلومات والدین اور اساتذہ کی ہمت افزائی پر ترقی کرتی ہے اور موزوں مواقع اور حالات مہیا کرنے پر اس کا اظہار زیادہ سے زیادہ ہو سکتا ہے۔ ہائی اسکول میں سائنس کی تعلیم سے طالب علم میں سائنسی طریقہ فکر کی عادت ڈالی جا سکتی ہے یعنی وہ مشاہدات سے عام اصول قائم کرنے کی کوشش کرے، وہ عام اصول جو نظریہ کی صورت رکھتا ہے مزید جانچ اور تحقیقات کے بعد قانون اور کلیہ کا درجہ حاصل کرے۔ پھر ان سائنسی کلیوں کا استعمال روزمرہ زندگی اور صنعت وغیرہ میں پوری طور پر سمجھ لے۔ اس

طالب علم استقرائی طریقۂ فکر اور استخراجی طریقۂ فکر کا استعمال کرے۔ دوران تدریس سائنس میں تمام مسائل استقرائی طریقۂ فکر سے نہیں پڑھائے جاسکتے ہیں کیونکہ استاد کے لئے وقت محدود ہوتا ہے لیکن اس دشواری کو حسب ذیل تدابیر سے عبور کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ جب کوئی عام کلیہ بیان کیا جائے تو وہ تجربات بھی بیان کر دئے جائیں جن کی بنا پر عام کلیہ قائم کیا گیا ہے۔

۲۔ جماعت کے سب طلبہ سے مختلف تجربات کرائے جائیں تاکہ مختلف تجربات کی روشنی میں عام کلیہ اخذ کیا جائے۔ مثلاً پودوں کے پتوں میں اسٹارچ کی موجودگی کو ظاہر کرنے کے لئے جماعت کے ہر طالب علم کو ایک ہی پودے کے پتے نہ دئے جائیں بلکہ مختلف پودوں کے پتوں پر تجربہ کرنے کے لئے کہا جائے۔ اس طرح جو نتیجہ تمام جماعت کے طلبہ کی مشترکہ کوشش سے حاصل ہوگا وہ طلبہ کے لئے زیادہ واضح ہوگا اور اس نتیجہ کو استقرائی طریقۂ تحقیقات کہا جاسکے گا۔ طلبہ ایسڈ میں کسی دھات کو حل ہوتا ہوا دیکھ کر اگر نتیجہ حاصل کریں کہ تمام ایسڈ تمام دھاتوں کو حل کر لیتے ہیں تو یہ نتیجہ غلط ہوگا اس لئے طلبہ پر واضح کر دیا جائے کہ ایک دو مثالوں سے عام کلیہ اخذ کرنا مناسب نہیں ہے۔

انیسویں صدی میں طبعیات وکیمیا کی معلومات کا استعمال روزمرہ زندگی میں اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ سائنس کی ان دونوں شاخوں کو ہی درس گاہوں میں پڑھایا جاتا تھا لیکن بیسویں صدی میں علم حیات کی تحقیقات سے طرح طرح کی ایجادات ہورہی ہیں جو روزمرہ زندگی میں استعمال ہورہی ہیں اس وجہ سے درسگاہوں میں طبعیات وکیمیا کے ساتھ ساتھ علم نباتات وعلم حیوانات کو بھی داخل کر لیا گیا ہے سائنس کی ان شاخوں کے علاوہ دیگر شاخوں کو بھی جہاں تک ممکن ہو مناسب طریقہ سے شامل کیا جاسکتا ہے لیکن بہر صورت مدرسوں میں وہی معلومات پیش کی جائیں جس کا روزمرہ زندگی میں استعمال ہو رہا ہو۔

طریقۂ تدریس سائنس

طریقۂ تدریس کو طلبہ کی استعداد کے لحاظ سے اختیار کرنا چاہئے مثلاً یہ ثابت کرنے کے لئے کہ پانی

میں دو گیسیں ہوتی ہیں آکسیجن اور ہائیڈروجن کو معمولی استعداد کے طلبہ کے لئے پانی کی بجلی سے برق پاشیدگی کرکے اس معلومات کو سمجھا دیا جائے اور زیادہ ہوشیار طلبہ کے لئے کیلشیم اور میگنیشیم کے ذریعہ پانی کی تشریح کی جا سکتی ہے۔

سائنس کی تدریس میں تجربات کی اہمیت مسلمہ ہے اور جہاں تک ممکن ہو طلبہ خود ہی تجربات کریں تو تدریس کامیاب ہوگی عملی تجربات سے طلبہ کی ذہنی تربیت بھی بہت اچھی طرح ہوتی ہے اور سائنسی طریقۂ فکر کی عادت بھی بخوبی پیدا ہو جاتی ہے۔

عملی تجربات کے لئے تحقیقات یعنی ریسرچ کا ماحول پیدا کیا جائے یعنی حسب ذیل مدارج اختیار کیئے جائیں۔

۱- ہر تجربہ کا مقصد ہونا چاہیئے جو طلبہ پر بخوبی واضح ہو لیکن مقصد تجربہ کے ساتھ ساتھ نتیجۂ تجربہ نہیں معلوم ہونا چاہیئے۔

۲- طلبہ کو خود ہی تجربہ کے لیئے ضروری تدابیر اختیار کرنا چاہیئے اور یہ کہ کس طرح تجربہ کیا جائے اور کیا کیا صورتیں اختیار کی جائیں جہاں تک ممکن ہو۔ طلبہ خود ہی غور کریں۔

۳- تجربہ کی اس قدر تفصیلات مہیا کر دی جائیں کہ طلبہ پوری دلچسپی سے اور خود اعتمادی سے تجربہ کریں۔

۴- جو تجربہ کہ طلبہ خود کریں اس کو مدرس پہلے خود کرکے نہ سمجھائے البتہ ضروری مشکلات کو رفع کرنے کے لئے ضروری ہدایات دے دے۔ تجربہ کے نتیجہ کو پہلے سے بتا دینے سے طالب علم کی جستجو جاتی رہتی ہے اور یہ سائنسی تدریس کو غیر مفید بنا دیتی ہے۔

تجربات عام طور پر ایسے کئے جائیں جو اشیا کے خواص وغیرہ سے متعلق ہوں۔ پیمائش اور اعداد و شمار کے تجربات جہاں تک ممکن ہو کم ہوں تو بہتر ہے طلبہ عموماً حسابی الجھن سے سائنسی تحقیقات کے لطف کو کھو دیتے ہیں۔ عملی تجربات کی خوبی اور اہمیت کے باوجود بہت سے عنوانات ایسے ہونگے کہ استاد کو خود تجربہ کرکے دکھانا ہوگا۔ یہ مظاہراتی طریقہ وقت کو بھی بچاتا ہے اور تعلیمی مصارف کو بھی کم کر دیتا

ہے۔ جب استاد تجربہ کرکے دکھلائے تو بہت باقاعدگی اور مناسب ترتیب سے کام کرے اور اس قسم کے تجربات میں بھی تجربہ کا نتیجہ پہلے سے نہ بیان کردے۔

مدرس وہ تجربات خود کرے جن میں قیمتی آلات کا استعمال ہو اور جو خطرناک ہوں یا جن کے عمل کرنے پر اس قدر مہارت کی ضرورت ہو جو عام طلبہ کے لئے مشکل ہو۔ سائنس کی مختلف اہم تحقیقات اور نظریئے وہ سائنسی اصول جو صنعت وحرفت وزراعت وغیرہ میں استعمال ہو رہے ہیں مدرس سائنس اپنی تدریسی تقریر میں بیان کرسکتا ہے۔

علم حیات کی تدریس میں جو تجربات کئے گئے ہیں ان کو بیان کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو طلبہ کے سامنے کرکے دکھلائے جائیں اور بعض تجربات طلبہ کو خود کرنے کے لئے کہا جائے علم حیات کی معلومات میں نباتات وحیوانات کی زندگی میں مشابہت کو واضح کیا جائے۔ اور ایک دوسرے کا گہرا تعلق اور ایک کا انحصار دوسرے پر ظاہر کیا جائے انسان کی زندگی سے مقابلہ کیا جائے۔ اور انسان کی زندگی کی کیفیت واضح کرنے میں علم الاعضاء اور علم صحت کی معلومات پوری پوری دی جائے۔

سائنس کے اصولوں کا استعمال روزمرہ زندگی میں بخوبی واضح کیا جائے اور تدریس سائنس میں اس پہلو کو پوری اہمیت دینا چاہئے۔

حسابی سوالات کو کم سے کم استعمال کیا جائے گو ان کی مدد سے سائنس کے اصولوں کی پوری وضاحت ہوتی ہے لیکن ان حسابی کلیوں کو حسابی سوالات کی مشق کے طور پر استعمال نہ کیا جائے۔

تجربات لکھنے کی اہمیت | طلبہ میں یہ قابلیت پیدا کرنا کہ وہ اپنے تجربات کو صاف الفاظ میں ضبط تحریر میں لاسکیں ایک نہایت ہی اچھی ذہنی تربیت ہے۔ اظہار خیالات کے لئے زبانی اور تحریری دونوں قوتیں ضروری ہوتی ہیں۔ مدرس سائنس کو ہر دو قوتوں کی تربیت کا خیال اپنی تدریس میں رکھنا چاہئے۔

تجربات کے متعلق حسب ذیل ریکارڈ ضروری ہے۔

۱۔ کیا کیا عمل کئے۔

۲۔ کیا کیا مشاہدات کئے۔

۴۔ کیا کیا نتائج حاصل ہوئے۔

عمل اور مشاہدات ساتھ ساتھ لکھے جائیں اور نتائج کو آخر میں اخذ کیا جا سکتا ہے۔

بعض مدرسین تجربات کو اپنے الفاظ میں لکھواتے ہیں۔ یہ طریقہ مناسب نہیں ہے ابتدا میں بطور رہنمائی کے لکھوا سکتے ہیں لیکن اس طریقہ کو عادتاً اختیار نہ کرنا چاہیئے۔

تدریس سائنس میں چارٹ و ماڈل | سائنس کے اسباق میں چارٹ و ماڈل کا استعمال ضروری ہے اور خصوصاً ایسے سبقوں میں جن میں اصلی چیزیں مہیا نہیں کی جا سکتی ہیں۔ فلم سٹرپ کا استعمال بھی مفید ثابت ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ سائنس کی معلومات کی فلم بھی تیار کی گئی ہیں جن کا استعمال مفید ثابت ہوتا ہے ان اشیا کو محض امدادی طور پر استعمال کیا جائے۔ اور مدرس کو اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ یہ امدادی اشیا مناسب موقع پر ہی استعمال کی جائیں۔ اور ان کے استعمال میں زیادہ وقت صرف نہ کیا جائے۔ ان اشیا کے علاوہ طلبہ کی استطاعت کے مطابق سائنس لائبریری کا استعمال بھی سائنس سے دلچسپی پیدا کرنے میں مفید ثابت ہوتا ہے۔ سائنسی دلچسپی کے مقامات کا تعلیمی معائنہ مثلاً کارخانوں وغیرہ کا مشاہدہ بھی ضروری ہے ان مقامات کے معائنہ کے بعد اُن پر ضروری گفتگو بھی معلومات کے اضافہ میں مدد دیتی ہے۔ عجائب خانوں کی سیر بھی سائنسی معلومات کے لئے مناسب ہے۔ ریڈیو کی تقاریر جو سائنس سے متعلق ہو مدرسوں میں سننے کا انتظام کرنا چاہیئے طلبہ سے سائنسی اشیاء کے ماڈل۔ وائرلیس سیٹ۔ مچھلیوں کے حوض اور دیگر سائنسی تفریحی مشاغل کا انتظام کرایا جائے۔

نصاب

سائنس کی تدریس میں ماحول کا لحاظ ضرور رکھنا چاہیئے۔ قریبی کارخانہ کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنے کی کوشش ضروری ہے۔ اگرچہ ذیل میں سائنس کی مختلف شاخوں کا نصاب جداگانہ درج کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک ممکن ہے کسی ایک عنوان کو لے کر مختلف شاخوں کی معلومات ایک ساتھ پڑھائی جا سکتی ہے۔ مثلاً پانی کے بیان میں طبعیات۔ کیمیا اور علم حیوانات کو ساتھ ساتھ لیا جا سکتا ہے۔

[illegible] حالت کی وجہ سے ٹھوس۔ مایع وگیس کا پھیلاؤ۔ صرف غیر پیمائشی معلومات مہیا کی جائے
[illegible] کے پھیلاؤ کی استثنائی مثال حرارت سے اشیا کی حالت کی تبدیلی۔ حرارت مخفی کا ابتدائی تصور تجربات
[illegible] مقدار حرارت اور تپش کا فرق واضح ہو۔ مختلف اشیاء کی صلاحیت حرارت۔ حرارت کی اکائی۔ انتقال
حرارت کے مختلف طریقے۔ حل کرنا۔ قلماؤ۔ کشید تبخیر کی شرطیں۔ کثافت معلوم کرنے کا سادہ طریقہ۔ مایع و
گیس کا دباؤ۔ بادپیما فارٹن وایٹ رانڈ۔ ارشمیدس کا اصول اور اشیا کا تیرنا۔ آب پیما کشش ایاسیب قسری۔
بیرم۔ رگڑ۔ مشین (بیرم)

مقناطیس۔ قطب نما۔ مقناطیسی امالہ۔ سادہ وخشک خانے۔ اکولمیٹر کی حفاظت واستعمال۔ برقی رو
کے گرم کرنے مقناطیسی اور کیمیائی عمل کے اثرات برقی رو۔ پوٹینشل کا فرق۔ مزاحمت اور ان تینوں کے
حسابی سوالات خانوں کا انتظام اور مزاحمت۔ برقی مقناطیس۔ برقی گھنٹی۔ برقی موٹر۔ جیسے ریٹر
(GENERATOR) سادہ گھر میں بجلی کا انتظام۔ گھریلو بجلی کی اشیا کے استعمال سے بجلی کے خرچ
کی پیمائش وضروری مصارف کا اندازہ۔

نور کا خط مستقیم میں پھیلاؤ۔ سائے۔ پن ہول کیمرا کلیات انعکاس۔ انعطاف بلا حسابی پیمائش
کے۔ محدب ومقعر عدسے۔ اور متوازی شعاعوں کے اثرات۔ آنکھ اور اس کی ساخت کی توضیح۔
آواز کی پیدائش اور انتقال۔ آواز بازگشت۔ آواز کی رفتار آواز کی پیدائش اور تاروں کے تجربات

کیمیا | کیمیائی تبدیلی۔ عناصر۔ مرکب۔ آمیزے۔ ایٹم اور مالیکیول۔ ہوا کا سرسری مطالعہ ہوا
کی ترکیب۔ جلنا اور زنگ لگنا۔

آکسیجن۔ آکسائڈز۔ ایسڈ اور بیس۔ تعدیل۔ پانی کی ترکیب۔ تشریح اور ترکیب۔ ہائیڈروجن
کول گیس۔

کیلشیم اور سوڈیم کے کاربونیٹ اور بائی کاربونیٹ کا اوصافی مطالعہ۔
کاربن ڈائی آکسائڈ۔ ہلکا اور بھاری پانی۔ آٹے کا خمیر۔

علم حیات | ایک پھول کے پودے کا مطالعہ۔ اس کی ساخت کا مطالعہ محدب عدسہ سے

ذریعہ- اور اُس کے اجزا کا کام -

ایک دودھ دینے والے چوپایہ کا مطالعہ - خرگوش اور انسان کا مقابلہ ہڈیاں - جوڑ عضواتی حرکات - اہم اعضا کی ساخت و کام کی وضاحت - نظام اعصابی -

پانی کی اہمیت نباتات وحیوانات کی زندگی میں - غذا تنفس - اور افزائش نسل نباتات وحیوانات میں - پھولوں اور پھلوں کا منتشر ہونا اور افزائش نسل - بیج اور حیات نو حسب ذیل کی سوانح حیات :-

۱- پروٹوزون ۲- کیچوا ۳- تتلی ۴- گھریلو مکھی - ۵- مچھلی ۶- مینڈک ۷- پرند

ہر موسم میں کھلے میدانوں میں مشاہدات -

نصاب کے متعلق عام ہدایات | ۱- طبیعیات کثافت کے تجربات اور حسابی سوالات کو اہمیت نہ دی جائے - مایعات کے خواص کے سلسلہ میں دباؤ اور قوت کے فرق کے تصورات کی طرف خاص توجہ دی جائے -

غذا اور ایندھن کے استعمال کے سلسلہ میں مقدار حرارت کی ناپ کے چند آسان سوالات کی طرف خاص توجہ دی جائے -

علم میکانیات کے سلسلہ میں اصلی آلات کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اصولوں کی وضاحت کی جائے برق کے مطالعہ میں ایمیٹر (AMMETERS) اور وولٹ میٹر (VOLT METER) کا استعمال زیادہ سے زیادہ کیا جائے -

بجلی کی روزانہ استعمال کی اشیا کی مرمت کی طرف خاص توجہ دی جائے -

۲- کیمیا سادہ سے ایٹم کے تصور کی پوری وضاحت ضروری ہے کیمیائی فارمولے اور کیمیائی مساوات کی معلومات کسی حد تک مہیا کرنا بہتر ہے خصوصاً سمجھدار طلبہ کو یہ معلومات ضرور دی جائیں --

۳- علم حیات — اس کے مطالعہ میں موسمی معلومات ضروری ہے - موسم کے لحاظ سے اس کی تدریس میں پہلے سے تعلیمی اسکیم بنانا بہت ہی لازمی ہے - چارٹ ماڈل کے مقابلہ میں اصلی اشیا کا استعمال قدرتی فضا میں کیا جائے پودوں یا حیوانات کے متعلق طویل معلومات تحریر کرنے کے مقابلہ میں دیر تک غور سے اصلی چیزوں

[illegible] بہ زیادہ مفید ہے۔

[illegible] کو کافی اہمیت دینا چاہیئے اور طلبہ اپنے دوران خون کی حرکتوں کو ناپیں اور اپنے سانس لینے کے تجربات کریں۔

علم حیات کے مطالعہ میں کھُلے میدان کا مشاہدہ بے حد ضروری ہے۔

تدریس سائنس اور ذہنی کمزور بچے

سائنس کی تدریس میں بچوں کی ذہنی حالت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ ایسے بچے جو ذہنی اعتبار سے پست ہوں خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ ایسے بچوں کے لئے حسب ذیل تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے:۔

۱۔ ایسے بچے سائنس میں دلچسپی لینے لگتے ہیں اگر اشیا کا مشاہدہ کرایا جائے بجائے زبانی تدریس کے یا کتابی درس کے۔

۲۔ اگر ایسے طلبہ کو پھول پھل کے مطالعہ کی طرف متوجہ کیا جائے تو وہ گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح حیوانات کی عادات وغیرہ کے متعلق معلومات میں دلچسپی لیتے ہیں۔ بشرطیکہ حقیقی حالات کے مشاہدہ کے مواقعے دئے جائیں۔

۳۔ ایسے بچوں میں اظہار خیالات کی بھی دشواری ہوتی ہے اس لئے اگر تقریر یا تحریر میں وہ کمزور پائے جائیں تو اُن سے ہمدردانہ برتاؤ کرنا چاہیئے اور اُن کے بیان کی کمزوریاں یا تحریر کی دشواریوں پر خفگی کا اظہار نہ کیا جائے۔

۴۔ روزمرہ کے استعمال کی اشیاء مثلاً ٹارچ وغیرہ یا پانی کا نل یا گرد و پیش کی نباتات و حیوانات کی معلومات حاصل کرنے پر اکتفا کرنا چاہیئے۔

مدرسین کو اس کا خاص خیال رکھنا چاہیئے کہ سائنس کی تدریس سے طلبہ کو فرحت حاصل ہونا چاہیئے اور معلومات حاصل کر کے وہ اطمینان اور فخر محسوس کریں۔

تعلّم بالعمل کے اغراض و مقاصد

نذیر احمد شیخ

تعلیم کا حقیقی مقصد طالب علم کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کو بروئے کار لانا۔ اس کی فطرتی استعداد کو ابھارنا اور اس کے جسم، روح اور دل و دماغ کی یکساں تربیت کرنا ہے۔ پڑھ لکھ لینا محض تعلیم کا آغاز ہے۔ یہ ان ذرائع میں سے ایک ہے جن سے انسان تعلیم یافتہ بن سکتا ہے۔ یہ خود کوئی تعلیم نہیں۔ حقیقی تعلیم کا راز تخلیقی کام میں مضمر ہے۔ اس میں دل دماغ اور روح کی انتہائی تسکین پنہاں ہے۔ تخلیقی کام عملی کام کا دوسرا نام ہے جو دراصل اصل فطرت کا ترجمان ہے۔ اس طرزِ تعلّم کی ابتدا معلوم کرنے کے لیے ہمیں زمانہ سلف کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ انسانی زندگی کے ابتدائی دور کے بچے اسی عمل پر تحصیل علم کرتے تھے۔ اعلیٰ طبقہ کے شرفا میں یہی طریق تعلیم مروّج تھا لیکن زمانہ مابعد میں معلّموں اور منطقیوں نے بچوں کی تعلیم کو روزمرہ کی زندگی سے علیحدہ کر کے ابتدائی تعلیم میں تناقض پیدا کر دیا۔ اور ان کا زور اس حد تک بڑھا کہ سقراط جیسے ذی شان مفکروں کی آواز ان کے سامنے بے اثر ہو کر رہ گئی۔ اس زمانہ کے معلّم اس ذکاوت اور فہمیدگی کے مالک نہیں تھے جو سقراط کو ودیعت کی گئی تھی۔ وہ تعلیم اور زندگی میں رشتۂ یگانگت کے اصول کو نہیں سمجھتے تھے آخر احیائے علوم کے زمانہ میں ماںٹین اور مارٹن لوتھر کی تشریحات اور دلائل نے عوام میں مروّجہ طریق تعلیم کے خلاف ایک قوی احساس پیدا کر دیا۔ تعلیم کو عملی زندگی کے قریب لانے اور ان میں وحدت و اتحاد کا رشتہ پیدا کرنے میں روسو سب کا پیشرو ہے۔

روسو عالمِ طفولیت کا حقیقی راز دان تھا۔ اس نے بچپن کی حقیقت سے عوام کو روشناس کرایا۔ یہ ۱۷۱۲ء میں جنـ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی زندگی محنت شاقہ میں گذری یعنی ۱۷۴۲ء میں پیرس کا رخ کیا۔ جہاں کچھ عرصہ کے بعد اس کا مؤید ما سے تعلق پیدا ہو گیا۔ اسی کے زیر اثر اس نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۷۶۲ء میں اس کا شاہکار ایمیل د کا ترجمہ آموزش کے متعدد شماروں میں آچکا ہے، ظہور پذیر ہوا۔ اس کے قصص مضمون کا روایات فرانس کے ساتھ اس تـ

خاطر اسے بامرِ مجبوری فرانس کو کچھ عرصہ کے لیے خیرباد کہنا پڑا۔ تاریخِ فرانس میں یہ شاہکار سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے اُس فکرِ جدید کی بنیاد رکھی جس نے فرانس کی تمدنی۔ ثقافتی۔ سیاسی اور سماجی زندگی کی کایا پلٹ دی ۱۷۸۹ء انقلابِ عظیم اسی معرکۃ الآرا تصنیف کے دُوررس نتائج میں سے تھا

روسو کے ذیل کے اقتباسات جو ایمیل سے ماخوذ ہیں تعلّم بالعمل کے اغراض و مقاصد پر گہری روشنی ڈالتے ہیں "قدرت کا منشا ہے کہ بچے جوان ہونے سے پہلے بچے ہی رہیں۔ اس اصول کی خلاف ورزی کا نتیجہ ایک ایسا بے موسمی پھل ہوگا۔ جو نہ ٹھیک پکا ہوگا اور نہ لذیذ"۔ یہ اصول ہماری ابتدائی تعلیم کا صحیح نصب العین ہے۔ بچہ کو بچہ سمجھنا اور اس کی جبلّت و فطرت کے مطابق اس کے ساتھ سلوک کرنا عین دانشمندی ہے جن بچوں کی تربیت ان کی فطرت کے مطابق ہوگی وہ حقیقتاً خوش باش۔ بے فکر و آزاد۔ شاداں و خنداں۔ مہذب و شائستہ۔ چاق و چوبند ہوں گے۔ معصوم بچہ کے دماغ میں ایسی معلومات اور تعلیمات کا ٹھونسنا جس کے سمجھنے سے اس کا نوزائیدہ ادراک قاصر ہے گاڑی کے آگے گھوڑا جوتنے کے مترادف ہے۔ بچہ ابھی اس تیار شدہ مواد کو قبول کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا بالجبر اس سے طوطے کی طرح رٹایا جاتا ہے اور اسے اُس راہ پر گامزن ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے جس پر چل کر اسے اپنی باطنی قوتوں کے اظہار کا موقع نہیں ملتا وہ اپنے حقیقی روپ میں نکھار نہیں ہو سکتا۔ جبرِ استاد کے نیچے دب جاتا ہے۔ اصولاً اس کی جبلّی رغبتوں کی صرف اس وقت مخالفت کی جائے جب وہ کسی غلط یا مضرت رساں سمت کا رخ کریں۔ قدرت کا منشا یہ ہے کہ بچہ ایک پودے کی طرح نشوونما پائے اور اپنی ضروریات کے مطابق وقت لے۔ اکمل و اعلیٰ تعلیم میں سب سے اہم اور سود مند اصول وقت کو بچانا نہیں اس کا صرف کرنا ہے۔ بے صبری کم فہمی اور کوتاہ نگاہی کا ثبوت ہے۔ ہمارا علم نہیں جانتا کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنابندی۔ بمرورِ ایام بچہ خود بخود سیکھتا چلا جاتا ہے۔ اسے سکھایا نہیں جاتا۔ محض رہنمائی کی جاتی ہے۔ بتائی ہوئی باتیں بھول جاتی ہیں خود اکتساب کردہ حقائق منقش ہو جاتے ہیں۔ ہر بچے کا اپنا طریقِ کار ہوتا ہے۔ بڑی بے انصافی ہوگی اگر ہم اس کے فطرتی جذبات کے سرچشمے مسدود کر دیں جس طرح وہ آنِ واحد میں قد آور جوان نہیں بن سکتا اسی طرح وہ پلک جھپکنے میں پختہ کار اور صائب الرائے نہیں ہو سکتا۔

۲۔ "تمام طریقہ ہائے تعلیم آزمائے گئے ہیں سوائے ایک کے جہاں کامیابی کی امید باقی ہے۔ وہ ہے باضابطہ اور مترتب آزادی کا طریقہ" یہ اصول پہلے اصول سے ماخوذ ہے۔ یہاں بچے کی آزادی پر دو قیود عائد کر دی گئی ہیں۔ ا۔ ضابطہ و ترتیب

قبل اذکہ بچے کو استاد کی رہنمائی کا محتاج گردانتی ہے۔ مبادا اُس کے قوائے عقلی اور افعالِ جسمانی نامسعود روش اختیار کریں معلّم ایک راعی ہے جو اپنے ریوڑ کو نامسعود راہوں سے مامون و مصئون رکھنے کا ضامن ہے۔ راہِ مستقیم پر لانا اور چلانا اسی کا کام ہے۔ اس راہ پر استوار رہنا طالب علم کو اپنی قسمت اور ہمت۔ دوسرا جزو طالب علم کی منزل بمنزل ترقی پر استدلال کرتا ہے۔ تعلّم کا سلسلہ تعمیرِ دیوار کے مشابہ ہے۔ جس میں ضابطہ اور تنظیم دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ابتدا سے ایک نظام کے تحت چلنا ضروری ہے۔

خشتِ اول گر نہد معمار کج تا ثریا مے رسد دیوار کج

شروع میں ذرا سی کوتاہی زندگی بھر کی تباہی کا باعث بن سکتی ہے لہذا آزادی سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ بچہ کو اس کے توہمات پر چھوڑ دیا جائے۔ آزادی اپنے ساتھ ذمہ داریوں کے بھاری بوجھ لاتی ہے۔ طالب علم کو روزِ اول سے ضابطہ کی ضرورت ہے جو دو طرح سے عائد ہو سکتا ہے

۱۔ باطنی (ذاتی)، ۲۔ خارجی (عائد کردہ)

معصوم بچہ کے لیئے ذاتی ضابطہ کے تحت اپنے آپ کو محکوم کرنا مشکل ہی نہیں محال ہے۔ کیونکہ ابھی اس میں سرے سے اس جذبے کا ہی فقدان ہے۔ لہذا اُسے مشفق راہبر کی دستگیری کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ ایک دوربین راہبر کی تجابی نگاہ بچے کی پرواز کا فوراً جائزہ لے لیتی ہے اس کی چشمِ بینا دیکھتی ہے کہ "آہستہ روی" (GO SLOW) بہترین طریقِ کار ہے۔ تعمیرِ روم کے لیئے ایک مدت چاہیئے اسی طرح بچہ کے افہام و تفہیم کے ملکہ کے ارتقا کے لیے وقت درکار ہے بے اعتنائی سے ان ٹھوس حقائق کا جو اس کے حدِ ادراک سے بالاتر ہیں اُس معصوم کے حلق میں ٹھونسنا بڑی بے انصافی ہے۔

۳۔ "اپنے شاگرد کے ذوقِ جستجو کو نشو و نما دینے کے لیے بیک وقت اسے سب کچھ بتا دینا کج فکری اور کوتاہ نگاہی ہے اسے خود آگاہ نہ کرو۔ بلکہ آگاہ ہونے دو"

مدرسہ عمل کا یہ تدریسی اصول نئے دور کے معلّم کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اخذ شدہ نتائج اور تیار کردہ مواد مردہ خیالات کے پیش کرنے کے مترادف ہے ان کا تعلق اندرونی قوتوں سے نہیں ہوتا اس لیئے وہ انسانی شخصیت کا توازن برباد کر دیتے ہیں۔ طالب علم کے ذوقِ تجسس کو حرکت میں نہ لانا استاد کی بڑی ناکامی ہے استخراجی کے مقابلہ میں استقرائی طرزِ تعلّم معلّم

کتابوں کو رٹنے ۔ اخراجِ عرق کا راستہ ایک لمبی راہ ہے جس کے پیچھے وقت اور قوت درکار ہے ۔ یہ بڑی حوصلہ فرسا اور صبر آزما منزل ہے ۔ مگر اس منزل میں سست رفتاری راہرو کی کامیابی پر دلالت کرتی ہے ۔ جس مراد کا اکتساب طالب علم اس راہ پر چل کر کریگا ۔ وہ اُس کا عمر بھر کا مونس و ہمدم ہوگا ۔ بتائی ہوئی باتیں بھول جاتی ہیں ۔ سیکھی ہوئی باتیں اپنائی جاتی ہیں جن کا خزینہ تجویف دماغ ہے طاقِ نسیاں نہیں ۔ یہاں استاد کی پوزیشن دہندہ کی نہیں رہتی اور نہ شاگرد کی محض یابندہ کی ۔ دونوں اس تعلیم و تعلّم کے سلسلہ میں برابر کے شریک ہوتے ہیں استاد کا مطمح نظر خشک معلومات کا پیش کرنا نہیں رہتا بلکہ اپنے طالب علموں کی ذہانتِ خداداد کو متحرک کرنا ۔ وہ اپنے جسم کو متحرک ۔ اپنے اعضاء کو اپنا تابع اور اپنے ہاتھوں کو مصروفِ کار رکھنا سیکھتے ہیں ۔ روسو ایمیل کے متعلق کہتا ہے ۔ " وہ واقفیت میں نہیں ، واقفیت حاصل کرنے میں یدِ طولےٰ رکھتا ہے ۔ اگرچہ وسیع استعداد کا مالک نہیں لیکن بڑھنے کی بااحسن وجوہ استعداد رکھتا ہے ۔ حقیقی مدرس کا کام آگاہی دینا نہیں ۔ بلکہ حصولِ آگاہی کا طریق بتانا ۔ ان کے سامنے پکا پکایا مواد رکھ کر تقلید کا عادی بنانا اسے سریع الاعتقاد بے وقوف بنانا ہے موجودہ سکولوں اور کالجوں میں بچوں کی لاپرواہی اور بے توجہی کی محض وجہ یہ ہے کہ اساتذہ ان کے قوائے عقلی و جسمانی کو متحرک نہیں کرتے

۴۔ "پیشتر اس کے کہ بچہ آلات کو استعمال میں لائے میں چاہتا ہوں کہ وہ انہیں ایجاد کرے "

مدرسہ عمل کا یہ ایسا اصول زرّیں ہے جو طالب علم کو ذہنی غلامی اور دماغی افلاس سے نجات دلاتا ہے ۔ خیالات کے باہمی تعلقات اور ایجادی آلات کے آغاز و انتہا سے روشناس کراتا ہے اِس سے اُس میں کیوں اور کیسے ، کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اُس کے جذبہ تجسّس کو تحریک ہوتی ہے ۔ چیزوں کی ماہیت کو سمجھنے اور ان کی حقیقت کی ٹوہ لگانے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے اور یہی حقیقی علم کی جان ہے ۔ حقیقی مدرس کا کام بچے کو یہ بتانا نہیں کہ تم فلاں راہ اختیار کرو ۔ اپنی راہ وروش کے اختیار کرنے کا کلی اختیار اسے حاصل ہے ۔ بچے کو اپنے میلانِ طبع کے مطابق اپنی زندگی کی راہیں ایجاد کرنے دینا کلیدِ کامرانی ہے معلم کا کام اِس راہ میں آسائشیں بہم پہنچانا اور اس کی جبلی صلاحیتوں کی بطریقِ احسن تربیت کرنا ہے ۔

۵۔ "ہر ایک مجلسی انسان کے لیے کام کرنا فرضِ اوّلین ہے ۔ نکما شہری مفید رکن نہیں ۔ انسان کو قدرت کے قریب لانے کے لیے دستی کام اشد ضروری ہے ۔ دستکاری سے عزت کی زندگی بسر نہیں کرتا ایمیل کے لیے ایک ہی نصیحت ہے ۔ " کوئی ہنر سیکھو " ۔

روسو ایمیل کو ایسا درجہ دینا چاہتا ہے جو چھینا نہیں جا سکتا جس سے اس کا وقار ہمیشہ برقرار رہے گا۔ یہ درجہ
شہزادوں اور نوابوں سے بلند و بالا ہے۔ یہ حقیقی انسانیت کا درجہ ہے روسو عملی تعقل پیدا کرنا چاہتا ہے۔ صنعت و
حرفت کی تعلیم حقیقت میں محنت مزدوری کی عظمت (Dignity of Labour) کا مظہر ہے۔ اس ضمن
میں ٹیگور کے تاثرات رابنسن کروسو (Robinson Crusoe) کی داستان کا مطالعہ کرنے پر قابلِ غور ہیں
"جب کبھی میں ایسے ادارے کا خیال کرتا ہوں جس میں انسان اور قدرت کی ہم آہنگی کا سبق عملی تعاون سے حاصل ہو تو
میرے سامنے رابنسن کروسو کا وہ جزیرہ آجاتا ہے۔ جہاں بنی بنائی چیزیں موجود نہیں اور جہاں ذاتی قوتوں اور خداداد
صلاحیتوں کو پیہم استعمال میں لانا پڑتا ہے۔ یہ تخلیقی زندگی ہے یہاں تخلیقی اور تعمیری قوتوں کو جسم و روح کے سدھار کے لیئے لگایا
جاتا ہے۔ یہاں قربانی، محنت اور بے لوث خدمت کے مواقع حاصل ہیں"۔ ڈاکٹر فیریر اپنی معروف کتاب (Activity
School) میں تعلّم بالعمل کے حقیقی مقصد کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں "مدرسۂ عمل کا کام فرد کی مفید اور تعمیری قوتوں
کی حفاظت اور تکمیل ہے۔ تاکہ اسے مکمل اور ذمہ دار شخصیت بنایا جا سکے۔ ایسی متوازن شخصیت کی تعمیر کی جائے جو خود پرستی
سے دور، اتحاد کی فطری حس کی متحمل ہو۔ جو دنیا میں انصاف اور امن کے لیے فعال کارکن بن سکے۔ موجودہ یورپی طرزِ تعلیم خود پسندانہ
مقابلے کی روح پیدا کرتا ہے۔ اس سے جارحانہ طبیعت ظہور پذیر ہوتی ہے۔ بے لوث خدمت اور مجلسی بہبود کا جذبہ مفقود
ہے۔ ان قیمتی جذبات کا حصول اسی مدرسہ میں ممکن ہے جہاں بچے باغبانی۔ زراعت۔ نجاری۔ مصوری۔ سنگ تراشی۔
فوٹوگرافی وغیرہ کے اعمال سے تحصیل علم کرتے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ مشکل کے وقت ہاتھ بٹاتے
ہیں۔ نظام و تربیت کے ساتھ عملی رشتہ پیدا کرتے ہیں۔ محنت کی قدر و قیمت سے آگہی پاتے ہیں"۔ کروسو اور مین فرائی ڈے
(Man Friday) فعال زندگی کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں اُن کا جذبہ عملی زندگی کی بہترین آماجگاہ ہے

مدرسہ عمل میں اخلاقی تربیت

تعاون، ہمدردی، الفت اُس کے زرّیں اصول مدرسہ عمل کا طرۂ امتیاز ہیں۔ کروسو کا تند و تیز طوفانوں کا خندہ پیشانی سے
مقابلہ کرنا مین فرائی ڈے کی بے لوث خدمات۔ زندگی کی ہر چیز کا خود تخلیق کرنا مدرسۂ عمل کے قیمتی جواہر پارے ہیں۔ فیریر
کا خیال ہے کہ تعلّم بالعمل روح کی غذا پہنچا دیتا ہے۔ جو بچے کے رجحانات کی تشخیص اور پرورش کے لیئے ضروری ہے۔ تعلیم
کا قدیم نصب العین قابلِ تقلید تھا۔ "ایسے شہری پیدا کیئے جائیں جو خدمتِ خلق کی خاطر اپنی انا بالکل فنا کر دیں۔ انا اس

[illegible] جب تک انسان خود فنا نہ ہو جائے۔ یہ نصب العین صرف اسی مدرسہ میں قابلِ حصول ہے جہاں بچوں کو اپنے آپ پر چھوڑ دیا جائے۔ انہیں اپنا بھلا برا خود نبھانے دیا جائے۔ ناکامیوں سے دوچار ہوں۔ شکستِ آرزو سے واقف اور عملی زندگی کے مایۂ ناز فنکار۔

اس کا مایۂ ناز شاگرد Festalozzi تھا۔ جس نے Yverdon Institute میں اپنا تعلیمی نصب العین تیار کیا تھا۔ جولین اس درسگاہ کے متعلق کہتا ہے "یہاں پند و نصائح کے لیے گنجائش نہیں۔ بچے ماں باپ کی طرح محبت کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو اپنا حقیقی بھائی سمجھتے ہیں۔ مقابلہ جو بسا اوقات ہزاروں برائیوں کا پیش خیمہ بن جاتا ہے بالکل عنقا ہے۔ وہ روحانی تسکین اور خوشی کے لیے بھلے کام کرتے ہیں۔ اپنی پرورش خود کرتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو تعلیم دیتے ہیں۔ وہ اپنے علم کی بنیاد اپنی بنائی ہوئی چیزوں پر رکھتے ہیں۔ وہ واقفیت ہی حاصل نہیں کرتے بلکہ دریافت بھی کرتے ہیں۔ مصروفِ کار رہ کر مصرفیت سے محفوظ ہوتے ہیں" بیکن کہتا ہے "کوئی شخص صحیح اور بنیادی طور پر ایسی کوئی واقفیت نہیں رکھتا جسے اس نے خود تخلیق نہ کیا ہو"۔ مدرسۂ عمل کے بچے بیکن کے اصول کو خوب سمجھتے ہیں۔ دراصل درسگاہ میں معلّم کو وہی درجہ حاصل ہے جو اس نے اپنی محبت اور بچوں کے اعتماد سے حاصل کیا ہے"۔

انجیل کا قول ہے "جب تک دوبارہ جنم نہ لو بہشت کی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتے" یعنی جب تک خود پرستی۔ خود بینی۔ خودستائی اور خود غرضی کو خیرباد نہ کہہ دو اس وقت تک وہ بادشاہت حاصل نہیں ہو سکتی۔ مدرسۂ عمل میں باہمی تعاون کے قیمتی درس ان مصائب کی جڑ کاٹ دیتے ہیں

خلاصہ مقصد

مدرسۂ عمل میں اکتساب علم بذریعہ کتب نہیں بذریعہ عمل ہے۔ کتب کا استعمال بہت شاذ ہے۔ بچہ خود اپنی کتاب آپ ہے۔ وہ پڑھنے کی بجائے عمل اور معلومات کی بجائے ایجادات کے حصول کا طالب ہے۔ فطرت اس کے لیے کتاب بھی ہے اور موادِ تعلیم بھی

بچے تدریجی طور پر بڑھتے ہیں۔ ہر دوسرے قدم کی بنیاد پہلے پر رکھی جاتی ہے۔ صنعتی جذبہ سے سرشار کیا جاتا ہے یہ فوراً پھیل کر علم کی تمام شاخوں میں جاری و ساری ہو جاتا ہے۔

یہ ادارہ گھریلو فضا کا نمونہ ہے جس کے افراد میں باہمی الفت و اتحاد ہے جو ایک دوسرے کی مدد کے لیے ہر

وقت تیار رہتے ہیں ۔ بچے اپنا بستر ۔ لباس ۔ کمرہ ۔ کھیل کی چیزیں ۔ باغیچہ ۔ قطعۂ زمین صاف ستھرا رکھتے ہیں ۔ یہ صنعتی
روح پر مفید ایجاد کی سنگ بنیاد ہے ۔ اس ادارے کی طالبات اپنے کپڑے آپ سیتی ہیں ۔ متفرق دستی کام کرتی
ہیں ۔ اس ادارے کا مقصد صنعتی تعلیم دینا نہیں صنعتی روح پیدا کرنا ہے جس کا مقصد انفرادی قوتوں کی تکمیل ہے
اس سے ہاتھوں میں چستی اور آنکھوں میں تیزی ظہور پذیر ہوتی ہے ۔ اور یہی مدرسہ کا حقیقی منصب ہے ۔

ایمیل

یا روسو کی تعلیم

مسلسل ۱۱

اطاعت وفرمانبرداری

اپنے طالب علم کو جب آپ فرائض فرمانبرداری (اطاعت) کا سبق تلقین فرمانے کی سعی کرتے ہیں تو آپ اس تلقین میں ؟ وعید بلکہ ان سے بھی زیادہ ذلیل خوشامد اور رشوت جیسی برائیوں تک کو شامل کر دیتے ہیں۔ خودغرضی کی خاطر یا بخوف جبر طالب علم دلائل سے مطمئن ہو جانے کا بہانہ بنا دیتا ہے۔ وہ بغور یہ سمجھ جاتا ہے کہ اطاعت ہی میں اس کا فائدہ ہے اور نافرمانی میں نقصان اور کیونکہ دوسروں کی مرضی پر عمل کرنا ہمیشہ ناگوار ہوتا ہے اور آپ اس سے ناگوار امور ہی کا مطالبہ کرتے ہیں اس لیے وہ آپ کی نظروں سے پوشیدہ رہنے لگتا ہے۔ تاکہ وہ اپنی ذاتی مرضی کے مطابق اس خیال کے تحت عمل کر سکے کہ اس کی کوئی حرکت بھی جب تک کہ کوئی دوسرا نہ دیکھے نازیبا اور ناجائز نہیں ہو سکتی ہے اور کہیں کوئی دیکھ لیتا ہے تو اس خوف سے کہ کوئی اور آفت نہ آجائے وہ اپنے ناجائز فعل یا قصور کا فوراً اعتراف کر لیتا ہے۔ فرائض کی ذمہ داری کو سمجھنا بلحاظ عمر اس کی عقل کے باہر ہوتا ہے اور اس دنیا میں تو ایسا کوئی شخص ہے نہیں جو اسے حقیقی طور پر اس سے آگاہ کر سکے۔ لیکن سزا کا خوف معافی کی امید اور لگاتار سوالوں کی بوچھاڑ اور ان کے جواب دینے کی دشواری کے باعث آپ جتنے قصوروں کا چاہیں اس سے اعتراف کرا سکتے ہیں۔ الغرض اسے اس طرح تنگ اور پریشان کر کے یا خوف دلا کر آپ اس مغالطہ میں پڑ جاتے ہیں کہ گویا آپ نے اس کو قائل معقول کر دیا ہے

تحویف، تحریص اور جبر کا اثر

اس سب کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ اولاً اس پر ایک فرض جس کے سمجھنے سے وہ قاصر ہے عائد کر کے اس کو بجبر اپنا مطیع بنا لینے سے آپ خود اس کو متنفر کر کے اس کی محبت کو مٹا دیتے ہیں۔ اور انعام حاصل کرنے کی لالچ یا خوف سزا

کے باعث اسے آپ دھوکہ بازی۔ مکاری اور جھوٹ بولنا سکھا دیتے ہیں اور احساس کو ظاہری جامہ پہنانے کی بجائے اپنے احساسات کو پوشیدہ رکھنے کا عادی بنا کر دھوکا دینا حقیقی ارادے کے علم سے آپ کو محروم رکھنا اور حسب موقع آپ کو ادھر ادھر کی بے معنی الفاظ میں جواب دینا آپ خود ہی سکھا دیتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ قوانین نافذہ بھی تو ضمیر پر حاوی ہوتے ہیں سن رسیدہ لوگوں پر اسی نوعیت کی پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے! لیکن یہ سن رسیدہ لوگ بھی محض ناقص تعلیم کے بگاڑے ہوئے بچوں کے سوا اور کیا ہوتے ہیں! بس یہی چیز ہے جس سے آپ کو بچنا ضروری ہے بچوں کے ساتھ طاقت اور بڑوں کے ساتھ دلیل استعمال فرمائیے۔ یہی قدرت کا انتظام ہے۔ ایک دانش مند کو کسی قانون کی پابندی کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ضرورت اور حاجت کا اتباع

آپ اپنے شاگرد کے ساتھ اس کی عمر کے لحاظ سے سلوک کریں۔ ابتدا ہی سے شاگرد کو اس کی اپنی جگہ پر ہی رکھیئے اور وہیں رہنے دیجئے۔ یہاں تک کہ وہ اس جگہ سے علیحدہ ہونے کی کوشش بند کر دے۔ پھر یہ جاننے کے قبل کہ بھلائی کیا شئے ہے وہ از خود ہی اس پر عمل پیرا ہو جائے گا۔ شاگرد کو کبھی کوئی حکم نہ دیجئے اور اس کے دل میں اس بات کا خیال تک نہ آنے دیجیئے کہ آپ کو اس پر حکومت کرنے کا کوئی حق حاصل ہے۔ اس کو محض یہی محسوس ہونا چاہیئے کہ وہ کمزور ہے اور آپ طاقتور اور یہ کہ محض آپ کے اور شاگرد کے حالات ہی نے اسے آپ کے رحم و کرم پر ڈال دیا ہے ان باتوں کا دھیان۔ گیان اور خیال خود اسی کو آنے دیجئے۔ ضرورت اور حاجت کے وزنی جوئے کا بوجھ جس کے نیچے کہ بشر فانی ہستی کو سر تسلیم خم کرنا لازمی ہے اور جو قدرت نے ہم سب پر عائد کر رکھا ہے بچے کی گردن پر آغاز ہی میں ڈال کر محسوس کرا دیجئے۔ یہ ضرورت مادی اشیا کی بابت ہونی چاہیئے لوگوں کے خیالی تاثرات کی بنا پر نہیں! لگام قوت ہونی چاہیے حکومت نہیں۔ پس اگر کوئی فعل ایسا ہو جو آپ کی رائے میں شاگرد کو نہ کرنا چاہیئے تو آپ اس کو زبان سے منع نہ کیجیئے بلکہ بلا زبان ہلائے جا کر اس کو روک دیجئے۔ اور جو کچھ آپ اس کو دیں زبان ہلائے بغیر ہی بلا کسی استدعا یا مسبت غیر مشروط طور پر فوراً دے دیں۔ اور وہ بھی اپنی ذاتی مرضی سے دیں۔ انکار ہمیشہ بلا مرضی کیجیے لیکن انکار ناقابل رجوع ہونا چاہیے کسی قسم کی گریہ وزاری سے آپ متاثر نہ ہوں ایک مرتبہ زبان سے نہیں نکلنے کے بعد وہ نہیں ایک ایسی پختہ دیوار بن جانا چاہیئے جس کے خلاف بچہ اپنی قوت چاہے پانچ چھ مرتبہ صرف کر دے لیکن بالآخر اس کے گرانے کی پھر آئندہ کوشش نہ کرے

مصنف۔ آپ یہ سمجھ جائیے کہ ہر بات کو جو مرضی کے خلاف ہو یا جس کو وہ سمجھ نہ سکتا ہو بچہ قیاسی اور خیالی تصور کرتا ہے لہذا اس کو ایسی کوئی بات نہ ہو جو اس کے تصور یا قیاس کی مزاحمت یا اس کے خیال میں مداخلت کرتی ہو۔

[illegible] کی تمام خواہشات تکمیل نہ بھی پائیں آپ اس کو صابر۔ معتدل۔ خاموش قانع اور متوکل بنا دیں گے۔ کیونکہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ قدرت کے تو ہر معاملہ کو صبر و شکر سے برداشت کر لیا جاتا ہے۔ لیکن دوسروں کی بدخلقی اور مخالفت کی تاب نہیں لائی جائے گی۔ بچے کو ہرگز یہ خیال نہ گذرنا چاہیئے کہ اس سے جھوٹ بولا جا رہا ہے۔ کیونکہ وہ اس خواب سے کہ کچھ نہیں بچا، کبھی سرکش اور باغی نہیں ہوتا۔ پس اس کے علاوہ آپ اس سے یا تو کوئی مطالبہ ہی قطعاً نہ کریں یا آپ اس کو اپنا کامل مطیع بنا لیں کوئی درمیانی راہ نہیں ہے۔ بدترین تعلیم تو یہ ہوگی کہ آپ اس کو اس کی اور اپنی ذاتی مرضی کے مابین حالت تذبذب میں معلق چھوڑ دیں اور یہ جھگڑتے رہیں کہ وہ آقا ہے یا آپ میں تو ہزار دل میں اس کا ہی آقا ہونا زیادہ پسند کرتا ہوں۔

قبل از وقت نصیحت یا مشورہ

بڑے تعجب کی تو یہ بات ہے کہ لوگوں نے جب سے تعلیم کی بابت سوچنا اور غور کرنا شروع کیا ہے۔ انہوں نے رقابت جلن۔ حسد۔ ریاکاری۔ لالچ۔ بزدلاپن اور جملہ ایسی مہلک ترین خواہشات کے سوا جو ہر وقت جوش میں آنے اور جسمانی نشوونما کے قبل ہی روح کو برباد کرنے کے لیئے تیار رہتی ہیں۔ بچوں کی رہنمائی اور تربیت کا کوئی دوسرا طریقہ آج تک دریافت نہیں کیا ہے۔ ہر نصیحت یا مشورے کے ذریعہ جو قبل از وقت آپ بچے کو ذہن نشین کراتے ہیں۔ آپ اس کے دل میں بدی کا ایک بیج بو دیتے ہیں۔ نادان استاد جب اپنے ننھے شاگرد کو نیکی کا سبق دینے کے لیئے شریر اور بدکار بننے کی ابتدا کرتا ہے۔ تو وہ اپنے زعم میں گویا کمال کرتا ہے اور ہم سے نہایت متانت اور سنجیدگی سے کہتا ہے۔ "آدمی ایسا ہوتا ہے" بیشک آدمی اب تو ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ نے اس کو بنا دیا ہے۔ ہر ایک طریقہ استعمال کیا جا چکا ہے۔ صرف ایک یہی ایسا طریقہ ہے کہ جس میں کامیابی کی توقع ہو سکتی ہے۔ یعنی شاگرد کو با ترتیب منظم اور باقاعدہ آزادی دینا آپ اگر محض ان قوانین کے تحت رہنمائی کرنے کے اہل نہیں ہیں کہ کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں ہو سکتا تو براہ کرم آپ کسی بچے کی پرورش اور تربیت کی نگرانی ہی اپنے ذمہ نہ لیں۔ امکانی اور غیر امکانی امور کے حدود سے بچہ نا واقف ہوتا ہے۔ پس بچے کے ماحولی امور کے متعلق آپ ان حدود کے اندر حسب مرضی کمی بیشی کر سکتے ہیں۔ بچے کو تنہا اس کی ضروریات اور حاجتوں میں مجبور رکھیئے۔ انہی کی ترغیب اور انہی کے ذریعہ اس پر قابو رکھیئے۔ بدی اور برائی کے کسی احتمال کے بغیر محض مادی اشیا کے ذریعہ ہی سے اس کو تعلیم و تربیت حاصل کرنے اور موزوں بننے کے لائق بنایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ خواہشات اس وقت

تک نہیں ابھرتی ہیں جب تک کے ان کی تکمیل نہ کی جائے ۔

سزا اور جزا کا اثر

اپنے طالب علم کو آپ کبھی زبانی سبق نہ دیجئے بلکہ اس کو محض عملی تجربات کا سبق دیجئے ۔ اس کو آپ کبھی سزا نہ دیں اس لیے کہ ناجائز اور بیجا امور کی نوعیت ہی سے وہ ناواقف ہوتا ہے ۔ اس سے یہ ہرگز نہ کہلوایئے: "مجھے معاف کیجئے" کیونکہ وہ اس امر سے کلیتاً ناواقف ہے کہ آپ کو کیا اور کس طرح ضرر پہنچا ہے ۔ وہ اپنے اعمال کے اخلاقی پہلوؤں سے قطعاً لاعلم ہوتا ہے ۔ اس لیے اخلاقاً وہ آپ کا قصوروار نہیں ہو سکتا ۔ لہذا نہ سزا کا مستحق ہو سکتا ہے اور نہ کسی لعنت اور ملامت کا ۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ حیرت زدہ ناظر اس بچے کا اپنے زمانے کے دوسرے بچوں سے مقابلہ کر رہا ہے یہ اس کی بڑی غلطی ہے مستقل پابندیاں جوان بچوں پر عائد کی جاتی ہیں ۔ وہ ان کی قوت فعلیہ کو ابھارتی رہتی ہے ۔ لہذا آپ کے سامنے وہ جس قدر غریب اور مسکین ہوتے ہیں آپ کی نگاہ سے اوجھل ہوتے ہی وہ اتنے ہی شریر اور بد افعال ہو جاتے ہیں کیوں کہ آپ کی عائد کردہ شدید قیود کی کسر ان کو نکالنی لازمی ہو جاتی ہے ۔ شہری مدرسہ کے مدہی بچے دیہات کے تمام بچوں سے زیادہ مضرت رساں ہوتے ہیں ۔ ایک شہری اور ایک دیہاتی نوعمر کو کسی ایک کمرہ میں بند کر دیجئے ۔ آخرالذکر حرکت بھی نہ کرنے پائے گا ۔ کہ اول الذکر اس کمرے کی ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر پھینک دے گا ۔ اس کی اس امر کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ایک تو دم بھر کی مہلت کو گویا بیجا ہی سی استعمال میں بے اطمینانی اور بے احتیاطی سے کام نہیں لیتا ۔ حالانکہ دیہاتی بچے بھی لاڈ و پیار اور قیود کا اکثر شکار ہو جانے کی وجہ سے اس کیفیت سے کہ جس میں کہ میں ان کو رکھوانا چاہتا ہوں بہت دور ہوتے ہیں ۔

بچہ کا حب نفس

یہ قاعدہ ہم کو غیر متبدل اور دائمی بنا لینا چاہیئے کہ ابتدائی تاثرات فطرتی اور ہمیشہ صحیح و درست ہوتے ہیں انسان کے دل میں گناہ کا خیال کبھی از خود نہیں پیدا ہوتا ۔ پس ہر برائی یا بھلائی کے دل میں پیدا ہونے کے اسباب وہیں بآسانی دریافت ہو سکتے ہیں ۔ فطرتی خواہش صرف ایک ہی ہوتی ہے یعنی حب نفس یا وسیع تر معنوں میں ۔ خود غرضی ۔ یہ خود غرضی بذات خود اور ہماری ذات کی حد تک نہایت عمدہ چیز ہے ۔ پس کیونکہ بچہ دوسروں سے کوئی ضروری تعلق نہیں رکھتا ۔ اس لیئے

فطرت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی حب نفس کی برائی بھلائی اسی وقت ظاہر ہو سکتی ہے جبکہ اس کا استعمال کیا جائے اور اس کے ذریعہ تعلقات یا رشتے قائم کیے جائیں۔ پس جب تک بچہ سن شعور کو نہ پہنچ جائے جو اس کی عمر کی کا تیرہواں سال ہوتا ہے اس وقت تک اصل لحاظ اس امر کا رکھنا لازمی ہے کہ اس کا کوئی فعل محض اس خیال کے تحت نہ ہو کہ آپ اس کو دیکھ رہے ہیں یا سن رہے ہیں۔ المختصر یہ کہ وہ کوئی کام کسی کی خاطر سے نہ کرے بلکہ صرف وہی کام کرے جس کی طالب اس کی فطرت ہو۔ پھر وہ کبھی بھی کسی ناجائز یا غلط فعل کا مرتکب نہ ہوگا

اس سے ہرگز میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ کوئی شرارت ہی نہ کرے گا یا کبھی چوٹ نہ کھائے گا یا کوئی قیمتی زیور اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ تو اس کو نہ توڑے گا۔ کوئی ناجائز فعل کیئے بغیر ممکن ہے کہ وہ بہت کافی نقصان پہنچا دے۔ اس لیئے کہ ناجائز یا نقصان دہ فعل کا انحصار محض نیت پر ہوتا ہے اور اس کی یہ نیت کبھی نہیں ہوتی۔ اگر ایک دفعہ بھی کوئی نقصان وہ بالارادہ پہنچا دے تو سمجھ لیجئے کہ اس کی ساری تعلیم اکارت ہوگئی وہ مایوس کن بدکردار بن جائیگا

بعض امور کو لالچ ناجائز قرار دیتی ہے لیکن عقل ان کو جائز قرار دیتی ہے۔ جب بچے کو آپ استغنا کا پورا پورا موقعہ دیں۔ تو ضروری ہے کہ آپ ہر اس چیز کو جسے وہ خراب کر سکے یا بگاڑ سکے اس کے سامنے سے ہٹا دیں اور کوئی نازک اور بیش بہا چیز بچے کی زد میں نہ چھوڑیں۔ اس کے کمرے میں سادہ اور مضبوط سامان رکھیئے۔ چینی اور شیشے کا سامان یا بیکار زینت کی کوئی چیز وہاں نہ رہنے دیں۔ میرے اسمٰعیل کا کمرہ جس کی پرورش دیہات میں ہوئی ہے بالکل ایک دیہاتی کسان کے کمرے کی مانند ہوگا بھلا جبکہ بالخصوص ایک ننھا سا بچہ اس میں رہتا ہو تو آپ کمرے کو سجانے کی کوشش ہی کیوں کریں؟ نہیں نہیں میں بھولا! وہ خود اپنا کمرہ سجائے گا۔ اور آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ کس طرح؟

آغاز سن کی تعلیم محض منفی ہونی چاہیے۔

کیا میں اس موقع پر تعلیم کا اعلیٰ۔ اہم اور مفید ترین مقصد بیان کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں؟ وہ یہ ہے کہ وقت کو آپ بچانے کی جگہ ضائع کیجئے۔ میں امید کرتا ہوں کہ میرے ناظرین روز مرہ کی بظاہر بعید القیاس باتوں کو معاف فرمائیں گے۔ آپ اگر خود غور فرمائیں تو ان "بظاہر بعید العقل" باتوں کو آپ بھی نظر انداز نہ فرما سکیں گے۔ بہرحال آپ جو کچھ بھی فرمائیں میں تو ان "بظاہر بعید القیاس" باتوں کو اصل تاثرات پر ترجیح ہی دوں گا۔ انسانی زندگی کا خطرناک ترین دور اس کی پیدائش کی گھڑی سے شروع ہو کر بارہ سال کی عمر تک رہتا ہے — یہ وہ دور ہوتا ہے کہ جس میں

نقائص اور برائیاں پیدا تو ہو جاتی ہیں لیکن اس عمر میں انہیں دور کرنے کا کوئی ذریعہ میسر نہیں آتا ہے اور جب ان کے دور کرنے کا موقع ملتا ہے تو ان کی جڑیں اس قدر مضبوط ہو چکی ہیں کہ پھر اکھاڑے نہیں اکھڑتی ہیں۔ اگر بچہ ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی سن شعور حاصل کرے تو رائج الوقت تعلیم بالکل مناسب اور موافق ہو جائے۔ لیکن ادراک یا شعور کی فطرتی بالیدگی کے لیے بالکل مختلف تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک ان کی قوتیں بالیدہ ہوں دل و دماغ کو بالکل آرام اور سکون دینا چاہیئے۔ کیونکہ جب وہ نابینا ہوتے ہیں اس وقت نہ آپ کی پیش کردہ شمع ہدایت ہی کو وہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ خیالات کے وسیع میدان کے اس دھندلے راستے کی عقل کے ذریعہ اتنا اکر سکتے ہیں جو تیز نگاہ تک کو بھی مشکل ہی نظر آسکتا ہے۔

لہٰذا آغاز سن میں محض منفی تعلیم ہونی چاہیے۔ جو پارسائی اور صداقت سکھانے پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ گمراہ اور بدنیت سے دل کو محفوظ کرنے پر مشتمل ہے۔ اگر آپ اس کو یونہی چھوڑ دیں اور دوسروں کو بھی اپنا پیرو بنالیں اور بارہ سال کی عمر تک تندرست اور طاقتور حالت میں اس کی ایسی پرورش کریں کہ وہ سید ہے اور الٹے ہاتھ میں بھی تمیز نہ کر سکے تو جونہی آپ اس کی تعلیم کی ابتدا کریں گے منطق اور دلیل کو اس کا ادراک خود سمجھنے لگے گا۔ تاثیرات اور عادات سے آزاد رہنے کے باعث آپ کی محبت کے اثرات کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی چیز نہ ہوگی اور آپ کی محبت میں جلد ہی وہ عاقل ترین شخص بن جائے گا۔ یہ عمل ابتدا کی انتہا تعلیمی معجزات پر ہوگی۔

مروجہ عمل کا اب آپ الٹ دیں تو تقریباً ہمیشہ آپ کا عمل ٹھیک اور درست ہی ہوگا۔ والدین اور اساتذہ بچوں کو بچہ نہیں بلکہ عاقل انسان بنانا چاہتے ہیں ان کو گھورکنے۔ سہارنے۔ لعنت ملامت کرنے۔ ڈرانے دھمکانے۔ رشوت ملالچ دینے۔ سکھانے اور ان سے حجت و بحث کرنے میں جلدی کرنے کو قبل از وقت کبھی خیال نہیں کرتے۔ آپ ان سے زیادہ بہتر عمل کیجئے آپ خود معقول بنیئے۔ بچے سے کبھی منطق نہ چھانٹیئے اور بالخصوص جس چیز کو بچہ ناپسند کرتا ہو اسے پسند کرنے پر اس کو مجبور نہ کیجئے کیونکہ آپ کی دلیل اگر کسی ناگوار اور ناپسندیدہ شے سے تعلق رکھتی ہے تو وہ بچے کے لیے بدذائقہ ہو جاتی ہے اور آغاز عمر ہی میں آپ دلیل کی برائی ایک ایسے دل میں بٹھا دیتے ہیں جو اس وقت تک اس کے سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا ہے۔ آپ اس کو جسمانی ورزش کرائیے اعضا، حواس اور قوتوں کی مشق کرائیے لیکن اس کے دل و دماغ کو حتی الامکان معطل ہی رہنے دیجئے۔ ان تمام تجاویز کو جو دل و دماغ کے مابین امتیاز کرنے کے لیے دلیل کے سامنے پیش ہوں یک لخت مشتبہ خیال فرمائیے اور کچھ خیالات کو

[illegible] بھلائی کی نشوونما کرنے کے لیے اچھے اعمال کی تعلیم میں جلدی نہ فرمایئے۔ کیوں کہ بھلائی کا امکان جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ اس کا [illegible] سے متنفر ہو۔ تمام مدتِ طفولیت کو یہ تصور فرمایئے کہ گویا وہ وقت آپ نے محفوظ کر لیا ہے اس میں آپ کو بہت کافی کامیابی حاصل ہو چکی ہے اور آپ بلا تکلیف انتہا کو پہنچ گئے یا بلا نقصان مقصد حاصل کر چکے ہیں۔ اپنی اولاد کے بچپن کو پختگی حاصل کرنے دیجئے المختصر یہ کہ جس چیز کی ان کو ضرورت ہو اور بلا خدشہ اس کی تکمیل کل یعنی دوسرے دن پر ملتوی ہو سکتی ہو تو خبردار اس کو آج ہرگز ہرگز پیدا نہ کیجئے۔

میلان طبع کی مطابقت

اس طریق تعلیم کی منفعت کی توثیق جس چیز سے ہوتی ہے۔ اس کے لئے ایک امر اور بھی قابلِ غور ہے یعنی بچے کا انفرادی میلانِ طبع۔ جو موزوں ترین اخلاقی تربیت کے انتخاب کے قبل ہی ہم کو بخوبی معلوم کر لینا ضروری ہے۔ ہر ذہن کی نوعیت جدا ہوتی ہے۔ پس اسی کے مطابق ہمیں اس کو قابو میں رکھنا چاہیے۔ اور اس محنت و مشقت کی کامیابی کا انحصار کسی اور طریق پر نہیں بلکہ اسی طریق پر اس کو قابو میں رکھنے میں ہے۔ آیئے حکماء و عقلا تھوڑا سا وقت قدرت کا مشاہدہ کرنے میں صرف کیجئے اور اس کے قبل کہ آپ بچے سے ایک لفظ بھی بولیں اس کی صرف محافظت اور نگہبانی فرمایئے۔ اس کی خصلت اور ذہنیت کا رجحان معلوم کرنے کے لیے ابتداً آپ اس کو بالکل آزاد چھوڑ دیجئے۔ کسی معاملہ میں روک ٹوک نہ کیجئے تاکہ آپ اس کو اس کی اصلی حالت میں ملاحظہ فرمائیں۔ آپ کیا یہ خیال فرماتے ہیں کہ اس کا یہ آزادی کا زمانہ ضائع ہو جائے گا؟ نہیں بلکہ آپ کے شاگرد کو ایک بہتر مشغلہ مل جائے گا۔ اس لئے کہ جب وقت کی قدر و قیمت اس طرح زیادہ ہو جائے گی۔ تو آپ خود ایک پل بھی ضائع نہ کرنے کے عادی ہو جائیں گے۔ بہر حال آپ اگر یہ معلوم کیے بغیر کوئی عمل شروع کر دیں کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے تو آپ کا وہ عمل اٹکل پچو ہوگا۔ آپ غلطیاں کریں گے اور اپنے ہی قدم آپ واپس ہٹیں گے۔ حصولِ مقصد کی جلدی آپ کو اس سے اور بھی دور کر دے گی۔ آپ اس کنجوس اور مسمم کی اقتدا نہ کریں جو تھوڑے سے نقصان کے خوف سے بہت زیادہ نقصان برداشت کرتا ہے۔ آغازِ طفلی ہی میں تھوڑا سا وقت قربان فرما دیجئے عمر رسیدہ ہونے پر آپ کا شاگرد مع سود وہ کل وقت حاصل کرے گا۔ دانا اور ہوشیار طبیب کسی مریض کو دیکھتے ہی کبھی کوئی نسخہ فوراً تجویز نہیں کرتا۔ علاج گو دیر سے شروع ہوتا ہے لیکن مریض ضرور شفا یاب ہو جاتا ہے۔ لیکن جلد باز ڈاکٹر اس کو ہلاک ہی کر دیتا ہے

ماحول پیدا کرنا

لیکن ہم کو ہمارے بچے کے لئے ایسی جگہ کہاں میسر آسکتی ہے جہاں ایک غیر متاثر رہنے والی ہستی کے مانند اس کی پرورش خود رو یا طبعی ہو سکے۔ کیا ہم اس کو چاند میں لے جا کر رکھیں یا کسی غیر آباد جزیرے میں۔ کیا ہم اس کو انسانی سماج سے علیحدہ کر دیں۔ کیا دوسروں کی خواہشات اس کو چاروں طرف سے ہمیشہ ترغیب نہ دیتی رہیں گی۔ کیا اپنے ہم عمر بچوں کو وہ نہ دیکھے گا۔ کیا وہ اپنے والدین۔ پڑوسیوں اپنی انا۔ اپنی استانی۔ اپنے ملازمین اور خود اپنے استاد کو جو بہر حال فرشتہ نہیں ہیں نہ دیکھے گا۔ پس ہمارے خلاف ایک بھی متین اور سنجیدہ اعتراض ہے۔ تو میں نے آپ سے یہ کب کہا تھا کہ قدرت یا فطرت کے مطابق تعلیم دینا کوئی آسان کام ہے۔ اے صاحبو اس میں کیا بھلا میرا قصور ہے کہ آپ نے تمام بھلے کام دشوار بنا رکھے ہیں۔ یہ میں مانتا ہوں کہ مجھے ان دشواریوں کا علم ہے۔ اور شاید یہ نہایت زبردست اور ناقابل ہوں لیکن پھر بھی مجھے یہ یقین ہے کہ ہم اگر اس طرح کوشش کریں تو ایک حد تک ان سے محفوظ ہو سکتے ہیں۔ میں آپ کو یہ بتا رہا ہوں۔ کہ ہم کو کیا حاصل کرنا چاہیئے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہم کیا حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور کہتا ہوں جو اس کے قریب تر پہنچ جائے گا۔ وہ کامرانی اور کامیابی کے بھی قریب تر پہنچ جائے گا

خود نمونہ بننا چاہیئے

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی کو انسان بنانے کی سعی کرنے کے قبل خود آپ کا بھی انسان ہونا لازمی ہے۔ خود آپ کو عملی نمونہ بن جانا چاہیے کہ جس کا بچہ اتباع یا نقل کر سکے۔ بچہ جب تک ناسمجھ رہتا ہے۔ اس عرصہ میں ایک مناسب ماحول تیار کرنے کا آپ کو کافی وقت مل جاتا ہے تاکہ موزوں اور مناسب اشیا کے سوا کسی دوسری چیز سے بچے کی نگاہ متاثر نہ ہونے پائے۔ پس ہر شخص کے دل میں گھر کیجئے اور ہر ایک کو اپنا بنا لیجئے۔ تاکہ ہر ایک آپ کو خوش کرنے کی کوشش کرے اگر آپ بچے کے جد عالی موالیوں پر قابو نہ رکھ سکینگے تو آپ اس بچے کے استاد بھی نہ بن سکینگے۔ اس عہدہ اتالیقی کا انحصار جب تک آپ کی پارسائی کے احترام پر نہ ہوگا یہ عہدہ کبھی با اثر نہ ہو سکے گا۔ یہ دولت اشرف اور خلوص، روپیہ لٹا دینے کا سوال نہیں ہے اور میں نہیں جانتا کہ محبت کبھی روپے سے بھی خریدی جا سکتی ہے۔ آپ نہ تو غل نہ اور دوسرے پیسے بنیں اور نہ ایسی اور بس جبکہ آپ کسی مصیبت میں کام آسکتے ہیں۔ تو آپ کو محض ترس کھانے اور ہمدردی جتانے سے ہرگز کام نہ لینا چاہیئے۔ اگر روپیہ خیرات کرنے میں آپ فراخدلی سے کام نہ لیں تو

[illegible] محبت [illegible] ہوجائے گی دوسروں کے دل بھی آپ کے لئے ہمیشہ اسی طرح تنگ رہیں گے۔ آپ کو [illegible] لیے صفائی وقت بلکہ خود بھی اپنی ذات تک کو کام میں لگانا چاہئے اس لئے کہ آپ جو کچھ بھی کرتے ہیں لگ [illegible] محسوس کرتے ہیں۔ کہ آپ کی روش آپ کی ذاتی نہیں ہے۔ ہمدردانہ افعال کی ایسی بہت سے مثالیں گزر چکی ہیں۔ جس سے کہ بڑے بڑے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ اور وہ ہمیشہ انعام اور اکرام کی نسبت زیادہ مفید ہوتے ہیں۔ کتنے بیمار آفت زدہ ہیں۔ جنہیں خیرات کے مقابلے میں آرام اور تسلی کی بیحد زیادہ ہے [illegible] مظلوم ہیں جو روپے کی نسبت پناہ، اور محافظت کے زیادہ محتاج ہیں۔ جھگڑنے والوں میں مصالحت کرادیا کیجئے۔ مقدمہ بازی سے لوگوں کو باز رکھئے۔ چھوٹوں کو فرائض کی انجام دہی کی طرف توجہ فرمایئے اور بڑوں کو رحم کی ترغیب دلایئے۔ بھاگوان اور کامیاب شادیوں میں شریک ہوا کیجئے اور اپنے شاگرد کے والدین کی ساکھ اور ان کے اثرات کو آزادی کے ساتھ ان بے کسوں، لاچار اور ناتوانوں کی حمایت میں استعمال فرمایا کیجئے۔ جو کوئی دادرسی حاصل نہ کر سکتے ہوں اور طاقت وروں کے مظالم کا شکار ہوگئے ہوں۔ آپ عادل۔ ہمدرد اور مکمل انسان بن جایئے۔ دھن دولت محض پر نہ بیٹھئے۔ بلکہ سخی سردار بنیئے۔ مصائب سے نجات دلانے کے لئے روپیہ کی نسبت رحم دلی کے کام بہت زیادہ مفید ہوتے ہیں۔ آپ دوسروں سے محبت کیجئے۔ دوسرے خود بخود آپ کے گرویدہ ہوجائیں گے۔ آپ ان کی خدمت کیجئے وہ آپ کی غلامی کریں گے آپ ان کے بھائی بن جایئے وہ آپ کی اولاد بن جائیں گے۔

دیہاتی ماحول زیادہ مناسب ہے

یہی وجہ ہے کہ میں اپنے اسمٰعیل کو اُن بناؤ سنگھار کرنے والے نمائشی بدبختوں سے جو اپنے استادوں کے بعد دنیا کے بدترین لوگ ہوتے ہیں۔ اور شہر کی اس ناپاک اور ذلیل اخلاقیات سے جو ظاہری چمک دمک کے باعث بچوں کے لئے بے حد فریب آور اور زہر آلود ہوتی ہے۔ بہت دور علاقہ کسی ایسے دیہات میں لے جاکر پرورش کروں گا۔ جہاں کسانوں کے عزیز ترین عیوب جن کی خرابی عیاں ہوتی ہے۔ بالخصوص جب کہ ان کی نقل کی نیت ہی نہ ہو اسمٰعیل کو بجائے ترغیب کے نفرت دلانے کے زیادہ سزاوار ہونگے۔

دیہات میں اتالیق کو بھی ان تمام امور پر جن میں وہ بچے کے علم میں اضافہ چاہے گا نہایت آسانی سے قابو حاصل ہو سکے گا
اس کی شہرت اس کے اقوال اور اعمال کو وہ رفعت اور اہمیت حاصل ہو سکے گی جو ایک شہر میں کبھی نصیب نہیں ہو
سکتی ہے۔ اتالیق چونکہ دیہات میں ہر ایک کے کام آئے گا۔ اس لئے ہر شخص اس کی قربت حاصل کرنے کے
لئے اسے ممنون و مشکور کرے گا۔ اور اس کی مرضی کے مطابق خود کو شاگرد کے روبرو ظاہر کرنے کے لئے بے
چین رہے گا۔ اور اگر خرابی یا نقص دور نہ بھی ہوگا۔ تب بھی اتالیق کم از کم ایک عام بدنامی سے تو بچا رہے
گا جس کی ہماری موجودہ مقاصد کی تکمیل کے لئے بڑی ضرورت بھی ہے۔

اپنی خطاؤں کا الزام دوسروں پر نہ تھوپیئے بچہ از خود اتنا نہیں بگڑتا ہے جتنا کہ وہ آپ کے سبق
دینے سے بگڑ جاتا ہے کسی خیال کو اچھا جان کر ایک بچے کے دل میں ذہن نشین کراتے وقت آپ اس کے
ساتھ اپنے مسلسل پند و نصائح۔ اخلاقی سبقوں اور اپنی علمی نشستوں کے ذریعہ اور بیس دوسرے ایسے
خیالات بھی پیدا کر دیتے ہیں جو بالکل بے سود اور ناکارہ ہوتے ہیں آپ اپنی دلی کیفیت سے بذات خود
تو عاجز ہو جاتے ہیں لیکن اس کے ذریعہ جو آپ دوسروں پر اثر ڈالتے ہیں اس کی طرف ذرا غور نہیں کرتے
الفاظ کی مسلسل بوچھاڑ میں آپ کے نزدیک کیا ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہوتا جس کے معنی وہ بچہ غلط یاد
کرلے؟ آپ کا کیا یہ خیال ہے کہ بچہ آپ کی طوالانی اور پیچیدہ تشریحات پر کوئی اپنی ذاتی تنقید نہیں
کرتا اور یہ کہ اس کی عقل کے مطابق ان تشریحات میں اسے ایسا طریقہ اختیار کرنے کے لئے کیا کوئی مواد نہیں
مل جاتا ہے جسے کہ بحصول موقع وہ آپ ہی کے خلاف استعمال کر سکے؟۔

اس ننھے معصوم کی باتوں پر جو ابھی زیر تربیت ہے آپ کان دھریئے اُسے آزادی سے گفتگو کرنے
کا پورا پورا موقع دیجئے اس سے سوال کیجئے اور آسان گفتگو فرمایئے تو آپ یہ دیکھ کر کہ اس کے دل میں
آپ کے دلائل کیا کیا صورتیں اختیار کرتے ہیں۔ حیرت زدہ ہو جائیں گے۔ وہ چیز کو الجھا اور خلط ملط کر دے گا
اس کے غیر متوقع اعتراضوں سے آپ چڑ کر ناراض ہو جائیں گے۔ وہ یا تو آپ کو خاموش کر دے گا یا خود خاموش
ہو جائے گا۔ بھلا ایک باتونی کے سکوت سے وہ کیا نتیجہ نکال سکتا ہے پس اگر وہ ایک مرتبہ بھی کامیاب ہو گیا
اور اپنی کامیابی سے واقف بھی ہو گیا تو بس اسے تعلیم ترا خدا حافظ! اس کی ساری کی ساری تعلیم اسی وقت

[illegible] اور حصول تعلیم کی سعی کو خیرباد کر کے ہر وقت آپ ہی کی تردید کرنے کا فکرمند رہنے لگے گا۔

غصہ اور جوشیلے استادو! ذرا سادگی معقولیت اور خاموشی سے کام لو۔ دوسرے لوگوں کے اعمال کو دیکھنے کے سوا کسی اور کارروائی میں عجلت سے کام نہ لو سمجھے بار بار یہی دُہرانا پڑتا ہے کہ برائی کے خوف سے آپ بھلائی کا سبق بھی موقوف کر دیں۔ اس دنیا میں جسے قدرت فردوس بر روئے زمین بنانے کا ارادہ رکھتی ہے آپ شیطان کا فرض ادا نہ کریں۔ اور معصوم بچے کو برائی بھلائی سے واقف کرانے کی سعی نہ فرمائیں۔ اس لئے کہ آپ بچے کو ان معلومات سے محروم نہیں رکھ سکتے جو وہ ماسوا کو دیکھ کر از خود حاصل کرتا رہتا ہے لہذا آپ اس کے دل پر ان مثالوں کے مناسب ترین نقوش پیدا کرانے میں اپنی کوششیں صرف فرمایئے۔

غصہ اور خفگی وغیرہ کا اثر

جب بچہ بے قرار اور مضطرب خواہشات کو دیکھتا ہے تو اُن کا اس پر ایک بڑا زبردست اثر ہوتا ہے ان خواہشات کی ظاہری شکل بالکل نمایاں ہوتی ہے۔ جو اس کے دل پر کافی اثر کرتی ہے۔ اور وہ فوراً ان کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ ناراضگی اور خفگی خصوصاً بحالت غیظ وغضب اس قدر عیاں ہوتی ہے کہ اگر آپ اس کی ذوص ہوں۔ تو آپ پر اُس کا اظہار نہ ہونا تقریباً ناممکن ہے آپ کو یہ سوچنے کی ضرورت نہیں کہ یہ موقع استاد کے لئے کوئی عمدہ مباحثہ ترتیب دینے کا ہے یا نہیں نہ عمدہ مباحثہ کا ہے نہ کچھ اور بات کا بلکہ ایک لفظ بھی بولنے کا نہیں ہے! آپ اس بچے کو جس نے یہ منظر دیکھا ہے اپنے آپ آنے دیجئے وہ اس سے متاثر ہونے کے باعث لازماً آپ سے سوالات کرے گا۔ جواب بہت آسان ہوگا اور انہی چیزوں سے ادا ہو جائے گا جنہوں نے اس کے حواسوں کو متاثر کیا ہوگا۔ بچہ ایک شگفتہ چہرہ چمکیلی آنکھیں اور ڈراؤنے تیور دیکھے گا اور چلانے کی آوازیں سنے گا ان تمام علامتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس شخص کا جسم کسی تکلیف میں مبتلا ہے بس آپ نہایت سادگی کے ساتھ بلا تصنع اور اختصار سے فرما دیجئے "یہ بیچارہ بیمار ہے اسے بخار چڑھ آیا ہے" اس نوبت پر آپ بچے کو چند الفاظ میں کچھ بیماری کے تخیل اور اس کی ایذاؤں سے آگاہ کر سکتے ہیں کیونکہ بیماری لوازمات میں سے ہے اور اس کا تعلق قدرت ہی سے ہے اس لئے بچے کو اس سے واقف رہنا ضروری ہے ان تخیلات کے خلاف جو بالذات مصنوعی نہیں ہیں کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ بچے کو ابتدائی عمر ہی میں ان شدید صدمہ ہوتا

نہیں وہ بیماری تصور کرتا ہے ایک قسم کی نفرت سی ہو جائے؟ اور کیا آپ یہ تسلیم نہیں کرتے ہیں کہ ایسا تخیل
بروقت پیدا کر دیا جائے ۔ تو ناگوار اور شاق ترین وعظ سے کہیں زیادہ خوشگوار اور موثر ترین نہ ہوگا!
ن اس تخیل کے اثرات مابعد پر ذرا آپ غور فرمایئے ۔ بوقت ضرورت اس سے آپ کو یہ اختیار حاصل ہوگا
یک سرکش بچے کے ساتھ آپ بیمار کا سا سلوک کریں یعنی اُس بچے کو اس ۔ ے کمرہ ہی کے اندر بشرط ضرورت
ر پر لٹائے رکھیں ، غذا کا پرہیز کرائیں ، اور روزافزوں خرابیوں سے بچے کو ڈرائیں اور ان شدید تدابیر کے
یعہ جو ممکن ہے کہ آپ کو بچے کے لئے عمل میں لانی پڑیں یہ خیال کئے بغیر کہ وہ کس قسم کی سزائیں ہیں بچے
ان برائیوں سے متنفر اور محفوظ فرما دیجئے ۔ اگر کسی وقت ایسا اتفاق ہو جائے کہ جو خس میں آپ خود اپنا
یر و سکون جو مطمح نظر ہونا لازم ہے کھو بیٹھیں تو آپ اپنی کمزوری کو چھپائیں نہیں بلکہ بالکل سادگی اور کشادہ
لی اور خفیف ندامت کے ساتھ بچے سے فرمادیں :" میاں تم نے مجھے سخت صدمہ پہنچایا ہے "

بچہ کی باتوں پر اچنبھے کا اظہار

مزید برآں یہ معاملہ نہایت ہی اہم ہے کہ اچنبھے کے الفاظوں پر جو بچے کے ان سادہ خیالات کا نتیجہ
ہوتے ہیں جن میں کہ وہ پرورش پاتا ہے نہ تو بچے کی موجودگی میں کچھ توجہ کرنی چاہئے اور نہ انہیں اس طرح
دہرانا چاہیے کہ بچہ سمجھ سکے نادانی کی ایک ہنسی چھ ماہ کی محنت اکارت کر کے ساری عمر کے لئے ایک ناقابل
تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے مجھے بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں کہ ایک بچے کو قابو میں رکھنے سے بسا اوقات
ایک انسان کے لئے اپنے نفس کو قابو میں رکھنا ضروری ہوتا ہے ۔ دو پڑوسیوں کی شدید لڑائی کا تصور باندھ
کر ان میں سے جو سب سے زیادہ غصہ میں ہو اس کے پاس جا کر میں اسمٰعیل کو یہ کہتا ہوا تصور کرتا ہوں " آپ بیمار
ہیں مجھے آپ سے بڑی ہمدردی ہے " اس گفتگو سے تماشائیوں اور شاید تم سب پر بھی کچھ نہ کچھ اثر یقیناً پڑے گا ہنسنے بُرا
بھلا کہنے یا تعریف کرنے کے بغیر اس کے قبل کہ اسمٰعیل اس گفتگو کے نتائج سے آگاہ ہو یا کم از کم اس کے متعلق کوئی غور و
خوض کر سکے میں خوشی ناخوشی اسمٰعیل کو اس مقام سے لازماً علیحدہ دوسری جگہ لے کر چلا جاؤں اور اس کے خیالات
دوسری طرف بٹانے میں عجلت سے کام لوں گا تاکہ اس گفتگو کے متعلق اسمٰعیل تمام باتیں فوراً ہی فراموش کر دے +

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ سکول

شعبۂ تعلیم

نمبر اور تاریخ	نام اور عہدہ	کس جگہ تقرری یا تبادلہ ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۵۵۵۰ ۶.۶.۵۴	م۔ رشید احمد۔ قائم مقام مدرس تربیت جسمانی گورنمنٹ ہائی سکول چونیاں	قائم مقام معلم تربیت جسمانی گورنمنٹ ہائی سکول اکال گڑھ	تاریخ حاضری سے	م۔ شاہ محمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
"	م۔ شاہ محمد قائم مقام معلم تربیت جسمانی گورنمنٹ ہائی سکول اکال گڑھ	قائم مقام معلم تربیت جسمانی گورنمنٹ ہائی سکول چونیاں	"	م۔ رشید احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
۱۱۸۲۷ ۵.۶.۵۲	م۔ محمد حسن معلم عربی گورنمنٹ ہائی سکول پنڈ دادن خاں	معلم عربی گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب بمشاہرہ خود	"	م۔ عبدالمنان کی جگہ جن کی خدمات ختم کی جا رہی ہیں
"	م۔ ظہور احمد ایم۔ اے	قائم مقام معلم عربی گورنمنٹ ہائی سکول پنڈ دادن خاں	"	م۔ محمد حسن کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
۱۱۶۹۸ ۴.۶.۵۲	راجہ محمد اختر۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ایک امیدوار	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول۔ کیمبل پور۔ بمشاہرہ ۔/-/۱۳۰	"	م۔ محمد صادق کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
"	م۔ محمد صادق بی۔ اے قائم مقام	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ	"	م۔ قمرالدین ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

نمبر اور تاریخ	نام اور عہدہ	کس جگہ تقرری یا تبادلہ ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۱۱۶۹۸ ۴.۶.۵۲	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول کیمبلپور۔	ہائی سکول جعفر بمشاہرہ خود	کس تاریخ سے	کی جگہ جو ملازمت میں داخل نہیں ہوتے۔
۱۵۸۴۵ ۲۲.۵.۵۲	م۔ انعام علی بی۔اے۔ایس اے وی ہیڈ ماسٹر ڈی۔بی ہائی سکول۔ ڈسکہ	قائم مقام ہیڈ ماسٹر۔ گورنمنٹ ہائی سکول ڈسکہ ۲۵۰/۳۵۵ کے گریڈ۔ سی	۱.۱۰.۵۱ سے	ایک نئی آسامی پر
۱۵۸۴۷ ۲۲.۵.۵۲	م۔ غلام حسین قائم مقام معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ نارمل پسرور	قائم مقام معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ نارمل سکول۔ گجرات۔ بمشاہرہ خود	تاریخ حاضری سے	اپنی آسامی ساتھ لے جائیں گے۔
〃	م۔ محمد حسین قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ نارمل سکول گجرات	قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی سکول کیمبل پور بمشاہرہ خود	〃	اپنی آسامی ساتھ لے جائیں گے
〃	م۔ غلام رسول۔ قائم مقام اردو مدرس۔ گورنمنٹ ہائی سکول کیمبل پور۔	قائم مقام زائد اردو مدرس گورنمنٹ نارمل سکول لالہ موسےٰ بمشاہرہ خود	〃	〃
〃	م۔ فیض الٰہی۔ اردو گورنمنٹ ہائی سکول۔ پھالیہ	اردو مدرس۔ گورنمنٹ نارمل سکول گجرات بمشاہرہ خود	۹.۶.۵۲ سے	م۔ محمد عالم کی جگہ جو سبکدوش ہونے والے ہیں
۱۵۸۴۳ ۲۲.۵.۵۲	م۔ حبیب اللہ فاروقی اردو گورنمنٹ ہائی سکول کمالیہ	معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ نارمل سکول چنیوٹ	تاریخ حاضری سے	م۔ فیض محمد کی جگہ جو ۱۳ اپریل ۱۹۵۲ء کو سبکدوش ہو چکے ہیں۔

نمبر اور تاریخ	نام اور عہدہ	کس جگہ تقرری یا تبادلہ ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۱۵۸۴۳ 22.5.52	م۔ علی محمد ایس وی ایکٹا میڈار جو عارضی طور پر گورنمنٹ ہائی سکول پاکپتن میں گئے ہوئے ہیں	قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی سکول کمالیہ	تاریخ حاضری سے	م۔ حبیب اللہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
۱۵۲۵۹ 17.5.52	م۔ انعام بخش۔ اے۔ ڈی پی آئی ملتان	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول تلہ گنگ بمشاہرہ خود	"	م۔ فضل کریم خالد کی جگہ۔ جو ۱۹۔ اپریل ۱۹۵۲ء کو سبکدوش ہو گئے۔
۱۵۲۵۹ 17.5.52	م۔ دلدار علی دلاوری ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول مری۔	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول حضرو بمشاہرہ خود	"	م۔ محمد یوسف علی خان جن کا تبادلہ چکوال میں ہوا ہے
"	م۔ منظور العزیز بیگ اے۔ ڈی آئی جھنگ	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول چنیوٹ بمشاہرہ خود	"	ایک نئی آسامی پر
۱۴۸۱۰ 12.5.52	م۔ فضل احمد معلم تربیت جسمانی گورنمنٹ ہائی سکول قصور	قائم مقام نگران تربیت جسمانی گورنمنٹ نارمل سکول لالہ موسیٰ ۲۵۰/۱۳۰ کے گریڈ میں	"	م۔ عبدالرحمٰن کی جگہ جن کا تبادلہ بطور معلم انگریزی ڈسکہ میں ہو چکا ہے۔
۱۴۹۰۲ 8.5.52	م۔ سعید اللہ خان قائم مقام معلم تربیت جسمانی گورنمنٹ ہائی سکول منٹگمری	قائم مقام اے۔ ڈی۔ آئی۔ برائے تربیت جسمانی۔ لائلپور	"	م۔ عبدالغنی شیدا کی جگہ جن کو رخصت دی گئی۔
E-۱۴۴۶۱ 1.5.52	م۔ محمد صدیق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول کندوال	"	م۔ محمد صادق اصغر کی جگہ

نمبر اور تاریخ	نام اور عہدہ	کس جگہ تقرری یا تبادلہ ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول نوشہرہ	بمشاہرہ خود	تاریخ حاضری سے	جن کا تبادلہ ہوچکا ہے
۱۴۴۶۱-E ۱.۵.۵۲	م - محمد صادق اصغر ایم - اے - بی - ٹی صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول ظفروال	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول ظفروال بمشاہرہ خود	"	ملک خورشید احمد کی جگہ جو ۸ مئی ۱۹۵۲ء سے سبکدوش ہو رہے ہیں
۱۴۲۶۳ ۶.۵.۵۲	م - محمد اقبال بی - اے - بی - ٹی اے - ڈی - آئی مظفر گڑھ	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول کوٹ عدو - بمشاہرہ خود	"	م - رحیم بخش کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے -
"	ع - اسعد دین اے - ڈی آئی ملتان	زائد معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول ملتان بمشاہرہ خود -	"	اپنی آسامی ساتھ لے جائیں گے
"	ع - محمد شفیع - اے - ڈی آئی - لائل پور	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول جھنگ - بمشاہرہ خود	"	م - گنے خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے -
"	ع - قدم خاں اے - ڈی آئی منٹگمری	زائد معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول منٹگمری بمشاہرہ خود	"	اپنی آسامی ساتھ لے جائیں گے -
۹۳۱۹ ۴.۵.۵۲	م - منور الدین قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول مٹھہ ٹوانہ	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول بھیرہ - بمشاہرہ خود	"	ایک موجودہ آسامی پر
۸۸۶۲ ۲۸.۴.۵۲	م - محمد حسین قائم مقام امدد مدرس گورنمنٹ ہائی سکول [illegible]	قائم مقام امدد مدرس گورنمنٹ ہائی سکول بھکر - بمشاہرہ خود	۵ مئی ۱۹۵۲ء یا کسی بعد کی تاریخ سے	م - فتح محمد فتح کی جگہ جو سبکدوشی سے قبل رخصت دی گئی -

[illegible]	نام اور عہدہ	کس جگہ تقرری یا تبادلہ ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۸۸۶ ۲۸۔۴	م- فتح محمد فتح معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی سکول بھکر	معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی سکول حضرو	تاریخ حاضری سے	م- محمد حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
۹۵۲ ۲۱۔۵۔	م- فضل الرحمن بی۔اے بی۔ٹی ایک امیدوار	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول بھیرہ	؍؍	ایک موجودہ اسامی پر
۱۶۹۰ ۲۔۶۔	م- اشرف علی فاروقی بی اے بی ٹی ایک امیدوار	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب	؍؍	ایک موجودہ اسامی پر
۱۴۰۱ ۳۔۵۔	م- غلام نبی بٹ صدر معلم - گورنمنٹ نارمل سکول پسرور	صدر معلم گورنمنٹ نارمل سکول لالہ موسےٰ بمشاہرہ خود	؍؍	م- عبدالمجید ملک کی جگہ جن کا تبادلہ بطور ڈی آئی کیمبل پور ہو چکا ہے۔
؍؍	م- تاج الدین غوری صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول جھنگ	صدر معلم گورنمنٹ نارمل سکول پسرور- بمشاہرہ خود	؍؍	م- غلام نبی بٹ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
؍؍	م- فتح شیر خاں- صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول- مٹھہ ٹوانہ	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول جھنگ بمشاہرہ خود	؍؍	م- تاج الدین غوری کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
؍؍	م- اللہ یار خاں صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول پنڈ دادن خان	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول مٹھہ ٹوانہ بمشاہرہ خود	؍؍	م- فتح شیر خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
؍؍	م- الطاف علی خاں اے۔ڈی	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول	؍؍	م- اللہ یار خاں کی جگہ جن

نمبر اور تاریخ	نام اور عہدہ	کس جگہ تقرری یا تبادلہ ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
	گجرات	پنڈ دادن خاں بمشاہرہ خود	〃	کا تبادلہ ہو چکا ہے
۱۴۱۰۵۰ ۳.۵.۵۲	م - رحیم بخش خاں صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازی خاں	صدر معلم گورنمنٹ نارمل سکول چنیوٹ بمشاہرہ خود	〃	ایک نئی آسامی پر
〃	م - امام بخش خاں اے - ڈی آئی ملتان	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازی خاں بمشاہرہ خود	〃	م - رحیم بخش خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
〃	س - علی اکبر شاہ اے - ڈی آئی جھنگ	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول شورکوٹ بمشاہرہ خود	〃	چ - کرم الٰہی کی جگہ جو بطور ڈی آئی - ڈیرہ غازی خاں تبدیل ہو چکے ہیں -
〃	م - عبد القیوم معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول سیالکوٹ	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول تلہ گنگ بمشاہرہ خود	〃	م - فضل کریم خالد کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں
〃	م - غلام نبی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول سیالکوٹ	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول حضرو بمشاہرہ خود	〃	م - محمد یوسف علی خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے -
〃	م - محمد صدیق صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول نوشہرہ	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول رینالہ خورد - بمشاہرہ خود	〃	م - خورشید احمد خاں کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں -

نمبر اور تاریخ	نام اور عہدہ	کس جگہ تقرری یا تبادلہ ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۱۳۰۱۵ ۳.۵.۵۱	س۔عبدالخالق سیکنڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول ۔ پنڈی بھٹیاں	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول نوشہرہ بمشاہرہ خود۔	"	م۔محمد صدیق کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے۔
۲۹۳۹ ۱.۵.۵۱	م۔محمد شمیم جن کی تقرری کے احکام گورنمنٹ ہائی سکول حضرو کے لئے ہوچکے تھے۔	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول مری	"	م۔عبدالرحیم کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے

صیغہ سکول۔شعبہ نساء

نمبر اور تاریخ	نام اور عہدہ	کس جگہ تقرری یا تبادلہ ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۱۵۶۴۷ ۳.۵.۵۱	مس م۔کمال الدین مددگار معلمہ وکٹوریہ گرلز ہائی سکول لاہور	مددگار معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول فیروزپور روڈ۔ لاہور	تاریخ حاضری سے	اپنی آسامی ساتھ لے جائیں گی
"	مس مسرت جلال الدین مددگار معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول فیروزپور روڈ۔	مددگار معلمہ وکٹوریہ گرلز ہائی سکول لاہور بمشاہرہ خود۔	"	" " "
"	مس زبیدہ کچلو قائم مقام مددگار معلمہ لیڈی میکلیگن سکول لاہور	قائم مقام مددگار معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول۔چونے منڈی لاہور	"	مس ثریا مرزا کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے۔
"	مس ثریا مرزا۔ مددگار معلمہ گورنمنٹ	مددگار معلمہ لیڈی میکلیگن سکول لاہور	"	مس زبیدہ کچلو کی جگہ جن کا تبادلہ

نمبر اور تاریخ	نام اور عہدہ	کس جگہ تقرری یا تبادلہ ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
	گرلز ہائی سکول جونیئر ڈیپارٹمنٹ لاہور	بمشاہرہ خود		ہوچکا ہے
۱۵۶۴۸ ۲۰.۵.۵	مسز الیف نذیر - مددگار معلمہ لیڈی میکلیگن سکول لاہور	لیکچرار کوئین میری کالج لاہور بمشاہرہ خود	تاریخ حاضری سے	مس زبیدہ حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے
"	مس زبیدہ حسین مددگار معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول باغبانپورہ	لیکچرار کوئین میری کالج لاہور بمشاہرہ خود	"	مس صداقت جہاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے
"	مس صداقت جہاں لیکچرار کوئین میری کالج لاہور	مددگار معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول کیمبلپور - بمشاہرہ	"	مس ممتاز قریشی کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے
۱۵۶۴۵ ۲۰.۵.۵۱	مس بلقیس حبیب اللہ مددگار معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول گجرات	مددگار معلمہ گورنمنٹ ہائی سکول جلال پور جٹاں	"	ایک نئی آسامی پر
"	مس ظاہر اختر قائم مقام مددگار معلمہ گورنمنٹ گرلز نارمل سکول کمالیہ	قائمقام مددگار معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول - گجرات	"	مس بلقیس حبیب اللہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے
"	مسماۃ ثروت آرا - بی - اے بی - ٹی ایک امیدوار	قائمقام مددگار معلمہ گورنمنٹ گرلز نارمل سکول کمالیہ	"	مس ظاہر اختر کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے -
۱۵۴۷۹ ۱۹.۵.۵۱	مسماۃ خورشید بیگم اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول گجرات	اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز اینڈ نارمل سکول پسرور	"	مسماۃ منزل کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے -

نمبر اور تاریخ	نام اور عہدہ	کس جگہ تقرری یا تبادلہ ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۱۴۹۱۷ ۱۲.۵.۵۲	مسماۃ ارشاد بیگم ایس ڈی	قائم مقام اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اینڈ نارمل سکول۔ منٹگمری	〃	ایک نئی اسامی پر
۱۴۳۷۲ ۷.۵.۵۲	مسز صفیہ امانت اللہ اسسٹنٹ انسپکٹرس آف سکولز برائے گھریلو سائنس راولپنڈی	پی۔ای۔ایس درجہ دوم سے درجہ اول میں ترقی پاکر راولپنڈی ڈویژن کی انسپکٹرس مقرر ہوئی	۲۹ ۴/۵۱ سے ۶ ۹/۵۱ تک	مسز صدیقی کی جگہ جنہیں رخصت دی گئی۔
۱۴۳۰۱ ۷.۵.۵۲	مسماۃ حمیدہ بیگم اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اینڈ نارمل سکول منٹگمری	اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اینڈ نارمل سکول جہلم	تاریخ حاضری سے	مسماۃ صغریٰ بیگم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
〃	مسماۃ صغریٰ بیگم اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اینڈ نارمل سکول جہلم	اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اینڈ نارمل سکول منٹگمری	〃	مسماۃ حمیدہ بیگم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
۱۴۲۸۵ ۶.۵.۵۲	مس نور بانو قائم مقام مددگار معلمہ گورنمنٹ گرلز نارمل سکول کمالیہ	قائم مقام مددگار معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول۔حافظ آباد بمشاہرہ خود	تاریخ حاضری سے	اپنی آسامی ساتھ لے جائیں گی۔
〃	مس تاج ابراہیم مددگار معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اینڈ نارمل سکول مظفر گڑھ	مددگار معلمہ گورنمنٹ گرلز نارمل سکول کمالیہ بمشاہرہ خود	〃	اپنی آسامی ساتھ لے جائیں گی

نمبر اور تاریخ	نام اور عہدہ	کس جگہ تقرری یا تبادلہ ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۱۴۲۵۷ ۶.۵.۵	مسماۃ الطاف بیگم قائم مقام اُردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول خوشاب	قائم مقام اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اینڈ نارمل سکول مظفرگڑھ بمشاہرہ خود	تاریخ حاضری سے	اپنی آسامی سابقہ لے جائیں گی۔
؍؍	مس ناہید اقبال بی۔اے بی۔ٹی ایک امیدوار	مددگار معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول خوشاب ۱۳۰/۲۵۰ کے گریڈ میں	؍؍	ایک نئی آسامی پر جو حافظ آباد کے لئے منظور کی گئی تھی۔
۱۸۴۶ - ۷ ۱.۵.۵	مسماۃ نذیر بیگم صدیقی اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول گوجرہ	اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول لائل پور بمشاہرہ خود	؍؍	مسماۃ مقرب بیگم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
؍؍	مسماۃ مقرب بیگم اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول لائل پور	اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول چیچاوطنی بمشاہرہ خود	؍؍	مسماۃ فیض الٰہی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
؍؍	مسماۃ فیض الٰہی قائم مقام اُردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول چیچاوطنی	قائم مقام اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول پاک پٹن بمشاہرہ خود	؍؍	مسماۃ رسول بیگم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
؍؍	مسماۃ رسول بیگم اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول پاک پٹن	اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول گوجرہ بمشاہرہ خود	؍؍	مسماۃ نذیر بیگم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
؍؍	مسماۃ حمید الدین قائم مقام اُردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اینڈ نارمل سکول جھنگ	قائم مقام اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول ٹوبہ ٹیک سنگھ بمشاہرہ خود	؍؍	مسماۃ محمد بی بی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔

نمبر اور تاریخ	نام اور عہدہ	کس جگہ تقرری یا تبادلہ ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
E-۱۸۴۶ ۱.۵.۵۲	مسماۃ محمد بی بی گورنمنٹ گرلز سکول ڈوبر ٹیک سنگھ	اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اینڈ نارمل سکول جھنگ -	تاریخ حاضری سے	مسماۃ حمیداالدین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
۱۲۷۵۸ ۱.۵.۵۲	مسز جی آر بیگ اُردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول گجرات	اُردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اینڈ نارمل سکول منٹگمری	"	اپنی آسامی ساتھ لے جائیں گی ۔

شمارہ ۶] لاهور [ستمبر ۱۹۵۲ء

اس شمارہ میں

مدیر : بشیر ہاشمی

معاونین : عبدالغفور چوہدری

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

ستمبر ۱۹۵۲ء

جلد — ۵

شمارہ — ۶

سالانہ چندہ

پاکستان کیلئے ۶ روپے

غیر ممالک کیلئے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز:—

یونیورسٹی بک ایجنسی ۲- کچہری روڈ لاہور

ایک ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کر یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا۔

دگر از سر گرفتم رشتۂ زلفِ پریشاں را

اِمتحانات کے نتائج

آج سے پانچ ہزار سال پہلے کا مصری معلم اپنے شاگردوں کو ہر صبح ان الفاظ میں خطاب کیا کرتا تھا۔

"اپنا کام آج ہی شروع کرو اور اس عزم سے شروع کرو کہ یہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہے شاید تمہیں آج ہی کمال حاصل ہو جائے"

ان الفاظ میں آج بھی وہی تر و تازگی باقی ہے اور ان کی بھینی بھینی خوشبو معلم کے اس اعتماد کو ظاہر کرتی ہے اور اعتماد بھی کیسا، مکمل اعتماد جو اسے ہمیشہ اپنے شاگرد پر ہوتا ہے۔

اب تعلیم گاہیں تعطیلات کے بعد دوبارہ کھل رہی ہیں اور تعلیمی زندگی کے نئے سال کا آغاز ہو رہا ہے تو یہی الفاظ اپنی پوری شدت اور تندہی کے ساتھ ہمارے دل و دماغ میں ابھرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات کے نتائج شائع ہوئے تو اس سال بھی حسب معمول لوگوں کے ماتھوں پر شکنیں پڑیں۔ غیظ و غضب کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھی اور پھر تو وہ طوفان اٹھا کہ کان پڑی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی، اس شور و غوغا میں اگر کچھ آوازیں سارا الزام اساتذہ پر دھرتی ہیں تو کچھ طلبہ پر اور بعض یونیورسٹی۔ نظام امتحانات، نصاب تعلیم اور نظام تعلیم پر لے دے کرتی سنائی دیتی ہیں، اور بعض حضرات کا تو یہ خیال ہے کہ مختلف المزاج اور مختلف ذہنی صلاحیتوں کے طلبہ کا ہجوم امتحانات کے معیار کے گرنے کا سبب ہے ہمارے مدارس میں تو یقیناً یہی صورت حال ہے۔ لیکن مفصل کالجوں میں طلبہ کی تعداد نسبتاً کم ہوتی ہے۔ یہاں یہ بیان کر دینا غالباً بے جا نہ ہوگا کہ جنگ عظیم دوم کے بعد برطانوی یونیورسٹیوں میں طلبہ کی تعداد ماقبل جنگ کی

تعداد سے کم و بیش دوگنی ہو گئی ہے۔ لیکن ان کا تعلیمی معیار قدرے اور اونچا ہو گیا ہے اور انہوں نے تعلیمی معیار کو کسی صورت میں بھی غیر متوازن نہیں ہونے دیا۔

کچھ دنوں کے بعد یہ ہنگامہ ختم ہو جاتا ہے اور پھر سال بھر یہ مسئلہ کسی پریشانی کا موجب دکھائی نہیں دیتا گویا تعلیمی معیار کا تنزل ایک افسوسناک قومی حادثہ ہے جس کے سوگ میں ہر سال چند آنسو بہانے ضروری ہیں اور بس اس میں کلام نہیں کہ اگر نتائج کا فیصدی تناسب تعلیمی حالت کی آئینہ داری کر سکتا ہے تو ہمیں اپنی تعلیمی زندگی کی صحت مندی کی فکر کرنی چاہیئے۔ کوئی ہوشمند شخص یہ توقع نہیں کر سکتا کہ جامعہ کے امتحانوں میں جس قدر امیدوار شریک ہوں وہ سب کے سب کامیاب ہو جائیں۔ آخر جامعہ کے لئے ضروری ہے کہ کچھ معیاروں کو ہر قیمت پر قائم رکھے۔ ورنہ اس کا وجود ہی سرے سے بیکار ہو جائے گا۔ جو امیدوار باوجود پوری کوشش کے ان معیاروں پر پورے نہ اتریں انہیں ناکام قرار دینا کسی معنی میں بھی قومی مفاد کے منافی نہیں بلکہ اس کے لئے مفید ہے۔ ہاں اگر امیدواروں نے جی لگا کر کام نہیں کیا یا ان کی مناسب راہنمائی نہیں کی گئی یا ان کی تعلیم کا مناسب بندوبست کئے بغیر ہی انہیں امتحانات کی چھلنی میں سے گذارا گیا ہے تو اس صورت میں قومی دولت اور توانائی یقیناً بلا وجہ ضائع ہوئی ہے۔ اور اس اتلاف کا فوری تدارک ضروری ہے۔

ہمیں اعتراف ہے کہ اس سال یا پچھلے سالوں میں امیدواروں کی جو بھاری تعداد جامعی امتحانوں میں ناکام رہی اس کی وجہ یہ نہیں کہ جامعہ کے معیار ناروا طور پر بلند کر دیئے گئے ہیں، بلکہ وجہ صرف یہ ہے کہ یہ امیدوار اپنے اندر وہ استعداد پیدا نہ کر سکے جو وہ صحیح طریق اور معقول رفتار پر کام کرنے سے پیدا کر سکتے تھے لیکن ایسا کیوں ہوا۔ اور اس افسوسناک صورت حال کا خاتمہ کیونکر ہو؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب ہنگامی تلخی کے تحت ایک دوسرے پر الزام دھرنے سے نہیں دیا جا سکتا۔ اس مشکل مسئلے کا تسلی بخش حل اسی صورت میں ممکن ہے کہ طلبہ اساتذہ۔ والدین۔ جامعہ اور منتظمان تعلیم غرضیکہ تمام متعلقہ جماعتیں اپنے اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور خود بری الذمہ ہونے کی کوشش کرنے کی بجائے تمام اعتراضات کو اور پھر افہام و تفہیم کی فضا میں باہم بیٹھ کر اصلاح حال کے راستے تلاش کریں اور ان پر پورے عزم کے ساتھ گامزن ہوں۔ ورنہ وقتی شور و غوغا سے نہ پہلے کچھ فائدہ ہوا اور نہ آئندہ ہو گا۔

ہماری اجتماعی زندگی کی ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ مختلف مفاد باہم منظم نہیں مثلاً ہمارے ہاں کوئی ایسی جماعت موجود نہیں جو والدین کی طرف سے بات چیت کر کے یا ان کی طرف سے کسی ذمہ داری اٹھانے کا دعویٰ کر سکے۔ کم و بیش یہی حال اساتذہ اور طلبہ کا ہے۔ کیونکہ ان کے ہاں جو چند جماعتیں موجود ہیں انہوں نے تعلیمی مسائل کو آج تک اپنی جدوجہد کا مرکز کبھی نہیں بنایا۔ مختلف مفادوں کی عدم تنظیم اور اجتماعی روح کی اس کمی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ افراد اپنی اپنی دھن میں اپنی پسند کے راستوں پر چلے جاتے ہیں اور جب امیدوں کا خوبصورت محل دھڑام سے زمین پر آ گرتا ہے تو اپنی آنکھوں کا شہتیر دیکھنے کی بجائے دوسروں کی آنکھوں کے تنکے گننے لگتے ہیں۔

اجتماعی زندگی کا یہ انتشار تعلیمی زندگی میں بھی پوری طرح منعکس ہے۔ پہلے دن سے ہی تعلیم کا کوئی مقصد عموماً نہ والدین کے پیش نظر ہوتا ہے اور نہ بچے کے۔ ابتدائی جماعتوں تک تو خیر یہ بات ٹھیک ہے لیکن جب طالب علم آگے بڑھتا ہے اور اسے اختیاری مضامین کے انتخاب کی ضرورت پیش آتی ہے نصب العین کا یہ فقدان سخت نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ سینکڑوں طالب علم ایسے ہیں جو اپنی عمر عزیز کے کئی سال اور والدین کی محنت سے کمائی ہوئی دولت کالجوں میں محض اس لئے بے نتیجہ ضائع کرتے ہیں کہ مضامین لیتے وقت انہوں نے بلا سوچے سمجھے بعض دوستوں کی تقلید کی۔ یا کسی عام پسندگی کی ہوا میں بہ گئے۔ پھر بیشمار طالب علم ایسے بھی ہیں جو کالج کی آزاد فضا میں قدم دھرتے ہی باقاعدہ محنت کی عادات کو یک قلم ترک کر کے پہلے دن سے ہی ناکامی کی رنگین راہ اپنے لئے پسند کر لیتے ہیں! والدین جو بڑی امنگوں کے ساتھ نوجوان بیٹوں کو کالج میں بھیجتے ہیں اور ان پر پانی کی طرح روپیہ صرف کرتے ہیں۔ ان میں سے کتنے ایسے ہیں جنہوں نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہو کہ ان کا نور نظر اپنا وقت اور ان کا روپیہ کس مصرف میں لگا رہا ہے؟ پھر کالجوں میں پڑھانے والے معلمین میں کتنے ایسے ہیں جو یہ معلوم کرنے کی تکلیف بھی گوارا کرتے ہوں کہ ان کا لیکچر کتنے کانوں میں پڑا۔ اور اس کا اثر کتنی دیر باقی رہا؟ ان لوگوں میں سے کتنوں نے کبھی یہ دیکھنے کی زحمت گوارا کی کہ جو طلبہ کالج کے دار الاقامہ میں رہتے ہیں وہ اپنے اوقات کس طرح استعمال کر رہے ہیں۔ اور ان کی تعلیمی اور جسمانی ترقی کی کیا حالت ہے؟

طرح تعلیمی معیاروں کے تنزل کا مسئلہ اسقدر آسان نہیں کہ ممتحن کی دقت پسندی یا اس قسم کے دوسرے اسباب سے اس کی تسلی بخش توجیہہ ہو سکے، اس کے اسباب بہت سے ہیں جن میں سے ہر ایک کی جڑیں کئی کئی گوشوں میں پھیلی ہوئی ہیں، جب تک ان تمام اسباب کے وجود کو تسلیم کر کے ان کی بیخ کنی کے لیے ایک سرگرم مہم جاری نہیں کی جاتی اسوقت تک کوئی پائدار نتیجہ برآمد نہ ہوگا

مسئلے کے چند در چند پہلوؤں کا ذکر کرنے سے یہ مقصود نہیں کہ اس کا حل محال ہے. بلکہ صرف یہ جتلانا مطلوب ہے کہ اس کا حل معاشرے کے مختلف عناصر سے لمبی اور لگاتار محنت اور توجہ چاہتا ہے ہمارے ہاں یہ مسئلہ کوئی نیا نہیں دوسرے ملکوں کو بھی یہ دقت اپنی زندگی کے مختلف مرحلوں پر پیش آچکی ہے اور انہوں نے احتساب نفس اور محنت کے ذریعہ اس پر قابو پایا۔ ہمارے لئے بھی اس مشکل کا یہی حل ہے .یہ مسئلہ جس قدر الجھا ہوا ہے اسی قدر یہ ہماری قومی زندگی کی صحت مندی کے لئے اہم ہے۔ اس لئے اسے اوّلین توجہ ملنی چاہیئے۔ اگر ہم میں سے ہر شخص دوسروں کو ذمّہ دار گردا ننے کی بجائے اپنے فرض کو دیانتداری کے ساتھ پورا کرنے لگے تو یہ مشکل مسئلہ بہت جلد حل ہو جائے۔ اس ضمن میں ہم اساتذہ کو ان کا فرض یاد دلانا چاہتے ہیں۔ ہم میں سے ہر اُستاد کا یہ قومی اور اخلاقی فرض ہے کہ اس بات کا اچھی طرح یقین کر لے کہ کیا اس کا علم اور اس کی روزمرّہ کی فنّی تیاری ہر اعتبار سے معیاری ہے؟ کیا اس کے دل میں بچوں کی بہبود کے لئے ایک سچّا جذبہ موجزن ہے۔ اور کیا وہ ہر امکانی کوشش اس امر کے لئے وقف کر رہا ہے کہ قوم کے یہ نو نہال بہترین تربیت پائیں؟ یہاں اس نکتہ کی خصوصیت کے ساتھ وضاحت ہو جانی چاہیئے۔ کہ اگر خدانخواستہ معاشرے کے دوسرے عناصر اپنے فرض کو نہ بھی پہچانیں تو بھی اُستاد اپنے فرض سے بری الذمّہ نہیں ہو جاتا۔ اس صورت میں اس کا کام زیادہ دشوار ضرور ہو جائیگا لیکن اس سے گلو خلاصی نہ ہو سکے گی۔ استاد کے مقابلے میں دوسرے گروہوں کے فرائض نسبتًا ہلکے ہیں۔ بقول عارف رومؒ

ہر کہ را در عقل نقصاں اوفتاد

کار او فی الجملہ آساں اوفتاد

حادیثِ نبویؐ میں تعلیمی سفر کی اہمیت

—— عبدالغفور چودھری

اسلامی تعلیمات کے طلبا، علم کی تلاش میں دور دراز کا سفر اختیار کیا کرتے تھے اور زیادہ تر ان کا زادِ
ت سادہ اور مختصر ہوتا تھا۔ انکی سیر و سیاحت ترسٹام شانڈی ("TRISTAM SHANDY") کی بے فکری کی گشت
ں ہوتی تھی جو براعظم کے بہت ہی فیشن ایبل حصّوں میں گشت کیا کرتے ہیں، بلکہ اُن سو مہینوں کے پُرجوش اور
ہم طالب علم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو پیٹھ پر جھولی ڈال کر اور ہاتھ میں کاسہ لیکر مانگتا ہوا چل کھڑا ہوتا تھا۔
سچائی کی حقیقی تلاش صدیوں ایک مسلم طالب علم کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور وہ محض علم کی خاطر بہت ہی
ناک سفر کرنے کے لئے تیار رہتا تھا، ہرات و بلقان کے نوجوان آجکل بھی ہندوستان کے تعلیمی مرکزوں میں گرد
رد م آتے ہیں اور اب بھی طالبانِ حق کی ایسی جماعتیں نظر آتی ہیں جیسی چھ صدی پیشتر ابن بطوطہ کو ملی تھیں
فلازدہ علاقوں کو طے کرنے اور اُن راستوں سے گذرتے ہیں جہاں آدم خوروں کے علاوہ اور کوئی نہیں بستا۔

تلاشِ علم میں سفر کی سنتِ حسنہ کا پتہ ارشادات نبویؐ سے چلتا ہے، جہاں آپ نے مسلمانوں کو
بار تلاشِ علم کا حکم دیا ہے، اور تمام مسلمانوں کو خواہ وہ مرد ہوں یا عورت تلاشِ علم کی مجاہدانہ زندگی اختیار
نے کا حکم دیا گیا ہے، یہاں تک کہ چاہے چین ہی کا سفر کیوں نہ کرنا پڑے، اس حدیث میں خاص طور پر دنیاوی
م کی طرف اشارہ ہے اس لئے کہ ابتدا میں چین اپنی صنعت و حرفت میں بہت مشہور تھا۔

ایک حدیث میں آنحضرتؐ اپنے مخصوص دل آویز انداز میں اُس وعدہ کا بیان فرماتے ہیں جو طالبانِ علم سے کیا
ہ "اللہ تعالےٰ ایسے شخص کیلئے جنت کے راستوں میں سے ایک راستہ کھول دیتا ہے جہاں فرشتے طالب علم کی رضا میں
، پر بچھا دیتے ہیں اور تمام چیزیں خواہ وہ آسمان میں ہوں یا زمین پر اسکی نجات چاہتی ہیں یہاں تک کہ مچھلی پانی میں"

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جو طلب علم میں سفر کرتا ہے اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو خدا کی راہ طے کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ واپس آ جائے، مزید یہ کہ اللہ تعالےٰ اس شخص کیلئے جو علم کی راہ اختیار کرتا ہے جنت کی راہوں میں سے ایک راہ آسان کر دیتا ہے"۔

ایک بار ایک ضعیف صحابی انتہائی جسمانی ضعف و درماندگی کی حالت میں لڑکھڑاتے ہوئے آنحضرتؐ کو دیکھنے کے لئے حاضر ہوئے، آپؐ اس عمر میں حصول علم کا یہ جذبہ دیکھکر بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ "جس درخت کے قریب سے گذرے یا جس پتھر یا جس مٹی پر پاؤں رکھا اس نے ان کی نجات کے لئے دعائیں مانگیں"

یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ اسلامی نظریہ کے مطابق نہ صرف ماحول بلکہ تمام کائنات پوشیدہ طور پر تعلیمی مشغلہ میں مصروف ہے اور انسانی شخصیت کی اخلاقی حالت کی تعمیر میں منہمک ہے۔ تعلیمی مشغلہ کوئی معمولی معاملہ نہیں جو اسکول کی چاردیواری تک محدود ہو، بلکہ ماحول کے اثرات بھی اس میں کارفرما نظر آتے ہیں۔

اس زمانہ میں بھی جب کہ تعلیم سے مراد کتابوں سے پڑھ کر کوئی چیز نہ تھی اور جب کہ تعلیمی حلقہ میں بھی حرکت کو نمایاں جگہ حاصل تھی، سفر کی بہت قدر و منزلت تھی جو اپنے ساتھ جسمانی و انسانی تجربہ لاتا ہے قابل حصول مواد و ذخیرہ کا مطبوعہ شکل میں شائع ہو کر آسانی ہر جگہ پہونچنے کے سامان نہ ہونے کی وجہ سے اس زمانہ میں سفر کی بہت ہی اہمیت تھی، مالک بن دینار کی روایت کے مطابق اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰ سے کہلا بھیجا کہ اگر ان کا ارادہ طلب علم میں روانہ ہونیکا ہے تو لوہے کے جوتے بنوالیں اور آہنی عصا لے کر اس وقت تک چلتے رہیں جب تک کہ جوتے کے پرزے پرزے نہ اڑ جائیں اور عصا ریزہ ریزہ ہو کر خاک نہ بنجائے۔

غزالی کے مطابق اگر ایک شخص شام سے لیکر یمن تک کا پورا راستہ ایک دانائی کے لفظ کیلئے طے کرتا ہے تو اس کی کوشش بے بدلہ نہ ہوگی اور اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے ایک حدیث سننے کی خاطر گاؤں گاؤں کے سفر کئے اور ایسی مثالیں بھی کم نہیں ہیں جب لوگوں نے محض ایک حدیث کی خاطر رات دن پاپیادہ سفر کئے۔

جابر بن عبداللہ کے متعلق روایت ہے کہ جب انہوں نے سنا کہ شام میں ایک محدث آنحضرتؐ کی ایک نایاب حدیث بیان کرتا ہے تو فوراً اونٹ لیکر صحرائے شام کے ایک دشوار گذار راستے کو طے کرنے چل پڑے۔

ان سفروں کی کثرت کا ایک بڑا سبب تھا اور یہ علماء کا احادیث کی صحت و تصدیق کی بابت تردد تھا کسی

شخص سے اس حدیث کا استفادہ جسے وہ خود بیان کرتا ہو بیت قابلِ تعریف سمجھا جاتا تھا۔ ابن عباس ایسے لوگوں کو اپنے پاس بلا سکتے تھے مگر جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں کہ وہ پورے دوپہر ان کی دہلیز پر صرف کر دیں گے۔ اگرچہ وہ اندر بھی داخل ہو سکتے ہیں مگر وہ اصول کے خلاف ایسا اقدام پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ کوئی خدمتگارانہ جذبہ نہ تھا جس نے انہیں اس پر آمادہ کیا بلکہ یہ ان کا وہ گہرا شغف ہے جو ان میں سلسلۂ اسناد کے متعلق تھا۔

ذہانت کی جانچ

ڈاکٹر بلارڈ کے قول کے مطابق برطانوی پریس ذہنی جانچوں کا اس طرح حوالہ دیتا ہے گویا وہ امریکہ والوں کی ایجاد کردہ کوئی نئی چیزیں ہیں، لیکن درحقیقت نہ تو وہ نئی ہیں اور نہ امریکہ کی پیدا کردہ۔ وہ ابتدائے تاریخ سے نسلِ انسانی کا مشترکہ سرمایہ رہی ہیں وہ بڑے دن کی اُن پہیلیوں سے زیادہ پُراسرار نہیں ہیں جو بچوں کو بہلانے کے لئے کہی جاتی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بارہا صحابہؓ کے سامنے معمے اور پہیلیاں پیش کر کے اُن کی ذہانت و طباعی کی جانچ کرتے نوعمر اشخاص بھی اکثر مجلسوں میں شرکت کرتے تھے اور ایک بار تو مجلس کے ایک نوعمر رکن ہی نے اس عقلی مقابلہ میں کامیابی حاصل کی۔ یہ مواقع یقیناً تمام لوگوں کیلئے طبعی ذہانت و ذکاوت کی بہترین مشق بہم پہونچاتے ہوں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک بار آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ ایک درخت ہے جس میں کبھی پت جھڑ نہیں ہوتی اور مسلمان کی تشبیہ اسی سے دی جاسکتی ہے۔ بتاؤ کہ اس درخت کا نام کیا ہے؟" عبداللہ کا بیان ہے کہ کچھ لوگوں نے اُسے وادی کا ایک خاص درخت بتایا لیکن میرے دل میں یک بیک خیال ہوا کہ اسے کھجور کا ہی درخت ہونا چاہیئے۔ مگر مجھے ہچکچاہٹ ہوئی (اور میں نے حل کا اظہار نہ کیا) تب لوگوں نے آنحضرت صلعم سے دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔ عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے اس واقعہ کو عمرؓ بن الخطاب سے بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ اگر تم نے حل بتایا ہوتا تو پہلے سے زیادہ محبت کے مستحق ہوتے۔

پہیلیاں (لُغز) اس زمانہ کی تہذیب و سوسائٹی میں بھی عام تھیں اور آنحضرتؐ بھی بارہا دورانِ گفتگو میں اُن کا استعمال کرتے تھے، عام طور پر ان میں ایک اخلاقی صداقت بجھائی جاتی تھی اور اس کیلئے نہ صرف اعلیٰ قسم کی طبعی ذہانت کی ضرورت ہوتی تھی بلکہ صنائع و بدائع اور عربی زبان کے فقروں کے معمولی تغیرات کا علم بھی ضروری ہوتا تھا۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے ایک بار فرمایا کہ دو رحمتوں میں لوگ خیانت کرتے ہیں صحت اور دولت، آپ نے لفظ خیانت کہہ کر تعجب اور پیچیدگی پیدا کر دی

قسط ۲

ثانوی تعلیم کا تاریخی پس منظر

محمد عبد العزیز ———

یونان میں تعلیم

ابتدائی اور ثانوی مدارس کے امتیاز کا نظریہ سب سے پہلے یونانیوں میں پیدا ہوا۔ پرانی یونانی تعلیم جو تعلیم کی دوسری تاریخی ترقیوں کی طرح بالعموم تربیتِ اطوار پر مشتمل تھی، اور اس سیدھے سادے سماج میں جہاں تکلفات کی رنگ آمیزی کی جھلک نمایاں نہیں تھی تربیتِ اطوار کا انصرام اسی لیے ضروری سمجھا گیا اور انسانی کردار کے اس پہلو کو سب سے زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی جس میں طاقت و توانائی، تحمل و ضبط، جرأت، دلیری اور قوتِ فیصلہ بچے میں تخلیقی صلاحیتیں پیدا کر سکیں اور جب تک ان مدارس کا مطمح نظر تربیتِ اطوار رہا تعلیم نظری نہیں عملی رہی اور ان مقاصد کے حصول کے لیے اس دور میں ورزش اور موسیقی کو تعلیمی طریق کار خیال کیا گیا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ وہ قوم جس نے آگے چل کر علم و حکمت کی ایسی محفل سجائی کہ اس کے بادہ آشام کچھ اس انداز میں جھومتے ہوئے اٹھے کہ یورپ اور ایشیا کے ادارہائے فکر میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کر دیا۔ شروع میں ادبی اور لسانی تربیت کی طرف بہت کم توجہ دیتی تھی دیکھیے کہ ان کی ترقی کے ابتدائی ایام میں ادبی لسانی یا کلچرل نظامِ تعلیم کا کہیں تو جھلکتا نظر نہیں آتا۔ اور اگر کہیں کہیں اس کی جھلک نمایاں بھی ہو جاتی ہے تو اسے ہم سنگِ میل کا درجہ نہیں دے سکتے۔ افلاطون نے اسی عہد کے متعلق لکھا ہے کہ :-

> "تعلیم کی دو شاخیں ہیں ایک ورزش جس کا تعلق جسمانی تربیت سے ہے اور
> دوسری موسیقی جس کا مقصد روحانی تربیت ہے۔"

بقول پروفیسر کینڈل چودہ سال کی عمر تک یونانی اپنے بچوں کی تربیت کے سلسلے میں تعلیم حروف موسیقی اور ورزش

یونانی زعمد پیتے تھے" اور یہی مضامین ان کے مدارس میں ابتدائی تدریس کی جان ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں تھوڑا بہت حساب اور آئینِ حکومت سے بھی روشناس کیا جاتا تھا مصوری اور نقاشی ابھی ترقی کی اُن منازل کو طے نہیں کرسکی تھیں کہ انہیں نصابِ تعلیم میں کوئی خاص مقام حاصل ہو سکتا لیکن آگے چل کر جب دیہاتی اجتماعی شعور میں پختگی پیدا ہوتی گئی تو چوتھی صدی ق م میں یونانیوں نے اس میں اس قدر شغف پیدا کیا اور اس میں ایسی باریکیاں پیدا کیں کہ یونانی آرٹ اور یونانی صناعی کو بقائے دوام حاصل ہو گئی، یہاں تک کہ ان کی فن کارانہ حیثیت آج بھی مسلّم ہے تفہیمِ حروف اور موسیقی کی تدریس و تربیت گھر پر اسکول اور موسیقی کی تعلیم سماع خانوں میں ہفت تار کی دھن کے ساتھ دی جاتی تھی اور جسمانی تربیت کے لئے بازی گاہوں اور ورزش گاہوں (PAIDOTRIBES AND PALAESTRAY) کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس طرح یونانیوں نے اپنے عروج کے ابتدائی زمانوں میں اپنے بچوں کی ہمہ گیر نشو و نما کے لئے تفہیمِ حروف، موسیقی اور ورزش کی تعلیم کو ضروری سمجھا۔ پروفیسر صاحب موصوف نے "تاریخِ ثانوی تعلیم" میں افلاطون کا ایک اقتباس پیش کیا ہے۔ یہ اقتباس یونانیوں کی ابتدائی تعلیم پر اچھی خاصی روشنی ڈالتا ہے

> تقریباً سات سال کی عمر میں والدین بچے کو معلم کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ اور موسیقی یا لکھنے پڑھنے سے کہیں زیادہ انہیں بچے کے اطوار و کردار کی اصلاح مقصود ہوتی ہے اور معلمین حسبِ ہدایت ان کی توقعات کو پورا کرتے ہیں اور جب بچہ حروف شناسی کی منزل سے آگے بڑھتا ہے اور عبارت کو سمجھنا شروع کر دیتا ہے (کیونکہ اس سے پہلے وہ محض گفتگو کو سمجھ سکتا تھا) تو گھر میں بھی اُسے ان مشہور و معروف شعراء کے کلام کو پڑھنے کے لئے کہا جاتا ہے جنہیں وہ مدرسے میں پڑھتا ہے۔ ان میں کچھ پند و نصائح ہوتے ہیں کچھ کہانیاں ہوتی ہیں اور کچھ بزرگان سلف کی مدح میں تعریفی کلمات۔ اور بچے سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ انہیں زبانی یاد کرے۔ اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچہ ان کی تقلید کرے یا اُن کی ہمسری کرے اور اُنہی جیسا بننے کی کوشش کرے۔ اس طرح موسیقی کے معلمین بھی یہ یقینی بنا دیتے تھے کہ ان کے چھوٹے چھوٹے شاگرد میانہ روی اور اعتدال پسندی سے انحراف نہ کریں اور کسی شرارت میں شریک نہ ہوں اور جب وہ انہیں

> [illegible] استعمال سکھا دیتے ہیں تو پھر انہیں دوسرے غزل گو شعراء کے کلام سے متعارف کیا جاتا ہے [illegible] انہیں چنگ و رباب کے زیر و بم سے ساز کر لیتے ہیں اور اپنے سُروں کے اتار چڑھاؤ اور [illegible] کی لَے میں بچوں کے مزاج و آہنگ میں مطابقت پیدا کر دیتے ہیں تاکہ وہ اور زیادہ نرم رَو، ہم آہنگ اور مترنم ہونے کی سعی کریں، گفتگو اور عمل کے لئے اُن میں زیادہ موزونیت اور مناسبت پیدا ہو کیونکہ زندگی کے ہر شعبے میں ہم آہنگی اور لطافت کی ضرورت ہوتی ہے، اِس کے بعد وہ بچے کو معلم ورزش کے سپرد کر دیتے ہیں تاکہ ان کے جسم ایک اچھے اور توانا ذہن کو تربیت دے سکیں اور جسمانی کمزوریوں کی وجہ سے اُن میں بوقت جنگ یا کسی اور موقع پر بزدلی اور بے ہمتی نہ پیدا ہو جائے یہ طریق کار ان کے لئے ہے جن کے پاس ذرائع ہیں اور ذرائع امیروں کے پاس ہوتے ہیں، ان کے بچے تعلیم جلد شروع کر دیتے ہیں اور دیر میں ختم کرتے ہیں، جب وہ معلّمین سے استفادہ کر لیتے ہیں تو حکومت انہیں قانون کے مطالعہ کے لئے مجبور کرتی ہے اور اپنے خیالات و رجحانات کے مطابق نہیں بلکہ اُنہی آئین و ضوابط کے مطابق اُنہیں زندگی گذارنے کا سلیقہ سکھایا جاتا ہے۔"

افلاطون کی اس تحریر سے یونانی نقطۂ نگاہ کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اس پس منظر پر ایک نگاہ ڈالنے سے اس کے احاطۂ کار کی حد بندی کی جا سکتی ہے، اور اِس نظامِ تعلیم کے پرتو کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے، جو آگے چل کر یونانیوں کی تعلیمی زندگی کا مرکزِ خیال بن گیا۔ ابتدائی مدرسی مدارج اور اٹھارہ سال کے درمیانی زمانے کو بلوغت کا زمانہ کہا جا سکتا ہے جب بچہ حروف شناسی اور تفہیم حروف کی منزل سے گذر کر علم و ادب کے دشوار گذار راستوں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور مشکل پسندی اور تسخیر فطرت کا جذبہ اس کے عزائم کو آمادۂ کار کرتا نظر آتا ہے۔ عضویاتی اور نفسیاتی تبدیلیاں ایک نئے دَور کے آغاز کی نقیب بن کر سامنے آتی ہیں تو یونانی اپنے بچوں کو فنِ حرب، آدابِ شجاعت اور جسمانی تربیت کے پیچ در پیچ راستوں سے گذار کر آنیوالی ذمہ داریوں کا اہل بنا دیتے تھے، اس میں امیر مفلس بانکے، طرح دار، سادہ مزاج اور نادار سبھی حصہ لیتے تھے۔ امیروں کے بچے بالعموم کسی نہ کسی پیشہ کی تیاری میں بھی مصروف رہتے، وہ اپنی تعلیم کو آدابِ حرب، فن تیر زنی پر ہی ختم نہیں کرتے تھے، بلکہ معیشت کے اور معدود

کی طرف اپنے رجحانات کو منعطف کر کے اپنے لئے ایک نئی دنیا اور ایک نیا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور
اسی سلامت روی میں زندگی کی بہت سی دشواریوں کا حل بھی موجود ہوتا تھا۔

ایک حد تک یہ صحیح بھی ہے کہ ان ابتدائی مدارس سے ہی ثانوی تعلیم کی ابتدا ہوئی ہوگی اور اعلیٰ جماعتیں
جو ان مدارس سے متعلق ہوتی تھیں انہوں نے اس پورے نظام کے لئے بنیادی پتھر کا کام دیا ہوگا لیکن نئی تعلیم اور علم کی
ترویج کا حقیقی کام اُسوقت شروع ہوا جب نئے معلمین نئے نظریات اور نئے خیالات سے سرشار ہو کر ایک نئے نظام
کی بنیاد ڈالنے میں کامیاب ہوئے، اس نئے دور کی ذہنی ترقی میں تین عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔ اول یہ کہ ایتھنز
پوری دنیائے یونان کا سیاسی اور سماجی مرکز بن گیا۔ علم و حکمت کے سرچشمے یہیں سے پھوٹے، طاقت اور آمریت کی
گھٹائیں یہیں سے اُٹھیں، نئے نظریات اور رجحانات کی تبلیغ کا آغاز یہیں سے ہوا۔ دوم انفرادی طاقت اور آرزوئے
امتیاز۔ سوم سوفسطائیوں کی کامیابی، اس زمانے میں لوگوں کا عام رجحان سیاسی اور اخلاقی مسائل کی طرف تھا۔ لیکن
پھر بھی معلمین کی تگ و دو اور ان کی کاوشوں نے تعلیمی نظام میں وسعت اور خیالات میں ایک عام انقلاب پیدا کیا
یہاں تک کہ سپہ سالار اور پیادہ دستوں کے سردار و معتمد۔ بہ کار امرا، دیہی شرفا، اولوالعزم یا خستہ خوردہ مبصرین سیاست
سقراط کے پاس آتے اور اس سے اپنے اپنے مذاق اور اپنی اپنی ضروریات کے مطابق گفتگو کرتے، اور یہ مجموعہ معلومات
ان کے دل و دماغ کو روشنی اور زندگی بخشتا اور یہ خوش خوش اپنے گھروں کو واپس جاتے۔ یہ اساتذہ فن بجائے خود ایک
جامعی حیثیت کے مالک ہوتے تھے اور علم و حکمت کے ہر پہلو پر ایک سیر حاصل بحث کر سکتے تھے۔

اس کے بعد ایک ایسا دور آیا جب یونانی سماج میں خطیبوں (ORATORS) کے مراتب کو زیادہ سے زیادہ بلند
کرنے کی کوشش کی گئی تو پھر خطیب اور معلم سماج کی آنکھوں کا تارا بن گئے، اخبارات اور نشر و اشاعت کے دوسرے وسائل
کی عدم موجودگی میں مناظرے، مکالمے اور مباحثے کسی شخص کو مطلق دوڑ میں بہت آگے لے جا سکتے تھے، لوگ بازاروں میں
اور کسی دوسرے عملی مقام پر جمع ہوتے تو بحث و تمحیص کا سلسلہ ہوتا معرکہ آرائیاں ہوتیں، علم و ادب کے جواہر پاروں
کی ارزانی ہوتی، اس طرح اونچے اونچے سیاسی عہدے اور اہم کلیدی آسامیاں اُنہی لوگوں کے لئے مخصوص ہوتیں جن کی
زبان میں طاقت ہوتی اور جو اپنی نرم و گرم اور تلخ و شیریں گفتگو سے عوام کو مسحور کر سکتے، چنانچہ خطابت ذہانت و فطانت
سماج میں ایک اونچا مقام حاصل کرنے کی ضمانت سمجھی جانے لگیں۔ خطابت کے لئے ہمیشہ ایک اچھے حافظے کی

[illegible] ہے۔ اس کے علاوہ خطیب کے لئے سامعین کا نباض ہونا ضروری ہے، وہ کیا کہنا چاہتا ہے کیا مجمع اس کی [illegible] سے اتفاق کرنے کو تیار ہے اُس کے مواد میں استدلالی عنصر غالب ہے یا نہیں؛

اس طرح دھیرے دھیرے ایک نظامِ نو کی بنیاد پڑی، اس نئے نظام کو ہم موجودہ ثانوی یا جامعی نظام کے پہلو بہ پہلو تو نہیں کھڑا کر سکتے البتہ یہ سچ ہے کہ اس میں وہ عوامل ضرور کارفرما تھے، جنہوں نے آگے چل کر تعلیم وتدریس کے شیش محل کی تعمیر میں چونا گارا کا کام دیا۔ اس نظامِ تعلیم میں چودہ سال سے چوبیس سال کی عمر کے طلباء کی تعلیم وتدریس اور ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا سامان موجود تھا۔ اور جو نظام سوفسطائیوں کے ہاتھ میں تھا اور اس میں جو نصاب طلباء کو پڑھایا جاتا تھا اس میں نیچرل سائنس ریاضی موسیقی علم بدیع ادب علم عروض وشاعری، اخلاقیات، سیاسیات اور منطق وفلسفہ شامل تھے، ان اداروں میں حصولِ تعلیم کے لئے نہ تو کسی ابتدائی تیاری کی ضرورت ہوتی تھی اور نہ طلباء کے لئے کسی عمر کی قید تھی، وہ ان مجالس میں شریک ہوتے علم وحکمت کی باتوں کو سنتے، مباحثوں میں حصہ لیتے اور اپنی فہم وفراست کو جلا دیتے رہتے لیکن چوتھی صدی مسیحی میں یہ توسیعی تقریریں اور یہ سفری ادارے ختم ہو گئے اور ان کی جگہ ایسے مدارس نے لے لی جو ایک مخصوص نصاب کے ماتحت مخصوص مقام اور ماحول پر علم وعرفاں کے سرچشمے بن گئے۔ اس طرح دو ادارہ ہائے فکر کی بنیاد پڑی، ایک وہ مدارس جن میں فلسفہ اور منطق کی تدریس کا زیادہ سے زیادہ اہتمام تھا اور دوسرے وہ مدارس جن میں علم بدیع اور معانی وبیان پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ ان دونوں اداروں کے متعلق آگے تفصیلی بحث آئے گی

بالعموم یونانی تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے یعنی پرانی یونانی تعلیم اور نئی یونانی تعلیم تاریخی عہد کے قبل یونان میں تعلیم زیادہ تر سماجی سیاسی، اخلاقی، ادبی اور فلسفیانہ تبدیلیوں کی رہین منت رہی، ان سب کے انفرادی اور اجتماعی اثرات کے تابع تعلیم بھی اپنی ابتدائی منازل طے کرتی رہی، ہومر (HOMER) کی رزمیہ نظمیں اور رزمیہ شجاعت کو ماقبل تاریخی اور تاریخی عہد کی تعلیم کی درمیانی کڑی سمجھنا چاہیئے۔ ہومر کی نظموں میں ولولہ، جوش اور تندی اور تیزی ہے، اس سے اس عہد کی معاشرتی اور سماجی ذہنی اور اخلاقی ساخت کا پتہ چلتا ہے، اور اس عہدِ شجاعت کے فوراً بعد پرانی یونانی تعلیم کے تاریخی عہد کا آغاز ہوتا ہے جس میں ایک طرف اسپارٹا (SPARTA) کی تہذیب اور دوسری طرف ایتھنز (ATHENS) کا تمدن دو مختلف شاہراہوں پر چلتے نظر آتے ہیں، زندگی کے مقاصد

معاشرتی پابندیاں اور اخلاقی قیود سیاسی ضوابط غرض ہر شعبۂ حیات کے عنوانوں کو ایک دوسرے سے ممیز کیا جا سکتا
ہے۔ نئی یونانی تعلیم اُن مذہبی عقائد، فلسفیانہ خیالات اور اخلاقی اقدار کی حامل نظر آتی ہے جو عہد پیریکلیز (AGE
OF PERICLES) اور اس کے ماقبل و مابعد کے جمہوری دور کی نمائندگی کرتی ہیں، یہ وہ زمانہ ہے جب نئے
رجحانات اور جدید نظریات اور نئے تعلیمی نظام کی بنیاد پڑی۔ نئی تعلیم کی دوسرے جزو کی ابتدا اسکندر مقدونی کی
فتوحات سے ہوتی ہے اور اس کا سلسلہ یونانی تہذیب و تمدن کے اس دور تک جاری رہتا ہے جب رومی تہذیب
اور رومی اقتدار نے پرانی تہذیب کے چراغ کی روشنی کو یکسر بجھا دیا، یہ دور یونانی تہذیب و تمدن اُن کی معاشرت
اور اُن کے فلسفیانہ افکار و خیالات کا نصف النہار کہا جا سکتا ہے تعلیم و تربیت، کلچر، ادب، ثقافت، مصوری، نقاشی
موسیقی اور علم و ادب، غرض ہر شعبۂ زندگی میں ترقی کی اور اپنے افکار و خیالات کی برابر تبلیغ کرتے رہے۔ اور جب
ان کے قویٰ میں اضمحلال پیدا ہو گیا اور وہ جذبۂ سرفروشی اور علمی قدریں اور وہ تعلیمی جوش و خروش باقی نہ رہا تو یہی ملک کی
قوم زندگی کی شاہراہ پر قلابازیاں کھاتی نظر آنے لگی۔

اسپارٹا

اسپارٹا کی تاریخ اور اس عہد کے تفصیلی واقعات بہت کم دستیاب ہوتے ہیں، لیکن ان واقعات
اور حالات کی ایک ہلکی سی جھلک جو ہمیں نظر آتی ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مفتوحہ قبائل
کی بغاوتوں اور شورشوں کے پیش نظر یہ حکومت دھیرے دھیرے ایک فوجی تنظیم بن کر رہ گئی، اس حکومت
کے نظام اور اس کے نظم و نسق میں زیادہ تر ان نظریات و رجحانات کی کارفرمائی تھی جو پرانے ڈوری (DORIEN)
یونانی عقائد اور رسم و رواج سے عبارت تھے یا جن میں کریٹ (CRETE) والوں کی تہذیب و معاشرت کا رنگ
روشن نمایاں تھا، اور مسلسل جنگ و جدل اور شورشوں اور بغاوتوں نے انہیں ایک مستحکم حکومت قائم کرنے کا موقع
نہ دیا۔ اس پر مستزاد ان کے نیم شخصی اور نیم عظامی (ABSOLUTISM) جمہوری طریق حکومت نے انہیں مستقل
ہونے کا بہت کم موقع دیا اور نویں صدی قبل مسیح میں جب اسپارٹی حکومت کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور اس میں وہ دم خم
باقی نہ رہا تو انہیں امراء و اکابر اور مفکرین کی امداد کی ضرورت محسوس ہوئی، اس طرح انہوں نے لیقرغوث (LYCUR
GUS) کو ایک نئے دستور کی تدوین کی دعوت دی۔ لیقرغوث نے پرانے طریق ہائے کار کو اور زیادہ مضبوط کیا اور اس کے
ساتھ ساتھ لوگوں کو کچھ اور نئے ضوابط سے متعارف کیا، ان نئے ضوابط میں بالخصوص وہ قوانین توجہ طلب ہیں

اسی طرح ایک حد تک یہی سپارٹا کا نظامِ تعلیم ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم سے مختلف تھا۔ اس نظام میں یہ بات تھی کہ ان نسلوں کی اخلاقی اور جسمانی تربیت پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ یہ طریقِ تدریس مقدونی فتوحات تک کم و بیش قائم رہا لیکن اس کے بعد اس کی فعالیت میں کمی واقع ہونا شروع ہو گئی۔ پلوٹارک (PLUTARCH) نے عہد اسپارٹا کے حالات کو بالوضاحت بیان کیا ہے۔ اسکی توضیحات سے اس عہد کی تعلیمی اور سماجی رفتارِ ترقی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ اسپارٹا کی تعلیم کا سب سے اہم مقصد نوجوانوں کو بہترین سپاہی بنانا تھا۔ اور جسمانی بنیاد، ہمت، استقامت، فرمانبرداری اور وفاشعاری کو قائم رکھنے کی انہیں ایسی تربیت دی جاتی تھی کہ بہادری میں وہ سب سے سبقت لے جائیں۔ ان میں جوش و خروش اور ولولہ بھی ہو۔ وہ صرف اپنی توانائی اور جسمانی سج دھج پر ہی نازاں نہ ہوں بلکہ ان میں اخلاق اور فہم و بصیرت بھی ہو۔ حتیٰ کہ ان کی انفرادیت ایک اچھے شہری کے روپ میں جلوہ گر ہو۔ بقول ارسطو "ان کی تعلیم و تربیت کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت اور ان کی تعلیم و تدریس پر کما حقہٗ زور دیتے تھے اور اس لئے وہ قابلِ تحسین بھی ہیں۔ ان کا یہ جوشِ عمل حکومت کے احکام کی شکل اختیار کر لیتا ہے" اس طرح اسپارٹا کے نوجوان طبعاً فرمانبردار اور اطاعت شعار ہوتے۔ ان کے کردار میں متانت و سنجیدگی کے ساتھ ساتھ الگ رہنے کا جذبہ ہوتا اور رنج و محن کے عالم میں وہ متحمل مزاج اور صابر ہوتے۔ اور یہ خوبیاں اس عہد کے دوسرے یونانی نوجوانوں میں مفقود تھیں۔"

اسپارٹا کی تعلیمی ترقی کا جائزہ اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ اس نظامِ تعلیم کے اثرات تادیر صدیوں تک قائم رہے اور اس میں بچوں کے کسی شعبۂ زندگی کی تربیت سے غفلت نہیں برتی گئی۔ بچوں کے اخلاق و کردار اور ان کی سیاسی اور سماجی زندگی، ریاستی انضباط کے ماتحت تھی۔ سات سال کی عمر تک بچہ ایک سخت ماحول میں پرورش پاتا۔ اسوقت تک بچے کی تہذیب و تربیت کی زیادہ تر ذمہ داری ماں پر عائد ہوتی ہے اور ماں ماحول اور سماج کے تقاضوں کے پیشِ نظر بچے میں سخت کوشی اور مشکل پسندی کی عادت ڈالنے کی کوشش کرتی ہے اس کے بعد اسے نائب معلم (ASSISTANT PAEDONOMUS) کے سپرد کر دیا جاتا۔ سات سال کے اوپر عمر کے بچوں کے قیام کا انتظام بارکوں میں ہوتا۔ اور انہیں مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ بقول پلوٹارک بارہ سال سے کم عمر کے بچوں میں جو زیادہ ذہین، ہوشیار، نیک اور فہیم ہوتا۔ اسے سرگروہ مقرر کر دیا جاتا۔ دوسرے اس کے حکم کے

تابع اس کی ہدایت کے مطابق کام کرتے اور ان تمام سزاؤں کو صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرتے جو وہ اپنے گروہ کے دوسرے ساتھیوں کے لئے روا رکھتا۔ اس طرح اس کی تمام تر تعلیم کا انحصار اطاعت شعاری پر ہوتا تھا۔ یہ تربیت و تعلیم براہ راست اساتذہ فن کی زیر نگرانی ہوتی اور وہ بچے جو بارہ سال کی حدود کو پار کر جاتے ان میں سے زیادہ ذکی اور فہیم طلبا کو اپنے بڑوں کے پاس اٹھنے بیٹھنے اور ان سے استفادہ کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع دیا جاتا۔ لیکن ان کی تربیت میں بھی انتہائی سختی، شدت اور تندی و تیزی سے کام لیا جاتا ہے ۱۸ سال کی عمر میں بچے کی عسکری تربیت کا آغاز ہوتا اور کئی سال مسلسل اسے محنت و مشقت اور دوسرے فوجی لوازمات کی تعلیم دی جاتی اور یہ سلسلہ تربیت کم و بیش تیس سال کی عمر تک جاری رہتا تھا۔ اس عمر میں اس کی تربیت مکمل سمجھی جاتی تھی اور وہ مختلف امور میں خود حصہ لیتا اور ریاست کے نظم و نسق امن و جنگ غرض ہر جگہ اس کی ضرورت ہوتی۔ اور وہ اپنی استطاعت کے مطابق کام کرتا۔

جسمانی تربیت

اس طرح اسپارٹا کے تعلیمی نظام کو ہم با سانی ایک عسکری تربیتی نظام کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس نظام تعلیم میں ذہنی اور وجدانی حسوں کو پنپنے کا کم موقع ملتا ہے۔ بچوں کی جسمانی تربیت ان کی اخلاقی اصلاح اور انہیں خاص رنگ میں ڈھالنا ہی ان تربیتی اداروں کا نصب العین تھا۔ بقول پلوٹارک۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے انہیں صرف اتنی تعلیم دی جاتی تھی کہ وہ تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا سیکھ جائیں، اس کے علاوہ ان کی باقی تعلیم کا مقصد نوجوانوں میں قوت برداشت، قیادت کے اوصاف پیدا کرنا، دوسروں سے جنگ آزما ہونا اور نئے نئے علاقوں کو فتح کرنا تھا اور ایتھنز کا سب سے اہم مقصد یہی تھا کہ نوجوانوں میں اقدار کو فروغ دینے کی اہلیت پیدا کی جائے اور اس کے مختلف طریقہائے کار اور اس کی مختلف تنظیموں کا مقصد یہی تھا کہ طلبہ میں امعان نظر، آزاد خیالی، خود اعتمادی اور اعتدال پسندی پیدا ہو جائے، ان ورزشوں اور حربی مشقوں کے ساتھ ساتھ بچوں کو تحریر و تقریر میں ماہر بنانے کی کوشش کی جاتی تھی، حالانکہ یہ مہارت معمولی سی لکھائی پڑھائی پر مشتمل ہوتی تھی، اور اس کا بھی اندازہ یوں ہوتا ہے کہ وہ محض حساب دانی اور دوسرے چھوٹے چھوٹے تحریری کاموں سے روشناس تھے لیکن یہ تعلیم اجتماعی یا گروہی نہیں تھی، بلکہ انفرادی طور پر طلبا کو یہ چیزیں سکھا دی جاتی تھیں اور یہی چیزیں ان کی جسمانی ذہنی حتیٰ کہ ان کی قومی تربیت کا ایک اہم جزو سمجھی جانے لگیں۔

طلبہ کی جسمانی تربیت کے لئے چند مخصوص اور منظور شدہ ورزشوں کی طرف توجہ دی جاتی تھی، مثلاً دوڑنا، کودنا، چلانگ لگانا، تیر اندازی، مکہ بازی اور کشتی وغیرہ اور اس میں کشتی کی طرف بالخصوص توجہ دی جاتی تھی، کیونکہ کشتی سے جسم کو متناسب اور متوازن بنایا جا سکتا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ صبر و تحمل، دور بینی، اور دشمن کی ایک ہلکی سی چال سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اسپارٹا کے تعلیمی نظام کے چند ایسے پہلو بھی ہیں جنہیں ورزش یا کشتی سے کوئی سروکار نہیں، مثلاً بعض اوقات طلبہ کے صبر و تحمل کی تربیت کے لئے زجر و توبیخ کو ہی کافی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ جسمانی اذیت پہونچائی جاتی تھی اور انہیں اس قدر مارا جاتا تھا کہ اکثر ان کے جسم لہو میں ڈوب جاتے تھے۔ تاکہ وہ انتہائی صبر آزما حالات میں بھی مصائب کو برداشت کر سکیں، تفریحی اوقات میں نوجوان شکار کی طرف رجوع کرتے تھے، یہ ان کے لئے ایک عمدہ اور دلچسپ مشغلہ بھی تھا اور ورزش بھی، اور اسے ان کے نصاب تعلیم و تربیت میں دوسرے تربیتی مضامین کے پہلو بہ پہلو جگہ ملتی تھی،

یہ عجیب بات ہے کہ اسپارٹا کے نظام تعلیم میں ورزش کو تو اتنا اونچا مقام دیا گیا کہ دوسرے مضامین کو اُ جائز حق نہ مل سکا، لیکن پھر بھی ورزش گاہوں کے قیام اور ان کے انتظامات کے سلسلے میں اسپارٹا خاموش نظر آتا ہے بلکہ اس کے پورے نظام تعلیم میں بیشتر ورانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا بھی کوئی انتظام نہیں تھا، ان کی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد نوجوانوں کو عمدہ سپاہی بنانا تھا، جو جنگ ورس بھی ہوں اور تیز طرار بھی، محتاط بھی ہوں اور جن میں خود انضباطی بھی ہو، بے خوف بھی ہوں اور بے باک بھی، جسم میں مصائب و آلام کے برداشت کرنے کی طاقت بھی ہو اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت بھی۔ ان کے نظام تعلیم میں موسیقی اور گروہی (اور مذہبی) رقص کا مقصد انہیں خواص کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنا تھا، ان کی موسیقی میں اور عام یونانی موسیقی میں بنیادی اختلاف بھی تھا۔ اس موسیقی میں نرمی، مٹھاس اور نسائیت بہت کم تھی، یہی وجہ ہے کہ اس نے اسپارٹا کے نوجوانوں میں ہمت و جواں مردی کے جوہر جگائے، انہیں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کا سلیقہ سکھایا، چنانچہ جب یونانی مزاج میں درشتی اور یونانیوں کے قویٰ میں وہ طاقت و توانائی باقی نہ رہی تو ڈورین (DORIAN) مزاج کو یونان کے فلسفے میں نظرِ استحقار دیکھا جانے لگا۔

اخلاقی تربیت | اخلاقی تعلیم کے سلسلے میں باقاعدہ درس و تدریس کا کوئی سلسلہ موجود نہیں تھا، بلکہ بچوں

میں شروع سے ہی ایسے رجحانات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ وہ اپنی نگاہوں کو سب سے عمدہ شہری پر مرکوز رکھیں، ان سے جب پوچھا جائے کہ عمدہ شہری کون ہے تو ان کے ذہن طلسمات کی کوٹھریوں میں اوصاف کے آبدار لال نہ تلاش کریں۔ ان اوصاف کا ان لوگوں کی نوک زبان پر ہونا ضروری ہے، جو بچہ اس سوال پر قدرے ٹھٹکتا یا ٹھہر جاتا یا ہچکچاتا تو اسے ذہین تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ ارباب اور زعمائے سلطنت بالعموم بچوں کے مختلف گروہوں کا معائنہ کرتے اور بچشم خود دیکھتے کہ آئرن ان کی اخلاقی اور جسمانی تربیت کی طرف توجہ دے رہا ہے یا نہیں بچوں کی جماعت میں سب سے بزرگ لڑکا آئرن کہلاتا تھا، اخلاقی تربیت بچے کے لئے جسمانی تربیت سے کم ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی، اس لئے بوڑھے بالعموم ان بچوں کا خاص خیال رکھتے تھے اور اپنی اس محبت اور شفقت کے پیش نظر وہ انہیں بہت کچھ سکھاتے رہتے اور ان میں انصاف، پاس داری، عزت، حب الوطنی خود انضباطی، ایثار نفسی اور ایمان داری کے جوہر پیدا کرتے، یہ سلسلۂ رشد و ہدایت آپس کی افہام و تفہیم اور اجتماعی فلاح کے پیش نظر جاری کیا جاتا، مدرسی ماحول کی پابندی کا اس سے کوئی سروکار نہیں تھا، بلکہ اپنے قلبی محسوسات اور اپنی ذہنی وابستگیوں کے ماتحت دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے اور اس طرح تربیت اخلاق کا سلسلہ شروع ہو جاتا، اس طریق کار سے بہت عمدہ نتائج مرتب ہوتے۔ پلوٹارک نے اسے حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے،

"جو لوگ نوجوانوں کو تعلیم و تربیت کے لئے اپنا لیتے تھے۔ انہیں بھی زیر تربیت نوجوانوں کے اعزاز و افتخار یا اسکی مذموم حرکتوں میں سے حصہ ملتا۔ زیر تربیت نوجوانوں کی عزت اور ان کی ذلت سے ان کی عزت اور ذلت عبارت ہوتی تھی، کہا جاتا ہے کہ زعمائے سلطنت نے ایک مرتبہ ایک ایسے بزرگ کو سزا دی کہ جو نوجوان اس کے پاس زیر تربیت تھا ایک لڑائی میں اس کے منہ سے کچھ نازیبا الفاظ نکلے یا وہ چیخ پڑا۔ یہ محبت اتنی باوقار اور باتمکنت تھی اور یہ اتنی شدید ہوتی تھی کہ پاک دامن اور پاک سیرت شادی شدہ عورتیں کنواری لڑکیوں سے پیار اور شفقت سے پیش آتی تھیں اور ان سے محبت کرتی تھیں۔ محبت میں سابقت اور مقابلے سے غلط فہمی نہیں پیدا ہوتی تھی، بلکہ ان لوگوں میں بھی باہمی دوستی اور یگانگت پیدا ہو جاتی تھی جو کسی ایک نوجوان کو تربیت کیلئے منتخب کر لیتے تھے اور اس کی صحیح تعلیم و تربیت کے لئے ایک متحدہ کوشش کرتے تھے۔"

انگلستان میں تعلیم بالغاں

فضل احمد

دوسری عالمگیر جنگ نے انگلستان کی معاشری زندگی کو جو دھکا لگایا ہے اسکی تفصیلات آئے دن اخباروں میں گذرتی رہتی ہیں۔ موجودہ صدی کے آغاز تک یہ ملک دنیا کی اقتصادی زندگی کے لئے رگِ جان کا درجہ رکھتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم نے اس کی اقتصادی برتری کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں اور دوسری عالمی جنگ نے قریب قریب اس کا دیوالہ نکال کر رکھ دیا تاہم یہ انگریز قوم کا ہی دم خم ہے کہ انتہائی ناساعد معاشری حالات کے باوجود اس نے اب تک اپنی معاشری زندگی کو کم و بیش متوازن رکھا ہے۔ گو اس کے لئے اس نے اپنے اوپر کئی ایک کٹھن پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ مثلاً غیر ملکی درآمدات کو سال بسال کم سے کم تر کرنے کی کوشش کی گئی اور برآمدات کو سستے سے سستے نرخوں دنیا کی منڈیوں میں پیش کیا گیا ایک ایسے ملک کیلئے جس کی قومی آمدنی کا بڑا سہارا مصنوعات ہوں اور جو ہر قسم کی خام اشیا اور خوراک کیلئے دوسرے ملکوں کا دست نگر ہو اس قسم کی پابندی ایک بہت کڑی آزمائش ہے لیکن افراد قومی بہبود کے پیش نظر بخوشی طرح طرح کی محرومیوں کے سامنے سرِخم کئے ہوئے ہیں۔ تاکہ معاشری بحران کا زمانہ جلد از جلد ختم ہو جائے۔ ابھی پچھلے دنوں انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر چرچل نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ انگلستان کی معاشی دشواریاں ہی دراصل اس کی بہت سی سیاسی مشکلات کا باعث بنی ہیں، اس معاشی پس منظر میں یہ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ قوم اس مشکلات کے دور میں تعلیمی اخراجات کے بارے میں کیا رویہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ کیا قومی زندگی کے باقی شعبوں کی طرح یہاں بھی کفایت کے کلہاڑے سے کام لیا گیا ہے۔ یا یہاں صورت حال بالکل مختلف ہے اس صحبت میں تعلیم کے ایک مخصوص میدان یعنی تعلیم بالغاں پر نگاہ ڈالنا مقصود ہے۔

مالی بوجھ تعلیم بالغاں کے سلسلے میں عوامی جیب کو جو بوجھ اٹھانا پڑا ہے، اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے

ہو سکے گا جا اخبار ٹائمز کے ایک خط سے لیا گیا ہے۔

آجکل بیکار اخبارات عام طور پر پڑھے جاتے ہیں، عوامی کتب خانے جگہ جگہ موجود ہیں اور سینما، ریڈیو اور ٹیلی وژن ایسے ذی فہم لوگوں کو جو معلومات اور تعلیم کے متلاشی ہوں گھر بیٹھے بٹھائے یہ چیزیں بہم پہنچا دیتے ہیں، کیا فی الواقع اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم صرف کثیر سے وہ تمام جماعتیں جاری رکھیں جو شبینہ اداروں، فنی مدرسوں، مزدوروں کی تعلیمی انجمنوں اور ہنرمندوں کے اداروں کے نام سے جاری ہیں، کیا زیادہ معقول طریق کار یہ نہ ہوگا کہ یہ جماعتیں اپنے اخراجات خود برداشت کریں بجائے اس کے کہ ایک تعلیمی وقفہ کے لئے جو بارہ یا اس سے زیادہ جماعتوں پر مشتمل ہوتا ہے صرف دس شلنگ فیس وصول کی جائے۔ ملک کو جو مالی بوجھ اٹھانا پڑ رہا ہے وہ کروڑوں کو پہنچتا ہے۔ کیا موجودہ حالات میں یہ بات قرینِ عقل ہے کہ ہم ملکی محاصل کا ایک بڑا حصہ لوگوں کے دلچسپ مشاغل کی نذر کر دیں خواہ یہ مشاغل کتنے ہی دلچسپ کیوں نہ ہوں"۔

مذکورہ بالا خط میں ایک شخص نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اسوقت جبکہ ملک معاشری بحران سے دوچار ہے یہ بات معقول نہیں کہ برائے نام فیسوں کے معاوضے میں بالغوں کے متعدد تعلیمی ادارے جاری رکھے جائیں اگر ان کا جاری رکھنا ضروری ہو تو ان کے تمام اخراجات پڑھنے والوں کو برداشت کرنے چاہئیں نہ کہ ملکی محاصل کو۔

اخراجات کا درست تخمینہ

سچ یہ ہے کہ انگلستان میں تعلیم بالغاں پر جو کچھ خرچ کیا جا رہا ہے اس کا صحیح اندازہ کسی طرح ممکن نہیں کیونکہ اس کا اہتمام کسی ایک ادارے کے ہاتھ میں نہیں۔ ملک کے کئی ادارے تعلیم بالغاں کا کام اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا دائرۂ عمل الگ ہے اور وہ اپنے اخراجات کا خود کفیل ہے، یہ اخراجات مختلف ذرائع سے پورے کئے جاتے ہیں اور کوئی مرکزی نظام ان سب پر حاوی نہیں۔ اسوقت تعلیم بالغاں کی باگ ڈور جن اداروں کے ہاتھ میں ہے اس کی فہرست درج ذیل ہے:-

(۱) مختلف یونیورسٹیوں کی طرف سے جاری کردہ جماعتیں۔

(۲) حکومت کی طرف سے عطا کردہ وظائف برائے بالغاں۔

(۳) رہائشی سکولوں کے طویل المدت اور قلیل المدت نصاب۔

(۴) لوکل اداروں کی طرف سے اٹھارہ برس سے زیادہ عمر کے لوگوں کے لئے جاری کردہ جماعتیں جہاں ایسی تعلیم دی جاتی ہے جو براہ راست حصول معاش میں ممد نہیں۔

(۵) معاشرتی مرکز اور انجمنیں۔

(۶) قومی ادارے جن کا دائرہ عمل گو وسیع تر ہے لیکن وہ زیادہ مستعدی کے ساتھ تعلیم بالغاں کے کام میں مصروف ہیں۔

ان کے علاوہ کئی ایک ادارے ایسے بھی موجود ہیں جو براہ راست تعلیم بالغاں کا کام نہیں کرتے اور اس لئے انہیں حکومت کی طرف سے کوئی مالی مدد نہیں ملتی لیکن جن کی سرگرمیاں تعلیم بالغاں کو ترقی دیتی ہیں۔ لامحالہ ایسی سرگرمیوں کے اخراجات بھی تعلیم بالغاں کے کل اخراجات میں شمار ہونے چاہئیں۔

ذیل کے نقشوں میں اخراجات کا کچھ تخمینہ دیا گیا ہے۔ یہ اعداد و شمار اگرچہ سرکاری طور پر فراہم کردہ نہیں۔ تاہم یہ خاص محنت اور احتیاط سے تیار کئے گئے ہیں اور گو یہ مصدقہ نہیں تاہم صورت حال کی ایک خاص صحیح تصویر پیش کرتے ہیں۔

نقشہ ۱

تدریسی اداروں کے اخراجات

ادارے کا نام	کل اخراجات	جن میں سے	
		محاصل پر بوجھ	نجی ذرائع پر بوجھ
(۱) یونیورسٹیاں اور تعلیمی مراکز	۷۵۲۰۰۰ پونڈ	۵۹۴۰۰۰ پونڈ	۱۵۸۰۰۰ پونڈ
(۲) سرکاری وظائف	۲۶۰۰۰ پونڈ	۲۶۰۰۰ پونڈ	×
(۳) رہائشی مراکز	۲۶۱۰۰۰ پونڈ	۱۳۶۰۰۰ پونڈ	۱۲۵۰۰۰ پونڈ
(۴) لوکل تعلیمی اتھارٹی	۱۷۵۰۰۰ پونڈ	۱۵۰۰۰۰ پونڈ	۲۵۰۰۰ پونڈ
(۵) دیہاتی مدارس موسیقی	۲۶۰۰۰ پونڈ	۷۰۰۰ پونڈ	۱۹۰۰۰ پونڈ

نقشہ ۲۲

دوسرے ادارے جنہیں مالی مدد ملتی ہے

ادارے کا نام	کل اخراجات	جن میں سے	
		محاصل پر بوجھ	نجی ذرائع پر بوجھ
(۱) زنانہ انسٹی ٹیوٹ	۱۶۹۰۰۰ پونڈ	۱۹۰۰۰ پونڈ	۱۵۰۰۰ پونڈ
(۲) شہری زنانہ انجمنیں	۵۰۰۰ پونڈ	۱۰۰۰ پونڈ	۴۰۰۰ پونڈ
(۳) دیہاتی ملی ادارے	۱۲۰۰۰ پونڈ	۸۰۰۰ پونڈ	۴۰۰۰ پونڈ
(۴) ملی مراکز	۱۲۵۰۰۰ پونڈ	۲۹۰۰۰ پونڈ	۹۶۰۰۰ پونڈ

تصویر کا دوسرا رُخ مندرجہ بالا نقشوں میں عوامی جیب پر جو بوجھ دیا گیا ہے وہ سرکاری خزانے اور مقامی محاصل دونوں کی مالی مدد پر مشتمل ہے۔ اور ان ہر دو میں ۲ اور ۱ کی نسبت ہے۔

بادی النظر میں یہ رقوم چنداں خطیر نہیں، لیکن اس ضمن میں خاص طور پر قابل ذکر امر یہ ہے کہ غالباً قومی خدمت کے کسی اور شعبے میں بلا معاوضہ کام کرنیوالے لوگوں کی تعداد اتنی نہیں جتنی تعلیم بالغاں کی مہم میں، دوسرا قابل ذکر امر یہ ہے کہ تدریسی اور انتظامی ہر دو شعبوں میں کُل وقت ملازموں کی تعداد کوئی ایک ہزار سے زیادہ نہیں، باقی تمام لوگ ایسے ہیں جو اپنے دوسرے فرائض منصبی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ جزوی طور پر تعلیم بالغاں کیلئے کام کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو جو معاوضہ دیا جاتا ہے اس کی نوعیت بالکل برائے نام ہے، کیونکہ ان کی محنت کے ساتھ حق الخدمت کو عموماً کچھ مناسبت نہیں ہوتی، ان دونوں امور کو سامنے رکھ کر اگر کل خرچ کا اندازہ لگایا جائے تو بلا شبہ میزان کئی گنا بڑھ جائے گی

اخراجات کی کفایت کا دوسرا پہلو اسوقت نمایاں ہوتا ہے جب عمارات اور سازوسامان پر نگاہ ڈالی جائے تعلیم بالغاں کے کئی ایک مرکز مشہور تاریخی عمارتوں میں قائم کئے گئے ہیں۔ اس سے پہلے یہ عمارتیں محض تاریخی دلچسپی کی تشفی کا سامان تھیں۔ اب وہ ایک اہم قومی ضرورت کو بھی پورا کر رہی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اقدام ان عمارتوں کی دیکھ بھال کے لیے کیا گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ جنگ میں تاریخی عمارتوں سے

کا کام لینے کی صورت پیش آئی بعد میں یہ تعلیمی مرکز جوں کے توں باقی رہے۔

جہاں تک عمارتوں اور ساز و سامان کا تعلق ہے تعلیم بالغاں پر کم سے کم خرچ کرنے کی کوشش کی گئی ہے گویا تحریک کی ہمہ گیری اور اس کے نتائج کے مقابلے میں اس کا مالی بوجھ اس حد تک کم ہے کہ اس میں غالباً مزید تخفیف کی گنجائش نہیں، یہی وجہ ہے کہ معاشی مجبوریوں نے بھی اس بوجھ کو ناقابل برداشت نہیں بنایا۔

ایک دلچسپ پہلو

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد تعلیم بالغاں نے انگلستان میں حیرت انگیز مقبولیت حاصل کی ہے۔ اور اس کی ترقی اور توسیع برطانوی تعلیم کا ایک بہت بڑا کارنامہ خیال کیا جاتا ہے، اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ تعلیم حاصل کرنے والے بالغوں میں سے اکثر علمی پیاس کو بجھانے اور ذوق سلیم کی تشفی کے لئے آگے تعلیم جاری رکھتے ہیں۔ ان کے پیش نظر کوئی فوری مادی فائدہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ لوکل تعلیمی اتھارٹی نے حال ہی میں اس مسئلہ پر اعداد و شمار سے روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ شبینہ مدارس میں پڑھنے والے طلبہ میں ۵۰ سے ۷۰ فیصدی تک ایسے ہیں جو کسی سند کے حصول کے لئے نہیں پڑھ رہے۔

ایک اہم سوال

ہر چند کہ تعلیم بالغاں کی افادیت مسلمہ ہے اور اس افادیت کے مقابلے میں اس کا مالی بوجھ بھی اتنا زیادہ نہیں، پھر بھی بعض لوگ بار بار یہ سوال دہراتے سنے جاتے ہیں کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ قومی تنگی کے زمانے میں تعلیم بالغاں کی مہم کو ملتوی کر دیا جائے اور زیادہ پرسکون اور خوشحال وقت کا انتظار کیا جائے، جب قومی جیب اس خرچ کو زیادہ آسانی سے برداشت کر سکے۔ اس وقت بعض اہم ضرورتیں پہلی توجہ کی محتاج ہیں صاف تر الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم بالغاں اس قسم کی ناگزیر چیز نہیں جس طرح ابتدائی تعلیم۔ اس لئے گو آخر الذکر کے بغیر کسی صورت میں چارہ نہیں۔ اول الذکر کے بارے میں بات صحیح نہیں۔ بلکہ اس کا درجہ وہی ہے جو ناگزیر ضروریات زندگی کے مقابلے میں آسائشات کا جس طرح آسائشات کو تنگی کے زمانے میں خیر باد کہہ دیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح تعلیم بالغاں پر بھی ایسے کڑے وقت میں کم خرچ ہونا چاہئے۔ بادی النظر میں یہ استدلال معقول نظر آتا ہے لیکن کیا یہ فی الحقیقت ایسا ہے؟

حقیقت الامر

اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہمیں پہلے یہ طے کر لینا چاہئے کہ کیا تعلیم بالغاں ایک ناگزیر ضرورت کا درجہ رکھتی ہے یا ایک غیر ضروری آسائش کا۔ غالباً

اس کا بلا تامل جواب یہی ہوگا کہ تعلیم ہر انسان کے لئے اسی قدر ضروری ہے جس قدر خوراک۔ بس جب صورت حال یہ ہو تو پھر تعلیم بالغاں کی حیثیت خود بخود ابتدائی تعلیم کی طرح اہم بن جاتی ہے کیونکہ ابتدائی تعلیم تو محض تیاری ہے اس بلند تر منزل کے لئے جو پختہ سالی کے ساتھ ہی میسر آسکتی ہے۔ یہ بات انسانی علوم کے بارے میں خاص طور پر درست ہے۔ ایک طالب علم باوجود اپنی ساری ذہانت کے غالب کے کلام میں وہ لطیف معانی کبھی نہ دیکھ سکے گا جو اسے پختہ سالی میں نظر آئیں گے۔ اسی طرح گو وہ بظاہر بڑی کامیابی کے ساتھ خاندان مغلیہ کے زوال کے اسباب بیان کرے یا سلطنت دہلی کے معاشری اثرات پر بحث کرے لیکن سچ یہ ہے کہ اس کا ذہن ان گہرے حقائق کو کبھی نہ پا سکے گا جو ان تاریخی واقعات کی تہ میں کام کر رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ نگاہ کی گہرائی سن و سال کے ساتھ آتی ہے منطق میں ترقی کرنے سے نہیں آتی۔ حال ہی میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے یہ سوال پوچھا گیا تھا کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ غیر معمولی حالات کے زمانے میں یونیورسٹی کے نصاب کو تین سال سے گھٹا کر دو سالہ بنا دیا جائے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ یہ تیسرا سال ہی تو سب سے اہم ہے۔ پہلے دو سالوں میں طلبہ کو صرف مستعد کیا جاتا ہے اور اس آخری سال میں یہ طویل تیاری پھل لاتی ہے۔ اگر اس سال کو اڑا دیا جائے تو اس کی مثال بالکل ویسی ہوگی کہ کوئی کسان مسلسل کئی مہینوں تک ہل جوتنے کے بعد تخم ریزی کے وقت کھیت کو یہ کہکر چھوڑ دے کہ مجھے کچھ دوسرے ضروری کاموں کے لئے وقت اور توانائی کو بچانا ہے۔ پس جس طرح یونیورسٹی کے نصاب کو نازک صورت حال کی خاطر کم نہیں کیا جا سکتا۔ بالکل اسی طرح تعلیم بالغاں کو بھی غیر معمولی حالات کے بہانے سے کھٹائی میں نہیں ڈالا جا سکتا۔

اس میں کلام نہیں کہ بعض چیزیں ایسی ہیں جو چھوٹی عمر میں ہی اخذ کی جا سکتی ہیں۔ اور بچپن گذر جانے کے بعد ان میں مہارت حاصل کرنا محال ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ چیزیں لامحالہ ذہنی اور بدنی مہارت کی نوعیت کی ہوتی ہیں مثلاً پہاڑوں اور زبانی حساب کے معاملے میں گیارہ بارہ برس کی عمر بہار کا زمانہ ہے۔ عملی تجربہ رکھنے والے اساتذہ کو معلوم ہے کہ اس عمر کے بچے بعض اوقات ایسے ایسے مشکل سوال زبانی حل کر لیتے ہیں جو شاید استاد خود بھی زبانی حل نہ کر سکے۔ یہی حال سائنس منطق اور دوسرے ٹیکنیکل علوم کا ہے۔ لیکن ان علوم سے ذہنی اور جسمانی پھرتی۔ بیداری اور وسعت معلومات کے سے اوصاف تو پیدا ہو سکتے ہیں لیکن عملی امور زندگی کے بارے

بلکہ صحیح فہم اور قوت فیصلہ پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس راستے کو صرف تجربے کی مشعل سے ہی روشن کیا جا سکتا ہے۔ اور تجربہ وقت کے ساتھ آتا ہے۔

پس وہ بالغ جنھوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ چھوڑ دیا اور کسب معاش میں لگ گئے انہیں مزید تعلیم کی سہولتیں بہم پہونچانا دراصل تعلیم کے اصل منشا کو پورا کرنا ہے۔ یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں تعلیم بالغاں کے نصاب میں زیادہ تر علم ادب۔ تاریخ سیاست اور فلسفہ کے سے انسانی علوم بھی شامل ہیں، جو بالغ اپنے فارغ اوقات کو حصول علم کے لئے وقف کرتے ہیں، وہ اس لئے ایسا نہیں کرتے کہ فنی مہارت میں کچھ اضافہ ہو جائے اور اس طرح ان کی مزدوری بڑھ جائے۔ ان کا مقصد عموماً علمی تشنگی کو شانا ہوتا ہے۔ انسانی علوم کا مطالعہ فنی مہارت پیدا نہیں کرتا بلکہ صرف دل و دماغ کو جِلا دیتا ہے۔

ایک اور وضاحت

تعلیم بالغاں کے سلسلے میں ایک اور اعتراض بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ گو پختہ عمر میں انسانی علوم کا مطالعہ نفع بخش ہے لیکن ایسا مطالعہ ہر شخص کو تنہائی میں ذاتی کوششوں سے کرنا چاہئے۔ اس کے لئے جماعتیں جاری کرنے کی کیا حاجت ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے موجدوں اور سائنس دانوں نے اپنی ذاتی کاوشوں سے ہی بڑے بڑے علمی کارنامے سرانجام دیئے۔ آج جبکہ کتب خانوں کی سہولتیں اس قدر عام ہیں ہر وہ بالغ جو علمی پیاس رکھتا ہو اپنے اوقات فراغت کو کتب خانوں میں گذار کر یہ پیاس بجھا سکتا ہے۔ پھر ملک و قوم پر یہ بوجھ لادنے کی کیا حاجت ہے؟

اس میں کلام نہیں کہ اگر کسی شخص کو سچا علمی ذوق ہو اور اس کے کردار میں اس قدر مضبوطی اور عزم میں اس قدر بلندی ہو کہ دن بھر کے کام کاج کے بعد باقی وقت مطالعہ اور سوچ و بچار میں گذار سکے تو ایسے شخص کے لئے کسی مدرسے یا کسی استاد کی ضرورت نہ ہوگی لیکن ایسے لوگ کتنے ہوں گے جن میں یہ اوصاف موجود ہوں۔ اگر ہر بالغ ان ذہنی اوصاف اور کردار کا مالک ہوتا تو دنیا میں ہر وقت بے شمار نیوٹن موجود رہتے لیکن ایسا نہیں، دنیا میں اکثریت ایسے لوگوں کی نہیں جو اپنی راہ خود بنا لیا کرتے ہیں، بلکہ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو بنے بنائے راستوں پر دوسرے ہمراہیوں کے ساتھ ہی منزل کی طرف پیش قدمی کر سکتے ہیں، راہ و منزل کے نشان کے بغیر خود اکیلے سفر کرنا اکثر لوگوں کے لئے محال ہے۔

یہ درست ہے کہ جماعت کی پڑھائی کے باوجود بھی افراد کو گھر پر اکثر اوقات بہت سا خاموش مطالعہ کرنا ہوگا اور عموماً یہ تنہائی کا مطالعہ بہت کچھ ذہنی کوفت کا موجب ہوگا۔ لیکن اس مطالعہ کے لئے زمین کمرۂ جماعت میں ہی ہموار کی جاتی ہے۔ پھر مل جل کر کسی مسئلہ پر بحث کرنے سے اکثر اوقات جو نکات پیدا ہو جاتے ہیں اور جو ذہنی لطف و شگفتگی پیدا ہوتی ہے وہ کسی دوسرے طریق سے ممکن نہیں۔ الغرض جس طرح یہ ضروری ہے کہ بالغوں کو مزید تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں بالکل اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ یہ سہولتیں جماعتی نوعیت کی ہوں۔

ٹیکنیکل علوم اور تعلیم بالغاں

اوپر یہ کہا جا چکا ہے کہ برطانوی تعلیم بالغاں کا نصاب زیادہ تر انسانی علوم پر مشتمل ہے۔ اس پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بیسویں صدی کے وسط میں جبکہ قوموں کی ترقی بلکہ ان کی زندگی کا انحصار سائنس اور ٹکنالوجی پر ہے اس وقت یہ کیا ضروری ہے کہ قوم کے کوئی دو لاکھ بالغ مرد اور عورتیں علم ادب، فلسفہ اور سیاسیات کی باریکیوں کو سمجھنے کے لئے اپنے فارغ اوقات وقف کر دیتے ہیں اور ان کا یہ مشغلہ قومی خزانے پر بھی ایک اچھا خاصا بوجھ ہو؟ یہ اعتراض ایک حد تک وزنی معلوم ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا سائنس کی ترقی محض چند افراد کی سائنسی عظمت سے حاصل ہو سکتی ہے؟ ہر چند کہ کسی قوم کو خوش بختی مسلسل طور پر کچھ چوٹی کے سائنس دانوں سے نوازتی رکھے جب تک ان عظیم المرتبت سائنس دانوں کا علم چھن چھن کر عوام تک نہیں پہنچے گا اس وقت تک قوم ان بڑے عالموں سے پوری طرح فائدہ نہ اٹھا سکے گی۔ پھر یہاں ایک اور سوال بھی قابل توجہ ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کسی قوم کو طاقتور تو بنا سکتی ہے لیکن اس قوت کا درست استعمال کرنے کے لئے دل و دماغ کی ضرورت ہوگی۔ خالی قوت دنیا کو ایک وحشت کدہ بنا کر رکھ دے گی۔ آج انسان کو اپنے قوت بازو کی کمی کی شکایت نہیں بلکہ حقیقی رونا یہ ہے کہ یہ قوت بازو اس کے اپنے بھائی بندوں کو راحت پہنچانے کی بجائے الٹا ان کا گلا کاٹنے کے در پے ہے، جب تک یہ روز افزوں قوت بازو ایک عقل سلیم اور قلب منیب کے تابع ہو کر نہ رہے گی۔ اس وقت تک نوع انسانی کے دکھوں کا مداوا مشکل ہے۔ آج سے ہزاروں برس پہلے حکیم یونان ارسطو نے کہا تھا کہ گو انسان نے شہری زندگی کی داغ بیل محض اپنی بقا کے لئے ڈالی تھی، لیکن اب آئندہ شہری زندگی کا جواز صرف یہ ہے کہ وہ بہتر زندگی بسر کرنے میں مدد دے۔ پس جو معاشرہ زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے میں مدد نہیں دیتا وہ اپنی اصلی غایت سے دور ہٹا ہوا ہے۔

پس حقیقی ترقی اور پیش قدمی کے لئے صرف سائنس اور تکنیک کی ترقی کفایت نہیں کر سکتی۔ بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو انسانیت اور اوصاف کی ترقی بھی ہونی چاہیئے اور انسانی علوم کا مطالعہ یہ غرض بطریق احسن پوری کرتا ہے، سیاسی امور میں صائب رائے اس کے بغیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ گویا تعلیم بالغاں قوم کو من حیث القوم اصابت رائے عطا کرنے کی ضامن ہے۔

شاید اس ضمن میں یہ کہا جائے کہ سیاسی امور کا فیصلہ تو صرف کچھ افراد کے ہاتھوں ہوتا ہے، اس لئے ان افراد کی تعلیم ہی کافی سمجھی جانی چاہیئے، ساری قوم کیلئے اسکا حصول کیا ضروری ہے؟ یہ استدلال پچھلی صدی میں تو شاید کام دے سکتا ہو آج بیسویں صدی کے وسط میں یہ بالکل فرسودہ ہو چکا ہے۔ آج عوام کو سیاسی سوجھ بوجھ کی اسی قدر ضرورت ہے جسقدر خواص کو۔ وہ زمانہ ختم ہو چکا جب سیاسی اقتدار چند بارسوخ کنبوں کی اجارہ داری ہوا کرتا تھا، آج جمہوری ممالک میں سیاسی ذمہ داری آخر الامر خود عوام کے کندھوں پر ہے اور جب تک ان میں یہ ذمہ داری ہوشمندی کے ساتھ سنبھالنے کی صلاحیت نہ ہوگی اسوقت تک سیاسی زندگی نقطۂ اعتدال سے ہٹی رہے گی۔

اپنی حالت پر ایک نظر

ہمارے ہاں عوام کی غالب اکثریت ناخواندہ ہے۔ اوپر کی سطور میں انگلستان کی جس تعلیم بالغاں کا ذکر ہوا اسکا مقصد ناخواندگی دور کرنا نہیں بلکہ خواندہ بالغوں کو وسعت نگاہ عطا کرنا ہے۔ انگلستان وہ ملک ہے جس نے ابتدائی تعلیم کو مفت اور جبری بنانے میں دنیا کی راہنمائی کی۔ اس لئے اس کے سامنے ناخواندگی کا مسئلہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ اس کے باوجود تعلیم بالغاں پر جو توجہ اور دولت صرف کی جا رہی ہے اس میں ہمارے جیسے پسماندہ ملکوں کیلئے بڑی عبرت ہے۔ انگریز کی سیاسی بصیرت نے کوئی پچھلے دو سو سال سے دنیا میں دھاک بٹھا رکھی ہے۔ اور گو برطانیہ اب معاشی لحاظ سے بہت کچھ بے بس ہو چکا ہے مگر اس کی سیاسی بصیرت میں کمی نہیں آنے پائی۔ بلکہ جوں جوں نظام عالم پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا جا رہا ہے برطانیہ اس کوشش میں ہے کہ اسکی سیاسی حکمت کے سرچشمے اسی قدر مالا مال ہوتے جائیں۔ اوپر کی سطور میں ان سرچشموں کی کچھ کیفیت بیان کی گئی ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ سیاسی داؤ پیچ میں دوسروں سے نہ پٹ جائیں تو اس کی مؤثر صورت یہی ہے کہ ہماری تعلیم عام ہو۔ ہمارا نصب العین صرف اسی قدر نہ ہو کہ ناخواندگی دور ہو جائے بلکہ خواندگی کے بعد مرد یا تعلیم کی راہ پر مسلسل آگے سے آگے ہی بڑھتے چلے جائیں۔ افسوس ہے کہ جو چیز ہم پر بطور ایک مذہبی فریضہ کے عائد ہوتی تھی اس میں بھی دوسرے لوگ ہم سے اسقدر آگے ہیں کہ ہم انکی گرد کو نہیں پہونچتے۔ جسقدر جلد ہم اس فرض سے آگاہ ہونگے اسی قدر ہماری فلاح قریب آتی جائے گی۔

گھریلو معمل

عبدالغفور چودھری (ایم ایس سی شعبہ طبیعات پنجاب یونیورسٹی)

پاکستان میں سائنس پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ سائنس کی تعلیم میں عملی کام بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اور عملی کام کیلئے سائنس کے سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ سائنس کے سامان کو مہیا کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔

اکثر اسکولوں کے لئے سائنس کا قیمتی سامان خریدنا تقریباً ناممکن ہے۔ ایسے حالات میں اگر ہم کسی طرح کچھ سائنس کا سامان خود تیار کر سکیں تو اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ سامان سستا پڑے گا اور دوسرے یہ کہ ہمیں اوروں کی طرف دیکھنا نہ پڑے گا کہ کب سامان آئے اور کب عملی کام شروع ہو۔

میرے ایک دوست سائیگوں سے ہو کر آئے ہیں انہوں نے بتایا کہ سائیگوں میں میں یہ بات دیکھ کر حیران ہوا کہ وہاں کی معمل میں اسپرٹ لیمپ۔ ٹیسٹ ٹیوب اسٹینڈ۔ بی ہائیو شیلف۔ ظرف وغیرہ ایسی بیسیوں چیزیں وہیں معمل میں تیار کی جاتی ہیں۔ اس کے لئے ایک ٹین گر کو بلا لیا جاتا ہے اور وہ اس قسم کی بیسیوں چیزیں تیار کر دیتا ہے۔ اسی طرح ٹیسٹ ٹیوب کا کام دوائی کی لمبی نالیوں۔ فلاسک کا کام لمبی گردن والی شیشیوں اور قیف کا کام معمولی قیف سے لیا جاتا ہے۔

انڈونیشیا میں بھی اسی طرح ہر اسکول کے باہر ایک ٹین گر ایسی بیسیوں قسم کی چیزیں بناتا رہتا ہے جو عملی کام میں استعمال ہوتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں ہمارے ملک کو بھی سائیگوں اور انڈونیشیا کی تقلید کرنی چاہئے اور اسی طرح بیشتر سائنس کا سامان ٹین گر سے بنوانا چاہئے۔

ٹانکا لگانے کا کام بہت مفید کام ہے۔ نیز اس کا سیکھنا بھی آسان ہے۔ ٹانکا لگانے کا کام لیبارٹری اسسٹنٹ

بڑی جماعتوں کے لڑکے آسانی سے سیکھ سکتے ہیں۔ لیبارٹری کی بیسیوں چیزیں ٹین کو ٹانکا لگا کر بنائی جا سکتی ہیں۔ ان چیزوں کے بنانے سے لڑکوں کو بیحد خوشی ہوگی۔ چونکہ کسی ماڈل کو بنا لینے یا کسی سائنس کا کھلونا بنانے سے بچوں کو بہت خوشی ہوتی ہے۔ اور پھر یہ بھی ایک قسم کی عملی تعلیم ہے۔ لڑکوں میں خود چیزیں بنانے کا اعتماد پیدا ہوتا ہے اور اگر اس مشغلہ کو دو چار سال تک جاری رکھا جائے تو لڑکے بڑی بڑی چیزیں بنانے کی ہمت کریں گے حتیٰ کہ ان کیلئے ریڈیو سیٹ بنانا۔ اڑنے والے ہوائی جہاز کا ماڈل تیار کرنا۔ ٹیلیفون وغیرہ کا ماڈل بنانا آسان معلوم ہوگا، وہ سوچیں گے کہ جو ماڈل انہوں نے تیار کیا ہے اس میں اور کیا اصلاح اور ترمیم ہو سکتی ہے۔

گذشتہ زمانہ میں جو بڑے سائنسدان گذرے ہیں ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ اپنے تجربوں کیلئے تمام سامان وہ خود اپنے ہاتھ سے بناتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے تجربوں میں گھر کی بوتلوں جام وغیرہ کے جاروں اور شیشوں سے ہی کام لے لیتے تھے۔ اکثر سائنسدان تو بیحد غریب ہوتے تھے۔ اس لئے ان کے لئے بازار سے ہر سامان خریدنا ناممکن تھا۔ سب کام جیسے کہ ٹانکا لگانا۔ شیشہ کاٹنا شیشے کی نلیوں کو موڑنا توڑنا سب وہ اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے۔

آجکل بھی ادنےٰ سے ادنےٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ امریکہ اور یورپ کی لیبارٹریوں میں ٹانکا لگانے کا کام ہر ریسرچ کرنے والے کو سیکھنا پڑتا ہے۔

سائنس کے سامان کے علاوہ ٹانکے کی مدد سے زندگی کی سیکڑوں روزمرہ کے استعمال کی چیزیں بنائی جا سکتی ہیں۔ مٹی کے تیل کا لیمپ۔ مٹی کا تیل نکالنے کی قیف۔ عرق کشید کرنے کا بھبکا۔ لالٹین اور دیگر سیکڑوں قسم کے ٹین کے کھلونے بنانے میں ٹانکا لگانے کی مدد لینی پڑتی ہے۔ بلکہ بعض چیزیں جو ولایت سے بیحد مہنگی ملتی ہیں۔ یہاں سستے داموں میں بنائی جا سکتی ہیں۔ مثلاً دھات کی تھرماس بوتل اور گکر وغیرہ۔ اسی طرح کا مفید ہنر شیشہ کاٹنا بھی ہے۔

ہر ایک معمل میں ہیرے کی کنی والا شیشہ کاٹنے کا قلم ضرور ہونا چاہئے۔ اس کی قیمت بیس پچیس روپے ہوتی ہے۔ شیشہ کاٹنا گو نہایت آسان کام ہے مگر ہاں اس کے لئے کافی مہارت چاہئے۔ شیشہ کی طرح آئینہ بھی کاٹا جا سکتا ہے۔ شیشہ کے ٹکڑے جوڑ کر خوبصورت چیزیں بنائی جا سکتی ہیں اور شیشہ جوڑنے کا مسالہ کافی

ستعمال جاتا ہے۔ انڈے کی سفیدی اور بے بجھا چونا ملا کر شہد کی طرح گاڑھا پیس لیا جائے تو اس مسالہ سے
بھی شیشے کے ٹکڑے جوڑے جا سکتے ہیں۔ شیشہ کاٹنے کا ہنر بھی روزمرہ کی زندگی میں کافی اہمیت رکھتا ہے بازار
میں جو چھوٹے چھوٹے آئینے بکتے ہیں اسی طرح بنائے جاتے ہیں کہ بڑے آئینہ میں سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے شیشے
کے قلم کے ذریعہ کاٹ لئے جاتے ہیں اور ان کو ٹین یا لکڑی کے فریم میں لگا دیا جاتا ہے۔ پھر ٹین کا فریم بنانے کے لئے
ٹانکا لگانا پڑتا ہے۔ شیشے میں سوراخ کرنا چنداں مشکل نہیں۔ آئینہ میں سوراخ کر کے دیواروں میں نصب کریں تو کتنا
خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ آئینہ کے ٹکڑے مسالہ سے جوڑ کر ڈبیہ یا بکس بنانا بچوں کے لئے کس قدر دلفریب مشغلہ ہے
ایک شمل میں لکڑی کے ڈبے اور ڈبیہ وغیرہ بنانیکا بھی کچھ سامان چاہیئے۔ سائنس کے سامان میں لکڑی کے
کچھ حصے ہوتے ہیں جو کہ آسانی سے بنائے جا سکتے ہیں۔ اور اگر معمولی لکڑی کی بجائے پلائی وڈ کی لکڑی کا سامان بنایا جائے
تو زیادہ آسانی سے بن سکیگا مثلاً ہوائی جہاز کا ماڈل پلائی وڈ سے بن سکتا ہے اور پن ہول کیمرہ پلائی وڈ سے بن سکتا ہے

شیشے کو دھندلا کرنے کی بھی اکثر ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً پن ہول کیمرہ کا اسکرین بنانے کے لئے دھندلا شیشہ
استعمال کرنا پڑتا ہے۔ شیشے کو دھندلا کرنے کا سستا اور آسان طریقہ یہ ہے کہ شیشے کے دو ٹکڑے شیشہ کے قلم
سے کاٹیں اور ایک شیشہ پر کچھ بالو ریت اور پانی ڈال کر دوسرے شیشہ کے ٹکڑے کو اس پر رکھ کر اوپر والے شیشے کو
دبا کر رگڑتے رہیں اور گھماتے رہیں اور جب ریت سوکھنے لگے تو تھوڑا پانی ڈالتے جائیں۔ اس عمل کو ایک دو دن
تک جاری رکھیں تو دو ایک روز بعد دونوں شیشے دھندلے ہو جائیں گے۔ اگر جلدی دھندلا کرنا ہو تو ریت کی بجائے
ایمری پوڈر استعمال کریں۔

بوتل وغیرہ کو کاٹنے کی بھی اکثر ضرورت پڑتی ہے اس کے لئے ایک سُتلی کے ٹکڑے کو مٹی کے تیل میں ڈبولیں
اس کے بعد اس سُتلی کو بوتل کے گرد اس جگہ لپیٹیں جہاں سے اس کو کاٹنا ہے اور سُتلی کو آگ لگا دیں۔ جب سُتلی جل
چکے تو بوتل کو فوراً پانی میں ڈال دیں۔ بوتل اسی جگہ سے کٹ جائے گی۔

احتیاط — شیشے کا جو ٹکڑا بھی کاٹیں یا بوتل کا جو ٹکڑا کاٹا ہو اس کے کنارے بہت ہی تیز
ہوتے ہیں۔ کاٹنے کے فوراً بعد ان کناروں کو ریتی سے تھوڑا تھوڑا رگڑ دیں اس عمل سے
شیشہ سے کبھی ہاتھ نہ کٹے گا۔

بوتل کو اس طرح کاٹ کر بیلجار بنایا جا سکتا ہے اور لیڈن جار (LEYDEN JAR) بنانے میں ایسی کٹی ہوئی بوتل کو استعمال کیا جا سکتا ہے، غرضیکہ ایسی بوتل کم خرچ اور کثیر الاستعمال ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ اسکول کے لئے سائنس کا سامان بنانے میں زیادہ روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ماسوا اس سامان کے جس میں شیشے کی چوڑی نلی یا شیشے کا کھوکھلا سلنڈر وغیرہ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ تقریباً اسی فیصدی سامان خود تیار کیا جا سکتا ہے۔ یا پھر ٹین گر وغیرہ کی مدد سے تیار کرا یا جا سکتا ہے۔ نیز جو سامان کی شکل پرانی کتابوں میں دی گئی ہے اُس کو ترمیم کرکے جدید طرز پر خود بنایا جا سکتا ہے۔ مثلاً ٹین کے فوارے کی بجائے ایک قیف۔ ربڑ کی ٹیوب اور چھلنی دار قیف استعمال کی جا سکتی ہے۔ پانی کے دباؤ کا اصول سمجھانے کے لئے ایک لمبا ٹین کا نل لیکر اس میں سوراخ کریں لیکن سب سوراخ ایک عمودی خط میں ہونے چاہئیں۔ بارش ناپنے کا آلہ یعنی (RAIN GAUGE) کی بجائے ایک سگریٹ کا خالی ڈبہ لیکر اس کے اندر انچوں کے نشان ایک عمودی خط میں کھینچیں۔ یہ ڈبہ بارش میں رکھ دیں اور جتنی بارش ہوا ندر کا پیمانہ دیکھکر ناپ لیں۔ یا ڈبہ کے اندر ایک پیمانہ ڈھونڈ کھڑا کریں اور پانی کی گہرائی ناپ لیں۔ سائفن کے اصول کی وضاحت کے لئے ایک ربڑ کی نلی استعمال کی جا سکتی ہے۔

"مائع کا دباؤ چاروں طرف یکساں ہوتا ہے" ———— اس کے مظاہرے کے لئے ایک ربڑ کی گیند لیکر اس میں سوراخ کر لیں اور اسے پانی سے بھر کر دبائیں۔ "انتقال حرارت" کے بہت سے تجربات تو ٹین یا گتے کے ڈبوں سے ہو سکتے ہیں۔ روشنی کے تجربوں کا بیشتر سامان محل ہی میں بنایا جا سکتا ہے۔ سوائے شیشے کے منشور وغیرہ کے جیسے دو ایک روپے میں خریدا جا سکتا ہے۔

بجلی کے بیشتر تجربے۔ کنگھے۔ کاغذ اور گلاس وغیرہ ہی سے ہو سکتے ہیں۔ ان سب تجربات کی تفصیلی بحث آگے آئے گی۔ واضح رہے کہ یہ سب تجربات پہلے آزمائے جا چکے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ تجربے خود کرا تا ہوں۔

لہذا یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ تجربے تو بس اسی سامان سے ہو سکتے ہیں جنکی شکل کتابوں میں دی گئی ہے بلکہ اُس سامان سے تجربے کرنے چاہئیں جو خود تیار کیا گیا ہو۔ کیونکہ اس میں رد و بدل کیا جا سکتا ہے۔ مرمت کی جا سکتی ہے۔ خود بنائے ہوئے سامان سے تجربے کرنے سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا طریقوں کو اگر عمل میں لایا جائے تو یقیناً ہر سکول میں سائنس کے سامان کی مشکلات دور ہو جائیں گی اس طرح زیادہ سے زیادہ دو سو روپے میں سائنس کا معمل بن سکتا ہے جس میں تقریباً سو تجربے ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بچوں کو یہ ترغیب دینی چاہئے کہ وہ سائنس کے تجربے گھروں میں جا کر خود کریں کیونکہ جیسا کہ ہم آگے چل کر مفصل طور پر بیان کریں گے قریب قریب سکول کے سب تجربے گھر میں بھی ہو سکتے ہیں علاوہ ازیں ہم ایسے تجربے بھی بیان کریں گے جن کا کرنا نہایت آسان ہے اور وہ نہایت دلچسپ و حیران کن ہیں۔ ان کے کرنے سے بچوں میں سائنس کے مضمون سے دلچسپی پیدا ہو گی اور سائنس کے اصول اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں گے۔ ان سی باتوں پہ عمل پیرا ہونے سے ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ آئندہ پاکستان میں بڑے بڑے انجینئر اور سائنسدان پیدا ہوں گے۔

اس سلسلہ میں ہم ماڈل وغیرہ بنانے پر خاص زور دیں گے، ماڈل بنا لینے سے بچے میں بے حد دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور وہ اس طرح ماڈل سے اصل کو اچھی طرح سمجھنے لگتا ہے اور اس میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ ماڈل کی طرح اصل کو بھی تیار کرے۔

اب ہم سائنس کے سامان بنانے کے متعلق طریقے درج کرتے ہیں۔ پہلے ہم کیمیا کے سامان کو لیتے ہیں۔

کیمیا کا سامان تیار کرنا

کیمیا کا سامان دو طرح کا ہوتا ہے اوّل اپریٹس۔ دوسرے دوائیاں ان دونوں کو آسان طریقے سے تیار کیا جا سکتا ہے۔ پہلے ہم اپریٹس کو لیتے ہیں کیونکہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کیمیاوی اپریٹس بنایا نہیں جا سکتا۔

کیمیاوی اپریٹس بنانا

جو اپریٹس کیمیا میں استعمال ہوتا ہے وہ یہ ہے۔ بیکر۔ پیالی یا ڈش۔ سپرٹ لیمپ۔ ٹرف۔ بی ہائیو شیلف۔ ٹیسٹ ٹیوب سٹینڈ۔ واٹر باتھ سٹینڈ باتھ وغیرہ وغیرہ۔

<u>بیکر</u>:— بیکر کی بجائے چھوٹے شیشے کے گلاس استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اگر بڑا بیکر بنانا ہو تو بوتل کو کاٹ لیں۔ اگر پانی وغیرہ گرم کرنا ہو تو ٹین کے ڈبے ہی میں گرم کر سکتے ہیں۔ گلاس ویسے بیکر کا سب کام دے سکتا ہے ماسوا اس کے کہ یہ گرم نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ہاں واٹر باتھ میں گرم بھی کیا جا سکتا ہے۔

فلاسک ـــ فلاسک کا کام بوتل سے لیا جا سکتا ہے۔ بوتل میں کارک اور شیشے کی نلی وغیرہ لگا کر WASH-
(BOTTLE) کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔

چینی کی پیالی یا ڈش (DISH) اس کا کام چائے کی پیالی سے لیا جا سکتا ہے۔ آج کل چائے
کی کانچ کی پیالیاں عام ملتی ہیں۔ گرم کرنا ہو تو واٹر باتھ میں رکھ کر گرم کر لیں۔

امتحانی نالی یا ٹسٹ ٹیوب (TEST TUBE) یہ ایک بہت سستی چیز ہے۔ پاکستان میں
عام طور پر بننے لگی ہے۔ اگر دستیابی میں کچھ مشکل ہو تو اسی شکل کی دوا کی شیشیاں آتی ہیں جن میں گولیاں آتی ہیں
اس شیشی سے امتحانی نلی کا کام لیا جا سکتا ہے۔

گیلن جار ۔ اس کا کام اسی شکل کے چوڑے منہ کی شیشی سے لیا جاتا ہے۔ یہ شیشی کوئی سات انچ کے قریب لمبی
ہے اور اس کا منہ دو انچ کے قریب چوڑا ہوتا ہے۔

قرص یا ڈسک ۔ شیشے کی ڈسک کے گول ہونے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ شیشے کے چوکور ٹکڑے شیشے کی ...
کے ذریعے کاٹ لیں۔ یا ٹین کے گول ٹکڑے لیں اور اس پر پینٹ کریں۔ تاکہ پانی کا اثر نہ ہو۔ اس سے وہی کام نکل سکتا
ہے جو شیشے کے قرص سے نکل سکتا ہے۔

ٹرف ۔ شیشے کی ٹرف کی بجائے ٹین کا ٹرف بنا لیں اور اس کو پینٹ کر لیں۔ اس سے بھی سستا بنانا ہو تو ایک کنستر
کا نیچے کا حصہ کاٹ لیں۔ گہرائی کوئی چھ انچ رکھ لیں۔ کنستر کے باقی ٹین سے اور دوسری چیزیں بنائیں۔

بی ہائی شلف ۔ ٹین کا بی ہائی شلف بہت اچھا کام کرے گا۔ اس کو پینٹ کر لیں۔

پیسل مارٹر ۔ اس کی بجائے کھرل استعمال ہو سکتا ہے۔

قیف ۔ اس کی بجائے معمولی ٹین کی قیف استعمال ہو سکتی ہے۔ اس کو سفید پینٹ کر لیں۔

ٹرائی پوڈ اسٹینڈ (TRIPODSTAND) لوہے کی پتی کا لوہار سے بنوا لیں یا خود بنانا ہو تو لوہے کا تار
موڑ کر ٹرائی پوڈ کی شکل کی جوڑ لیں۔

(WIREGAUGE) اس کے لئے کسی بھی لوہے کی جالی کے ٹکڑے کاٹ لیں۔

اسپرٹ لیمپ ۔ دوا یا ٹین کی خالی شیشی لیں۔ اس کے ڈھکنے میں ایک ٹین کی نلی کوئی ایک انچ لمبی ...

ٹانکا لگائیں۔ اس نلی میں سے بتی گرا دیں اور شیشی میں سپرٹ ڈالیں۔ سپرٹ لیمپ تیار ہے۔ لاگت تقریباً ایک آنہ۔ دیکھو شکل ۳

سینڈ باتھ ٹین کا ڈھکنا یا کوئی ٹین کا ڈبہ جو کہ دو تین انچ گہرا ہو اور سات آٹھ انچ قطر ہو اس کو لیکر اس میں ایک انچ موٹی تہہ بالو ریت کی ڈال لیں بس سٹینڈ باتھ تیار ہے۔

واٹر باتھ - اوپر جیسا ٹین کا ڈبہ لیں جس کی گہرائی چار انچ کے قریب ہو۔ اُس میں پانی ڈال دیں۔ واٹر باتھ تیار ہے۔

ٹرمرک پیپر بنانا - ہلدی کو پانی میں حل کریں۔ اس پیلے پانی میں سلائٹنگ پیپر ڈبو کر خشک کر لیں ٹرمرک پیپر تیار ہے۔

ڈسٹلڈ واٹر - یعنی کشید کا پانی بنانا۔ کیمیائی تجربوں میں اس کی اکثر ضرورت پڑتی ہے۔ اس کی بجائے برسات کا پانی بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ جب بارش ہونے لگے تو ایک میز ایک کھلے اور بڑے صحن کے وسط میں رکھ دو اور جب بارش پانچ منٹ پڑ چکے تو ایک صابن سے دھویا ہوا تام چینی کا بادیہ (یا) بالٹی میز کے اوپر رکھ دو جب بارش ختم ہو جائے تو اس پانی کو بوتلوں میں بھر کر رکھ لو۔ یہ پانی سولوشن وغیرہ بنانے کے کام آتا ہے نیز موٹر کار کی بیٹریوں میں بھی استعمال ہو سکتا ہے لیکن ڈاکٹری کے انجکشن لگانے کے کام نہیں آ سکتا۔

کشید کا عمل سمجھانا - ریٹارٹ اور صراحی کی بجائے ایک الونیم یا ٹین کی کیتلی لیں اور اُس میں تھوڑا سا پانی ڈالیں کیتلی کے منہ پر ایک بوتل لگا دیں کیتلی کو گرم کرنے سے اُس میں بھاپ بنے گی۔ بھاپ کیتلی کے منہ میں سے نکل کر بوتل میں جائے گی۔ بوتل پر ٹھنڈا پانی ڈالنے سے بھاپ کشید کا پانی بن جائیگا۔ اگر کیتلی میں پانی کے ساتھ گلاب کے پھول وغیرہ ڈالدیں تو گلاب کا عرق تیار ہو جائیگا دیکھو شکل ۵

کیمیا کیلئے دوائیاں مہیا کرنا

تینوں قسم کے تیزاب - گندھک۔ شورہ اور نمک کے تیزاب بازار سے خریدلیں۔ مہنگے خالص تیزاب سکول کے کام کے لئے ضروری نہیں۔

سنگ مرمر، جست، تانبے وغیرہ کے ٹکڑے۔ یہ سب اشیاء بازار سے خرید لیں اور ان کے ٹکڑے خود کاٹ لیں۔ لوہے کے ٹکڑوں کے لئے لوہے کی کیلیں لے لیں۔ لوہے کا برادہ خود بنا لیں۔

گندھک، نیلا تھوتھا وغیرہ ان اشیاء کے دیسی اور انگریزی نام دئیے جاتے ہیں ان کو بازار سے خرید لیں۔

گندھک۔ سلفر (SULPHUR) نیلا تھوتھا کاپر سلفایٹ (CAPPER SULPHATE)
ہیرا کسیس آئرن سلفایٹ (IRON SULPHATE) نوشادر۔ امونیم کلورائڈ۔ (AMMONIUM-CHLORIDE)
کپڑا دھونے کا سوڈا۔ سوڈیم کاربونیٹ (SODIUM CARBONATE)
کھانے کا سوڈا۔ سوڈیم بائی کاربونیٹ (SODIUM BI CARBONATE) کھانے کا نمک سوڈیم کلورائڈ (SODIUM CHLORIDE)
شورہ پوٹاشیم نائٹریٹ (POTASSIUM NITERATE)
سنگ مرمر یا پتھر۔ کیلشیم کاربونیٹ (CALCIUM CARBONATE) شنگرف ریڈ مرکری آکسائڈ۔ (RED MERCURQ OXIDE)
مردہ سنگ (YELLOW LEADOXIDE)
سیندور (RED LEAD OXIDE) لوہے کا زنگ IRON OXIDE
بے بجھا چونا (CALCIUM BY ORONIDE)
کاسٹک سوڈا (SODIUN HYDYOXIDE) پوٹاشیم پرمگنیٹ (POTASSIUM-PERMANGHATE) (لال دوائی جو کنوئیں میں ڈالتے ہیں) وغیرہ یہ سب بازار سے مل سکتی ہیں۔

لکڑی کے ٹکڑے بنانا (CHIPS OF WOOD) جیڑ کی سفید لکڑی کے ٹکڑے چاقو کے تکلے سے ڈیڑھ موٹے کاٹ لیں۔ یہ تیزابوں کو ٹسٹ کرنے کا بہت اچھا کام دیں گے۔

ٹیسٹ ٹیوب سٹینڈ۔ ایک لکڑی کا ٹکڑا آٹھ انچ لمبا اور دو انچ چوڑا لیں اور اس میں ایک ایک انچ کے فاصلہ پر چھ کیل گاڑ دیں کیل چار چار انچ لمبے ہوں اس سے ٹیسٹ ٹیوب سٹینڈ کا کام لیں۔ دیکھو شکل نمبر ۲۔

ٹیسٹ ٹیوب سیدھا کھڑا کرنے کا سٹینڈ۔ ایک لکڑی کا ٹکڑا ۸ انچ لمبا اور تین انچ چوڑا لیں اور اس کو دوہرا کر کے تار لگائیں اس تار کو چھ سات جگہ بل دیں جیسے سات جگہ نالی کو چوڑا کر دیں۔ اور ان سوراخوں میں ٹیسٹ ٹیوب کھڑا کریں۔ دیکھو شکل نمبر ۳۔

ٹیسٹ ٹیوب ہولڈر۔ کوئی تین انچ لمبا اور ایک انچ چوڑا موٹے کاغذ کا ٹکڑا لو اور اس کو ٹیسٹ ٹیوب کے گرد لپیٹ کر انگلی سے پکڑ لو۔ یہ ٹیسٹ ٹیوب ہولڈر کا کام دے گا۔

وولف بوتل بنانا۔ ایک چوڑے منہ کی سفید رنگ کی شیشی لو جس کا منہ ڈیڑھ دو انچ چوڑا ہو۔ اس کے منہ میں ایک کارک فٹ کرو اور کارک میں دو سوراخ کرو۔ ایک سوراخ میں سے ایک قیف دار نلی گذارو اور دوسرے سوراخ میں سے ایک خمدار نلی گذارو جو کہ دو قائمہ زاویوں پر مڑی ہوئی ہو۔ یہ وولف بوتل کا کام دیگی دیکھو شکل

لٹمس پیپر بنانا۔ کالے رنگ کی گاجر لیکر اس کا چھلکا چھیل کر کالے رنگ کا پانی نکالیں۔ اس پانی میں بلاٹنگ پیپر کے آدھا انچ چوڑے اور دو انچ لمبے ٹکڑے لیکر ڈبو دیں تاکہ یہ ٹکڑے نیلے ہو جائیں۔ ان ٹکڑوں کو سکھا لیں۔ یہ نیلے لٹمس کا کام دیں گے۔ ان کاغذوں کو سرکہ یا لیمو کے پانی سے تر کریں تو لٹمس کا رنگ لال ہو جائیگا انکو سکھا لیں یہ لال لٹمس پیپر کا کام دیں گے۔

لائم واٹر یعنی چونے کا پانی بنانا (CALCIUM HYDROXIDE) ایک مٹی کی ہنڈیا میں تین سیر صاف پانی ڈالو اور اس میں آدھی چھٹانک کی ایک ڈلی ان بجھے چونے کی ڈالیں اور چوبیس گھنٹے تک ایسی جگہ رکھیں جہاں اس کو بالکل نہ ہلایا جائے۔ اس کے بعد گلاس کے ذریعہ اوپر کا صاف پانی آہستہ آہستہ نکال لیں اور بہتر ہے کہ اس کو فلٹر کر لیں۔ بس لائم واٹر تیار ہے۔

فلٹر پیپر کی بجائے بلاٹنگ پیپر استعمال کریں۔

شکلوں کے لئے دیکھو صفحہ ۳۸

(۱)
(۲)
(۳)
(۴)
(۵)

قسط نمبر ۱
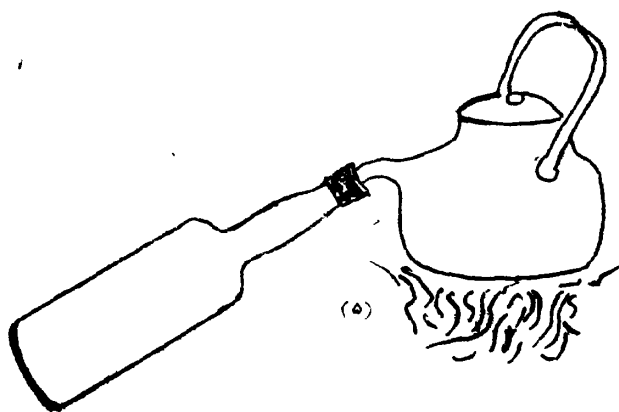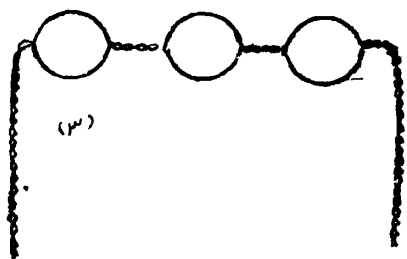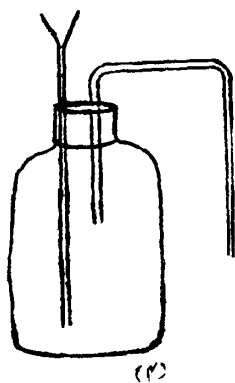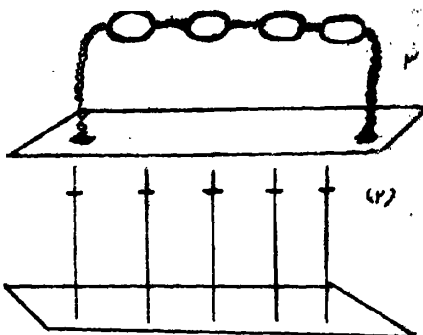
مانٹسوری طریق تعلیم

(عبدالحی علوی)

مانٹسوری طریق تعلیم کی تاریخ

بچے کی انفرادیت کے حق میں جو عالمگیر تحریک جاری ہے وہ اپنے تعلیمی دستور کی بنیاد بچوں کی نفسیات پر استوار کرتی ہے کیونکہ بچپن کی اوائل بالغ سماج کے لئے ایک حقیقی اور زندگی بخش امداد ہوتا ہے، اس اصول کے مطابق بچے کی زندگی میں ایک ایسا وقت آتا ہے جب اس کی ذہنی، طبعی اور جسمانی خصوصیتوں کو جذب کر کے ایک سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس کی انفرادیت کا ایک نا گزیر جزو بن جائیں بچپن کا زمانہ نشوونما کا زمانہ ہوتا ہے اور ان ایام طفولیت ہی میں اس شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے، جسے بالغ زندگی اور اس کے مشاغل کی اساس کہا جاسکتا ہے اور حق یہ ہے کہ یہ ڈاکٹر مانٹسوری کا زندگی بھر کا تعلیمی کارنامہ ہے جس نے ان جدید رجحانوں کی طرف راہنمائی کی۔

ڈاکٹر ماریا مانٹسوری جس کا انتقال مئی ۱۹۵۲ء میں ۸۲ برس کی عمر میں ہوا۔ ۱۸۶۹ء میں شیاراوَلے میں پیدا ہوئی روم یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور ۱۸۹۴ء میں طب کی ڈگری حاصل کی۔ اطالیہ میں یہ پہلی خاتون ہے جسے یہ اعزاز ملا۔ ۱۹۰۰ء سے کچھ سال پہلے روم یونیورسٹی کے معالجۂ دماغی کے کلینک میں بحیثیت نائب کے کام کرتی رہی۔

اس نے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز ناقص بچوں کی تربیت سے کیا۔ اور ناقص اور تحت طبعی بچوں کی تربیت میں سگوین اور اتیارد کے طریقوں کو برتنے کا مطالعہ اور ان میں ترمیم کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی، ایسے بچوں کی تدریس کیلئے اس نے حِسّی تربیت کے سازوسامان کو خاصی وسعت دی۔

اس کی تعلیم کے مطالعہ نے انیسویں صدی کے آخری سالوں میں اتنی دلچسپی پیدا کر دی کہ اسے ان ناقص

بچوں کی تعلیم کا ناظم مقرر کیا گیا جنہیں ابتدائی مدارس میں ذہنی اعتبار سے پس ماندہ قرار دے دیا گیا تھا۔ ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۱ء
تک کا زمانہ فی الحقیقت اس کے اپنے تجربات کا زمانہ تھا۔ پھر بھی اسے اپنے مقصد کے حصول میں قابل قدر کامیابی نصیب
ہوئی چنانچہ مطالعہ و تحقیق کے لئے اس نے کچھ دنوں پیرس کے "بسیل بیتر" میں قیام کیا۔ جہاں سیگوین کی قائم کردہ جماعتیں
اب تک معروف کار تھیں۔ اس کے بعد وہ لندن چلی گئی۔ یہاں ناقص اور تحت طبعی بچوں کی تعلیم کے کچھ بھی ادارے موجود
تھے اسی سیر و سیاحت سے اس کی تعلیمی دلچسپی کا آغاز ہوا۔

۱۸۹۸ء تا ۱۹۰۰ء کے وقفے میں جب اس نے اپنے آپ کو ناقص طلبہ کی تعلیم و تربیت کے لئے وقف کر دیا
تھا سے کچھ کچھ منکشف سا ہوتا رہا کہ سیگوین کے طریقہائے کار ناقص بچوں کی تربیت کے لئے محض ذہنی کوشش ہی نہیں تھے
بلکہ ان کا انحصار ایسے اصولوں پر تھا جو عام تعلیمی اصولوں سے کہیں زیادہ معقول تھے۔ اس چیز نے اس کے دل و دماغ
میں یہ خیال پیدا کیا کہ اگر ان ہی اصولوں کا اطلاق طبعی بچوں پر کیا جائے تو بچے کی شخصیت کی تعمیر کے سلسلے میں بہت
اچھے نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے، چنانچہ اس وقت سے لے کر دم آخر تک اس نے اپنی پوری زندگی بچوں کی تعلیم
کے لئے وقف کر دی سنہ ۱۹۰۶ء میں ادارۂ تعمیرات نفسیہ کے ناظم اعلیٰ نے کرایہ کے مکانوں میں مدارس اطفال کی تنظیم
کی دعوت دی، یہ مخصوص مدرسہ "بیت الاطفال" کہلایا اور ایسے اداروں کی سماجی اور تعلیمی اہمیت کو اتنا زیادہ محسوس
کیا گیا کہ ایک قلیل عرصے میں اس قسم کے ایک نہیں بیسیوں ادارے معرض وجود میں آ گئے۔ پچھلے چند اعشارے
(DECADES) میں تو اس کے طریقہائے تدریس نے لوگوں کے ذوق شوق کو اس قدر برانگیختہ کیا کہ اسے ہمہ گیر انداز
میں اختیار کر لیا گیا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ ہندوستان اور یورپ کے مختلف علاقوں میں مانٹسوری اسکولوں کا
اجرا ہوا، دوسری جنگ عظیم میں مانٹسوری نے دکن میں معلمین کی تربیت کے بہت سے ادارے قائم کیے سنہ ۱۹۴۹ء میں
حکومت پاکستان نے اسی قسم کے ایک کورس کے انصرام کے لئے اسے پاکستان آنے کی دعوت دی۔ اس کورس میں
پاکستان علاقوں کے مرد اور خواتین نے شرکت کی لیکن بیت الاطفال کا نظریہ پاکستان کے لئے کوئی نیا نظریہ نہ تھا۔ چنانچہ
اس قسم کا ایک ادارہ کراچی میں پہلے ہی سے موجود تھا جس کا اہتمام اور نظم و نسق پارسی اساتذہ کے ہاتھوں میں تھا۔

مانٹسوری طریق تعلیم کی نمایاں خصوصیات

(۱) آزادی۔ سماجی اور تعلیمی امور میں بچے کے لئے آزادی
ضروری ہے، وہ آزاد پیدا ہوا ہے اور اپنی پسند کے

مطابق وہ اپنے کاروبار میں بھی آزاد ہے معلّم اس کے مشاغل میں مداخلت نہیں کرتا اور بچے کو بھی مختلف مشاغل کے ایک مخصوص متعین پروگرام پر کاربند رہنے کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا۔ ادارہ میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ لمبی حرکات اور اپنے اعمال کو دوسروں کے تابع کرنے سے احتراز کیا جائے۔ یہ نظم اور ضبط دراصل حقیقی نظم اور ضبط ہوتا ہے کیونکہ اس کا انحصار نفسیاتی اصولوں پر ہوتا ہے اور ایسے اصول جو بچے کو بیت الاطفال میں نظم و ضبط قائم رکھنے کی ضرورت کو محسوس کرنے کی پوری آزادی دیتے ہیں۔ اس قاعدہ کلیہ کے خطرناک طرز عمل کو مستثنیٰ کر دینا ضروری ہے کیونکہ انہیں ممنوع قرار دینا معلّم کا فرض ہے۔

(ب) احترامِ انفرادیت بیت الاطفال کے قیام کا مقصد بچوں کی شخصیت کی تعمیر و ترقی ہے، ڈاکٹر مانٹسوری کا عقیدہ ہے کہ معلمین کے پیش نظر ہمیشہ بچوں کی ذہنی اور جسمانی ترقی ہونی چاہئے جسے دو واضح حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) پیدائش سے لیکر تین سال کی عمر تک کا زمانہ اور (۲) تین سال کی عمر سے لیکر کم و بیش چھ سال کی عمر تک کا زمانہ پہلے دور میں بچہ اپنے ماحول اور اپنے گرد و پیش سے بہت زیادہ اثرات قبول کرتا ہے اور دوسرے دور میں شعوری طور پر اپنے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کی توضیحات کرتا ہے اور پھر ان اثرات کا تجزیہ کرکے انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرتا ہے۔

تعلیمی اعتبار سے دوسرا دور ہماری مخصوص توجہات کا زیادہ مقتضی ہے کیونکہ اسی دور میں ابتدائی خامیوں اور عیوب کا مداوا ہو سکتا ہے۔ یہ ایک تعمیری زمانہ ہوتا ہے۔ اس میں اصلاح اور ترقی ممکن ہوتی ہے، المختصر مانٹسوری کا یہ طریقہ سارے بچوں کی شخصیت کی تربیت کی ایک سائنٹیفک امداد ہے۔ ماحول کی اصلاح اور کچھ مشق کے ذریعہ بچہ اپنی جملہ منظم حرکات پر قابو پا سکتا ہے لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس قسم کی امداد اسی وقت پہونچائی جا سکتی ہے جب بچہ تعمیری دور میں ہوتا ہے "لوہے پر اسوقت ضرب لگاؤ جب وہ گرم ہو" اور جب ہمارا واسطہ چھوٹے بچوں سے ہو تو اس اصول کو ہمارے سامنے مشعل بردار بن کر آنا چاہیئے۔

(ج) مخصوص ماحول۔ ایک بچے کی مثالی اور آئیڈیل تربیت کے لئے مخصوص ماحول کا ہونا ضروری ہے، ماحول پر اس قدر زور دینے کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ بچوں کے کردار کے خلاف معمول ہونے کی اصل وجہ ماحول کی عدم مطابقت ہے اس نکتے پر معالجۂ دماغی کے محققین متفق ہیں کہ طبعی کردار کی تعمیر و تشکیل اسوقت ممکن ہے جب بچہ

ابتدائی عمر میں بہترین اور متناسب ماحول میں پرورش پائے اور وہ بچہ جسے یہ مواقع میسر نہیں آتے اسے مناسب ذہنی اور جسمانی تربیت کے لئے سب سے کم موقع ملتا ہے۔ بچے کے لئے اس کے ابتدائی زمانے سے ہی ایک ایسے ماحول کی ضرورت ہوتی ہے جس میں رہ کر وہ اپنی جملہ جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو تربیت دے سکے۔ اچھے ماحول کی چند ضروری خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اس مقصد کے حصول کیلئے کہ متعلم ماحول کے اثرات کو جذب کرے۔ ماحول کو ایسی عمدہ اشیا سے مملو ہونا چاہئے جن کی بچوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ اور جن کے وہ خود آرزومند بھی ہوتے ہیں۔ یہ اشیا فی الحقیقت کھلونے نہیں ہوتیں بلکہ ان کا تعلق روزمرہ استعمال کی اشیاء سے ہوتا ہے۔ مثلاً فرنیچر۔ تصویریں۔ ظروف وغیرہ۔ ان تمام چیزوں کا ایک ہی مقام پر رکھا رہنا ضروری ہے۔ تاکہ طریق تجاذب میں بچے کو کوئی دقت محسوس نہ ہو۔

۲۔ جو ماحول اور جو اشیا بچے کے لئے مہیا کی جائیں ان کا بچے کے استدراک، قوت اور تخیل طفل کے مطابق موزوں ہونا ضروری ہے۔

۳۔ ماحول اچھے جملہ لوازمات کے ساتھ بچے کی وجدانی حس سے ملاطفت پیدا کرے۔ اس ماحول میں تصویروں اور پھولوں کا قرینے سے مناسب مقامات پر ترتیب دینا زیادہ اچھا ہوتا ہے۔

۴۔ اس ماحول میں متضاد فیہ قوتوں کا عمل نہ ہو۔ امتناع اور دباؤ کے بغیر بچے کو اپنی انفرادیت کے جاری رکھنے میں اس ماحول کو مدد دینا چاہئے۔ بالغوں کو ان کے مشاغل میں مداخلت سے گریز کرنا چاہئے اور جب تک وہ فی الواقع اعانت کے خواہاں نہ ہوں ان کی مدد بھی نہ کی جائے۔

۵۔ ماحول کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ شخصیت کی تعمیر میں بچے کی صریح اور فطری مدد کی جائے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ ماحول بچے کو آزادی کا احساس دلائے کیونکہ احساس آزادی کے بغیر اعلیٰ ذہنی اقدار کی نشوونما ممکن نہیں ماہرین تعلیم کا اس امر پر کلی اتفاق ہے کہ ماحول کو بچے میں جذبہ خودداری پیدا کرنا چاہئے۔ یہ جذبہ اُسی صورت میں کلی طور پر نشوونما پا سکتا ہے جب ماحول اس کے راستے میں روڑے نہ اٹکائے۔

۶۔ اچھے ماحول کی دوسری نشانی یہ ہے کہ بچوں کے پچھلے عہد نشوونما کی غلطیوں اور ناقص طریقوں کی اصلاح کے لئے سہولتیں میسر ہوں۔

اس قسم کے مثالی ماحول کو ڈاکٹر مانتسوری "بیت الاطفال" کہتی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بچے اپنے کردار اور اپنی شخصیت کی تعمیر کر سکتا ہے، جہاں اس کی معصوم فطرت کو اخلاقی اور سماجی قانون شکنی کے بغیر سکون و اطمینان نصیب ہو سکتا ہے۔

(د) **خود آموزی**:- یہ نظریہ غلط ہے کہ درس وتدریس میں معلم ہی بچوں کے لئے سب کچھ کرتا ہے بچے کو غیر متحرک سامع کی بجائے فعال اور متحرک کارکن بننے کا موقع دیا جائے۔ معلم حسب ضرورت اور حسب موقع صرف اس کی راہنمائی کر سکتا ہے۔ اور مختلف تعلیمی کاروبار کے لئے اس کے احساسات کو برانگیختہ کر سکتا ہے۔ خود آموزی کا اصول بہت زیادہ اہم ہے کیونکہ یہ بچے کے لئے اس کی ذہنی زندگی کے آغاز سے ہی آنے والی زندگی کی تربیت کا موجب ہوتا ہے، یہ اصول بچے کو اپنا ہر کام خود اپنے ہاتھوں سے کرنے کا درس دیتا ہے اس منزل تک پہنچنے کے لئے "بیت الاطفال" میں حسب ذیل بنیادی خصوصیتوں کا ہونا ضروری ہے۔

(۱) عملی زندگی کے لئے ایسی مشقیں ضروری ہوتی ہیں جن کی بدولت بچہ اپنے اعصاب اور اپنی جنبش بالارادہ پر ضبط قائم رکھ سکے۔ اس سے بچہ اپنا توازن قائم رکھتا ہے اور ہر قسم کی ہم آہنگ اور متوازن حرکات سیکھتا ہے۔

(۲) حسّی طریق عمل کی مشق:- ماحول کے حسّی اثرات کی توثیق کے ذریعے حسی طریق عمل کو بروئے کار لانے کے بعد مسلسل مشاہدے موازنے اور فیصلے کے مسلسل تجربہ کی روشنی میں وہ اپنے "ذہن رسا" کی بنیاد ڈالتا ہے۔ انہیں مشقوں کی بدولت دست و دماغ کے ارتباط سے اپنے ذہن کی تہوں کو کھولنا شروع کر دیتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بیان کیا ہے بچہ اپنی ابتدائی نشوونما کے زمانے میں ماحول کے اثرات کو قبول کرتا ہے، وہ ان اثرات کو جذب کرتا ہے اور نتیجے کے طور پر اپنے ذہن میں ان ذخائر کو جمع کر لیتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ مختلف قسم کے تجربوں کے لئے مواد مہیا کیا جائے، اور وہ بھی محض داخلی تجربوں کی بدولت آگے چل کر بدلتے ہوئے ماحول سے ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کر سکتا ہے۔ اس طرح ابتدائی تربیت کے ہر پہلو کی اہمیت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تجربوں کی ایک ایسی اسکیم مرتب کرنا نہایت اہم ہے جو محض بنیادی نظریات کی شکل رکھتی ہے۔ اور جو بچے کو ہم آہنگی کے مشکل اور دشوار گذار راستوں سے گذرنے میں مدد دے "بیت الاطفا

بچوں کے لئے اسی اصول کو اختیار کرلیا ہے، جہاں بچے کو مفید چیزیں دے دی جاتی ہیں اور
مختلف تجربوں کی مشق کرتا ہے، اس طرح وہ اپنی اس مشق سے بہت کچھ سیکھتا ہے اور طرح طرح کے تجربے
کرتا ہے، اس طرح اگر ایک شخص فی الواقع ترقی کی راہ پر گامزن رہنے کا آرزومند ہے تو وہ اپنی انفرادیت کی تعمیر و
میں سرعت اور تیزی سے آگے بڑھتا ہے۔ اور اس کے ذہن میں ہر وقت کلچر اور تہذیب و تمدن کے ضروری
رہا کرتے ہیں۔ یہ اشیا، جیسے بالعموم پند آمیز یا معلمانہ سواد کہا جاتا ہے اور محولہ بالا مشقیں تعلیم کے جسی
پہلو کی تربیت و توسیع کا سامان بہم پہنچاتی ہیں۔

جزا و سزا | مانتسوری سزا و جزا کے اس نظریئے کی قائل نہیں جس میں سیرت خود ہی ایک بہت بڑا
ہے جو معلم بچہ حاصل کرتا ہے۔ وہ اس کا سب سے بڑا انعام ہے۔ سزا کے سلسلے میں مانتسوری کے نظریات کم و بیش
کسی غیر معمولی کردار کی اصلاح کے لئے خارجی اثر کے استعمال کو بالکل پسند نہیں کرتی۔ بلکہ وہ بچے میں ایسی
صلاحیت پیدا کرنے کی خواہاں ہے کہ بچہ خود بخود اپنے کردار کی تہذیب کرسکے۔

حرکات ترقی کا ذریعہ ہے | ڈاکٹر مانتسوری بچے کی ذہنیت اور شخصیت کی تعمیر و تربیت کے لئے
عملی کی مشق کو ایک وسیلہ سمجھتی ہے، کیونکہ مشق اسے اپنے ماحول کو سمجھنے اور اس کے کاروبار کو سنبھالنے
دیتی ہے۔ ان مشاغل کا بنیادی اصول حرکات کی ہم آہنگی ہے۔ وہی حرکات جو اس کے بالارادہ ضبط میں ہوتی
جس میں ذہنی تعامل کو شامل کیا جاتا ہے، یہ تمام حرکات کی ذہین و زیرک مقصد کے ماتحت جنبش میں لائی جاتی ہیں
ہے کہ بچہ ان مشقوں کے مقاصد سے واقف نہیں ہوتا، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ فطرت بچے کو خود بخود اس
کا شائق بنا دیتی ہے جس کی مشق اسے مقصود ہوتی ہے، ان مشقوں کا نفسیاتی پہلو وہ سکون و اطمینان ہے
بچہ محسوس کرتا ہے، جب اعصابی حرکات یہ وہ مختلف قسم کی مطابقت پیدا کرلیتا ہے تو اس اطمینان کے محسوس
کے لئے وہ ایک مشق کو بار بار دہراتا ہے اور اس طرح وہ ذہنی اور جسمانی عمل کو پورا کرتا ہے۔

(ب) مطابقت کے علاوہ ترقی کا ایک اور اہم وسیلہ محویت ہے۔ محویت سے یہ مقصود ہے کہ بچہ اپنی تمام توجہ کسی
حرکت کی جانب منعطف کردے۔ منفصل حرکات کی تکمیل سے مراد ایک حرکت کو دوسری منفصل حرکات سے
کرنا ہے، دوسرے لفظوں میں بچہ حرکات کا تجزیہ ان سب کو مربوط کرنے کے لئے کرتا ہے۔ ماہرین نفسیات

نے دریافت کیا ہے کہ ایک چھوٹے بچے کے لئے حرکات کی ایسی تفصیلات جن میں ذہنی استغراق کی ضرورت ہوتی ہے بہت اہم فرائض سرانجام دیتی ہیں، استغراق بچے کو ذہن و جسم پر ضبط قائم رکھنا سکھاتا ہے۔ اس ضبط کے بغیر بچہ ایک جنونی شخصیت کو تربیت نہیں دے سکتا ہے۔ شخصیت کی صحیح ترقی و توسیع کے لئے عملی مشق بہت زیادہ اہم ہوتی ہے۔ ان کے ذریعے بچہ اپنی تمام نام نہاد حرکی، حسی، ذہنی، جذبی، ارادی صلاحیتوں کو ایک مقام پر مرتکز کرتا ہے۔ پھر ان کو ایک مرکز (ذہن) پر لا کر ان میں ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کرتا ہے۔ ایسی مکمل مطابقت ایک طبعی اور متوازن شخصیت میں ہی ہو سکتی ہے۔

۴۔ **مشقیں** | ڈاکٹر مانتسوری نے عملی زندگی کی مشقوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے، جس کے ذریعے بچے کی شخصیت کی تعمیر کی جا سکتی ہے۔ اس کی فہرست کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ گروہ بچے کی شخصیت کے کسی ایک پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ گروہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ ابتدائی حرکات، آدابِ نشست و برخاست، اور کس طرح خاموشی سے چلنا چاہیے۔ وغیرہ
۲۔ روزمرہ استعمال کی اشیاء کے استعمال کی مشقیں، مثلاً گلاس، جگ، چمچی وغیرہ
۳۔ مزید مشقیں جن میں مخصوص مہارت، و تکنیک کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک چیز کو ایک ہاتھ میں کس طرح لے جاتے ہیں، پانی کس طرح انڈیلنا چاہیے، چاول کس طرح نکالنے چاہئیں۔
۴۔ چیزوں کو تہہ کرنا اور کھولنا، جانماز یا میز پوش کو کس طرح تہہ کرنا، دروازہ کس طرح کھولنا یا بند کرنا چاہیے۔
۵۔ خود نگہداری کے متعلق مشقیں، مثلاً ہاتھ کس طرح دھونا چاہئے، لباس کس طرح پہننا چاہیے، بٹن بند کرنا، مختلف اقسام کے لباس
۶۔ ماحول کی نگہداشت کے متعلق مشقیں، جھاڑنا، گرد و غبار صاف کرنا، فرنیچر اور ظروف کی دیکھ بھال کرنا۔
۷۔ باغ باغ کو کس طرح سنوارنا چاہیئے۔
۸۔ جماعت کی سماجی زندگی کے متعلق مشقیں، مثلاً گفتگو کس طرح کرنی چاہیے، کسی سے کوئی چیز کس طرح مانگنی چاہیے، کسی سے اجازت کس طرح طلب کرنی چاہیے (۹) کھانے کی تیاری اور دستر خوان پر کھانا چننے کی مشقیں
۱۰۔ بیرونِ مدرسہ کی مشقیں، مثلاً کسی جلوس میں دو یا تین قطاروں میں چلنے اور مل جل کر سڑک کو پار کرنے کے آداب۔

(انگریزی سے ترجمہ) (احسان اللہ)

مصری تعلیم اور دورِ جدید

مختار علی جعفری

مصر دوسرے اسلامی ممالک کے مقابلہ میں ایک ترقی یافتہ ملک ہے، اس ملک میں گو مغربی علوم و فنون کی تعلیم کیلئے یونیورسٹیاں قائم ہیں تو اسی سرزمین پر جامعہ ازہر بھی موجود ہے جہاں اسلامیات، عربی اور دیگر مشرقی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے، اس لئے مصر میں بیک وقت دو دبستان خیال کے پیرو پائے جاتے ہیں۔ قدیم مصری تہذیب اخوت اور مساوات کے اصولوں کو تسلیم ضرور کرتی تھی، مگر اسلامی تہذیب نے ان اصولوں کو عملی جامہ پہنایا ہو گا جمہوریت کے دلدادہ ہیں، مگر ابھی تک جمہوریت زندگی کے ہر شعبہ پر اثر انداز نہیں ہوئی۔

سائنس کو مصری نصاب تعلیم میں نمایاں جگہ دی گئی ہے تاکہ اس کے ذریعہ نوجوانوں میں قوتِ فکر پیدا ہو، اور وہ قدامت پسندی، غلط اعتقادات اور توہمات کی حد سے گذر کر تحقیق اور جدت کے میدان میں پہنچ جائیں۔ اور اس طرح وہ اپنی ملکی روایات و خصوصیات کے حامل ہوتے ہوئے ملک اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے سعی کر سکیں۔

مندرجہ ذیل مضمون تعلیمی سالنامہ ۱۹۵۱ء سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ فاضل مصنف ابو الفتوح رضوان نے اس مضمون میں مصری تعلیم کے پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے قدیم اور جدید مصری تہذیب کا تجزیہ کیا ہے۔ اور اس بات پر زور دیا ہے کہ مصری تعلیم، تہذیب اور معاشرہ کی اصلاح کیلئے صحیح اسلامی روح ازبس ضروری ہے، آخر میں فاضل مصنف نے تعلیم کے اغراض و مقاصد اور ان کے حصول کے ذرائع پر روشنی ڈالی ہے :-

مصر میں تہذیب جدید کا مفہوم

انیسویں صدی میں مصری تہذیب میں جو انقلاب آیا، مصر صدیوں سے دنیا کی تہذیب کے دھارے سے الگ تھلگ تھا، مغرب کے اچانک اور زبردست تصادم نے اس کی تہذیب میں انقلاب پیدا کیا۔ نپولین جب مصر پر حملہ آور ہوا تو اس کی مادی فتوحات کے ذریعہ تہذیب جدید ملک پر اثر انداز ہوئی، یہ انقلاب مصری تہذیب کے تقریباً تمام پہلوؤں پر اس حد تک غالب آیا کہ اس زمانے کے یورپین مصنفین نے اسے مصری انقلاب کے نام سے موسوم کیا ہے، اور بعض لوگوں نے کہا کہ مصر نے دوبارہ جنم لیا۔ خدیو اسمٰعیل نے بیان کیا ہے کہ مصریوں کو خود یہ خیال ہو گیا تھا کہ ان کا ملک اب جزو افریقہ نہیں بلکہ یورپ کا جزو ہے۔

فرانسیسیوں کی آمد نے تہذیب قدیم کو ایک سخت آزمائش میں ڈال دیا لیکن اس آزمائش نے قوم کو دائمی طور پر انقلاب کی راہ پر گامزن کر دیا۔ انیسویں صدی کا نصف اول اس انقلاب کی پہلی منزل تھا جس کا تعلق تہذیب جدید کے مادی پہلو سے رہا۔ یہی وہ پہلو تھا جو سب چیزوں سے زیادہ مصریوں کی نظروں میں سمایا۔ محمد علی نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ مصر کو اتنا مضبوط کر دے کہ وہ بیرونی حملہ سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ علاوہ ازیں اس کی خواہش تھی کہ سلطنت عثمانیہ میں سے (جس کا شیرازہ بکھر رہا تھا) مصر کو بھی حصہ ملنا چاہیے اور اس کو مصریوں کا وہ جائز حق تصور کرتا تھا۔ مصر نے اپنی عظمت کا اظہار دو جانب یعنی فوج اور سائنس سے کیا چنانچہ سب سے پہلے اس نے ایک مضبوط فوج تیار کرنے اور اس کے لئے ساز و سامان مہیا کرنے کی غرض سے سائنس کی استعمال کی طرف توجہ کی۔ بڑی فوج کے لئے رسد کی بھی ضرورت تھی، پس قرون وسطیٰ کے دستکاروں کی انجمنوں اور چھوٹی گھریلو صنعتوں کی جگہ موجودہ زمانے کے کارخانوں نے لے لی۔ یورپ میں صنعتی انقلاب بڑے زوروں پر تھا اور اس کا جواب مصر میں تھا۔ کاتنے اور بننے کے کارخانے بہت سرعت سے قائم کئے گئے۔ مشینیں، اوزار، کاتنے سے متعلق ساز و سامان، کپڑا بننے کی مشینیں حتیٰ کہ دخانی انجن بھی ملک میں بنائے اور درست کئے جا سکتے تھے۔ اس وقت سے مصر مادی ترقی میں یورپ کے ساتھ قدم بقدم چلنے کی سعی کرتا رہا ہے۔ مصر میں سنہ ۱۸۵۷ء میں ریل گاڑیوں اور سنہ ۱۹۰۳ء میں موٹر کاروں کا رواج ہو گیا تھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ بہت سے مغربی ممالک میں ان کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر کو مصر میں جدت پسندی کی دوسری منزل قرار دیا جا سکتا ہے، تحریک موجودہ تہذیب

[...] پہلو سے متعلق تھی۔ ذی فہم حضرات جن کی تربیت انقلاب کی پہلی منزل کے اسکول میں ہوئی تھی اب جدید تہذیب
کے ایک دوسرے اہم پہلو کی جانب متوجہ ہوئے۔ خانگی مسئلوں کے دباؤ کے ماتحت جن کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ سیاسی
استبداد کا نتیجہ ہیں انھوں نے جمہوری اداروں کے قیام کے لئے پرزور مطالبہ کیا بالآخر ۱۸۶۶ء میں ایوان الاکابر (CHAMBER
OF NOTABLES) کے نام سے ایک نمائندہ جماعت کا قیام عمل میں آیا، تاکہ وہ عوام کی جانب سے حکومت کے کام
میں شرکت کرے۔ اس زمانے کے ایک اہل نظر نے اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

"مشرقی ممالک میں جتنے تجربات کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک نہایت ہی قابل غور تجربہ ہے"
۱۸۷۸ء میں یہ اصول منوالیا گیا کہ حکومت کی ذمہ داری وزراء پر ہونی چاہیئے۔ چند سالوں میں یہ تحریک اس قدر مضبوط ہو گئی
کہ ۱۸۸۱ء میں جب خدیو توفیق نے "ایوان الاکابر" کا اجلاس بلانے سے انکار کر دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی ایک
عظیم انقلاب آیا، گو ابتداء میں جمہور کے مفاد کو غیر ملکی حکومت کے ذریعہ دبا دیا گیا، لیکن اس امر کے شواہد مسلسل ملتے ہیں کہ
جمہوریت کی جڑیں بلا شک وشبہ بہت گہری جا چکی تھیں۔ اور پھر دوبارہ وہ ۱۹۲۳ء میں پھوٹ نکلیں، جب مصر میں بادشاہ
کی حیثیت آئینی ہو گئی، اور ہر شخص کو رائے دینے کا حق دیا گیا۔

اس طرح مصر میں اس کے تاریخی ارتقا کے واقعات کی روشنی میں موجودہ تہذیب سے دو باتیں مراد ہیں:۔

(۱) سائنس اور صنعتی فنون کا علم جن سے قدرتی وسائل کو ترقی دی جاسکے۔ اور

(۲) جمہوری ادارے جو استبداد کی روک تھام کرسکیں۔

جدت پسندی کی جانب عوام کا رجحان

ظاہر ہے کہ موجودہ مصر کے از سر نو جنم کی ذمہ دار قدیم اور قرون وسطیٰ کی تہذیب کی روایات ہی نہیں بلکہ
بڑی حد تک اس کی ذمہ دار مغرب کی اجنبی تہذیب کی کوکھ بھی ہے، فطری طور پر پرانی تہذیب جس کی جڑیں گہری جا
چکی تھیں آسانی سے گہری تہذیب کے سامنے ہتھیار ڈالنے یا اس کے لئے راستہ چھوڑنے پر رضامند نہ تھی۔ حقیقت
یہ ہے کہ جب کبھی مغربی اصول کی ٹکر ایسی قدروں سے ہوئی جنہیں قدیم تہذیب عزیز رکھتی تھی تو اس نے بہت زور
سے اس کا مقابلہ کیا۔

ابتدا ہی سے کچھ لوگ اس تحریک کے حامی بھی تھے اور مخالف بھی۔ پیٹن (PATON) نے ذکر کیا ہے کہ علماء

ایک خاص گروہ نے جن میں سے کچھ نے اپنی اعلیٰ ذہانت، کچھ نے نیک طبیعت اور باقی نے اپنی طمع کی وجہ سے اس انقلاب کے لانے میں ایک بہت اہم حصہ لیا، شیخ حسن العطار (SHAYKH HASAN AL-ATTAR) (جو جامعۂ ازہر کے ایک پروفیسر ہیں اور بعد میں اس کے ریکٹر (RECTOR) بھی رہے ہیں اور شیخ رفاعہ الطہطاوی (SHAYKH RIFA'AH AL-TAHTAWI) اس رجحان کی نمایاں مثالیں ہیں، اس کے برعکس چند اور علماء نے علم تشریح (جس میں چیر نا پھاڑنا ضروری ہے) کی مخالفت مذہبی وجوہ کی بنا پر کی کہ اسلام مردہ کی بے عزتی نہیں کرتا اور قطع و برید کی مخالفت کرتا ہے ہیمونٹ (HAMANT) ذکر کرتا ہے کہ جانوروں کے علاج اور زراعتی درسگاہوں کی بھی اسی طرح مخالفت کی گئی، انیسویں صدی میں مصر میں رسم غلامی کے انسداد کی اسی طرح پرزور مخالفت کی گئی۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اسلام مذہب کی حیثیت سے موجودہ تہذیب کا مخالف ہے؟ اس پر مندرجہ ذیل فصلوں میں بحث کی جائے گی، یہاں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ جدت پسندی کے تقریباً سب پہلوؤں کو تسلیم کرنے اور ان کی حمایت کرنے سے انہیں اسلامی روایات کے حقیقی اجزا ثابت کیا گیا، تصادم در اصل اسلام اور سائنس اور جمہوریت کے درمیان نہ تھا، بلکہ انسانی تہذیب کے جدید پہلوؤں اور اس جہالت اور تعصب کے درمیان تھا، جو ترکی حکومت کے ماتحت زمانۂ تاریکی میں مسلم عوام میں پھیل گیا تھا۔

اسلام اور سائنس

سائنس کی تعریف یا مذمت میں قرآن اور احادیث رسولؐ میں کوئی چیز واضح طور پر نہیں پائی جاتی، لیکن یقیناً بہت سی آیات علم اور تعلیم تفحص اور تحقیق کی تعریف میں پائی جاتی ہیں، اس کے برعکس ایسی آیات بھی پائی جاتی ہیں جن کے ظاہری معانی سائنس کی بعض معلومات کے مطابق نہیں ہیں، اس لئے زیادہ تر انحصار اس بات پر ہے کہ مختلف زمانوں میں مسلمان ان کا کس طرح ترجمہ کرتے رہے ہیں اور کیا مطلب لیتے رہے ہیں۔

اسلام کے عروج کے بعد بہت جلد ہی مسلمانوں نے یونانی سائنس اور فلسفہ کو اپنی تہذیب میں جذب کرنا شروع کیا۔ انہوں نے تقریباً تمام یونانی زبان کے اہم مضامین کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ علوم کی تعلیم جن میں طب بھی شامل تھی مساجد میں دی جاتی تھی اور ہر بڑی مسجد میں فلسفہ سائنس اور مذہب کی کتب پر مشتمل ایک لائبریری ہوتی تھی

یونانی کتب کی نقل کرنے کے لئے ہر ملک میں مشن بھیجے جاتے تھے۔ مسلم خلفاء مثلاً المنصور، ہارون الرشید اور المامون نے سائنسدانوں اور مترجمین کی سرپرستی کی اُس کا ذکر تاریخ کی کتب میں پایا جاتا ہے۔ ان مترجمین میں بہت سے یہودی۔ عیسائی اور صابی تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان علم کے سلسلہ میں قومیت مذہب یا جائے پیدائش کی تفریق سے بالاتر تھے۔ بے دین یونانیوں کی تصانیف اور غیر مسلم علماء کی ترجمہ شدہ کتابیں مساجد میں پڑھائی جاتی تھیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مسلم سائنسدانوں نے مختلف علوم مثلاً علم الکیمیا، نباتات۔ طبیعات، معدنیات، ریاضی اور علم نجوم میں کافی کام کیا۔ مسلم سائنسدان مثلاً الرازی اور ابن سینا سترھویں صدی کے آخر میں طب میں اُستاد مانے جاتے تھے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے سائنس کا عملی طور پر خیر مقدم کیا۔ اس دلچسپی کے صریح مظاہرہ کا علم ان تصانیف سے ہوتا ہے جو مشہور مسلم علمائے دین مثلاً قرون وسطیٰ (۱۱۱۱ئہ) میں الغزالی اور زمانۂ حال (۱۹۰۵ء) میں شیخ محمد عبدہ کے قلم کا نتیجہ ہیں۔ مثال کے طور پر الغزالی نے لکھا ہے۔

"علم ریاضی حساب، جیومیٹری اور نقشہ عالم (COMOGRAPHY) پر مشتمل ہے اور ان میں کوئی چیز ایسی نہیں جو مذہب کی تردید یا تصدیق کرتی ہو۔ یہ علوم ایسے ہیں جن کے ثبوت دیئے جا سکتے ہیں۔ اور کوئی آدمی بھی جو ان علوم کو حقیقتاً سمجھتا ہو ان سے انکار نہیں کر سکتا"

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ ان علوم کو مسترد کر کے اسلام کی تائید کرتے ہیں وہ مذہب کے خلاف گناہ عظیم کے مرتکب ہوتے ہیں کیونکہ مذہب نہ ان کی تردید کرتا ہے نہ تائید، اور مذہب میں نہ ان علوم کا کوئی ذکر ہے اور نہ ان علوم میں مذہب کا۔

طبیعی یا قدرتی علوم کے متعلق اس نے لکھا ہے۔

چونکہ مذہب اس بات کا مطالبہ نہیں کرتا کہ علم الادویہ کو مسترد قرار دیا جائے، ان علوم کی تردید کرنا مذہب کی ضروریات میں داخل نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح شیخ محمد عبدہؒ نے لکھا ہے۔

کائنات میں خداوند تعالیٰ کی نشانیوں کا ذکر قرآن میں عمومی طور پر اس لئے آیا ہے کہ اس سے اخلاقی بلندی یا بنی نوع انسان پر جاری رہنے والے فیض کی یاد دہانی ہو یا اُن میں غور و فکر کی قوت پیدا ہو اور سکا

مقصد قوانین فطرت کا بیان کرنا یا کائنات کے متعلق کوئی خاص عقیدہ لوگوں کے سر منڈھنا نہیں۔

اپنے فلسفہ کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے اُس نے ذکر کیا ہے ۔

خدا نے اپنے نور کی تکمیل کا وعدہ کیا ہے اور دنیا کا خاتمہ نہیں ہوگا تاوقتیکہ خدا کا وعدہ مذہب اور سائنس کی شرکت اور تعاون کے ذریعہ عقل اور جذبات دونوں کی اصلاح کی شکل میں پورا نہ ہو جائے ۔

سائنس کی معلومات اور مذہبی آیات کے ظاہری معانی میں تناقض پیدا ہونے کی حالت میں مسلم علماء دین نے بہت ہی دلچسپ حیثیت اختیار کی، اس حیثیت کا ذکر محمد فرید وجدی نے بہت اچھے طریق پر ان الفاظ میں کیا ہے ۔

اسلام نے عقل کو قیود سے آزاد کرکے اور اس کو مکمل فرمانروائی عطا کرنے کے بعد اس کو تسلیم کیا کہ عقل کے ذریعہ انسان ایسے اصولوں اور نظریوں پر بحث کر سکیگا جو قرآن کے ظاہری لغوی معانی کے خلاف ہوں اسلئے ان حضرات نے جو اس مذہب کے ماہرین اسرار تھے اپنی اصول کی کتابوں میں ایک عام قاعدہ وضع کیا۔ یہ قاعدہ ذیل میں درج ہے :-

جب استدلال کے نتائج اور قرآن وحدیث کے ظاہری معانی میں تخالف ہو تو استدلال سے جو نتائج مستنبط ہوں ان کو ترجیح دی جائے اور متن کو نئے معانی پہنائے جائیں ۔

جامعہ ازہر جو اسلامی دینیات کے لئے قلعہ کی مثل ہے، اُس کے نصاب تعلیم میں قدرتی علوم کو جو نمایاں جگہ دی گئی ہے، اس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ سائنس کی سرکاری حیثیت کیا ہے، آج مصر میں کوئی ایسا مسلم عالم دین نہیں جو مسئلہ ارتقا کی تعلیم کی مذمت کرے اور موجودہ طبی خدمات کی مخالفت اس بناء پر نہیں کی جاتی کہ شفا بخشنا مذہب کا کام ہے ۔

اسلام اور جمہوری ادارے

موجودہ جمہوری اداروں کی بنیاد محکوم کی رضامندی کے نصب العین پر قائم ہے۔ اسلامی سیاسی نظریہ کی بنیاد اسی نصب العین پر قائم کی گئی تھی، اس نظریہ کے مطابق حکومت خدا کی ہے۔ خدا کی حکومت کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کسی بادشاہ یا مولوی کی ملکیت نہیں۔

اس طرح کسی شخص کو حکومت کرنے کا کامل حق نہیں پہونچتا۔ اہلِ بیت رسول صلعم کو بھی یہ حق نہ تھا کہ مسلمانوں کے اس معاملہ کو لوگوں پر چھوڑ دیا کہ وہ جسے چاہیں انتخاب کریں، حاکم وہ شخص ہو سکتا تھا جو خدائی معیار انصاف کے مطابق سب سے زیادہ قابل قبول ہو، جب تک کوئی شخص حکومت کے لئے جائز حق نہ جتا سکتا ہو تو فرمانروا کے انتخاب کا آخری حق عوام کو پہونچتا ہے، حاکم جس کا انتخاب اس طرح عمل میں آئے اپنے معاملات کے انصرام میں لوگوں کی رائے لیتا رہتا ہے۔

فرمانروا کو یہ حق تھا کہ وہ لوگوں سے اطاعت کرائے، مگر محض اس شرط پر کہ وہ عوام کے مفاد کے لئے قوانین شریعت کا پابند ہو، جب حاکم انہیں کسی اصلاح یا مصلحت کی حد امکان سے زائد مطمئن کرنے میں ناکام رہے تو یہ خیال کیا جاتا تھا کہ عوام کو پورا پورا حق ہے کہ وہ اسے معزول کر دیں۔ انتخاب، مشاورت اور رضامندی کے بغیر کسی آدمی کو حکومت کرنے کا حق نہیں پہونچتا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ نے جو افتتاحی خطبہ دیا اس سے ظاہر ہے کہ عوام کی رضامندی حاصل کرنے کیلئے اپیل کرنا ضروری ہے "آپ نے مجھے اپنا حاکم بنایا ہے، مگر میں اقرار کرتا ہوں کہ میں آپ سب سے بہتر نہیں۔ اگر میں صحیح کام کروں تو میری تائید کرو۔ لیکن اگر میں ایسا نہ کروں تو میری اصلاح کرو۔ میری اطاعت اسوقت تک کرو جب تک میں خدا اور اس کے رسول کے قوانین کی پابندی کروں، اور جب میں اُن کو پس پشت ڈال دوں تو مجھے حق نہیں پہونچتا کہ آپ سے اطاعت کراؤں"۔

حضرت عمرؓ ابن الخطاب نے بھی اسی انداز میں فرمایا:۔

"اگر آپ مجھ میں کوئی کجی پائیں تو اپنی تلواروں سے مجھے سیدھا کر دیجئے"۔

جب حضرت عثمانؓ نے مشاورت اور مساوات کے اصولوں کو نظر انداز کر دیا تو لوگ حضرت عمرؓ کے فرمان پر حضرت عثمانؓ کے خلاف عمل پیرا ہوئے۔

یہی حکومت کا اسلامی نصب العین ہے، یہ کہنا بیکار ہے کہ تاریخ اسلام کے آخری خصوصاً ترکوں کے زمانے میں اس نصب العین پر عمل نہیں کیا گیا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ شکل اور طریق کی کمی کے باوجود اسلامی نصب العین میں جو آج بھی مصریوں کے لئے مشعل راہ ہے جمہوری اداروں کا بنیادی فلسفہ شامل ہے۔

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

چند نادر اردو کتب کی اشاعت

حکومت پاکستان کے شعبۂ تعلیم نے "ترقی اردو فنڈ" کے ماتحت ۷۲۵۰۰ روپیہ کی رقم دینا منظور کرلی ہے، یہ رقم بعض نادر دکنی اور کلاسکی اردو ادب اور اردو میں روزمرہ سائنس کی کتابوں کی اشاعت کے لئے مخصوص کر دی گئی ہے، اس رقم میں سے حکومت نے ۳۲۵۰۰ روپیہ انجمن ترقی اُردو پاکستان (کراچی) کو دکنی اُردو کی دس کتابوں کی چھپائی کے لئے اور ۴۰۰۰۰ روپیہ اکادمی پنجاب کو اردو کی بیش قیمت اور نادر ادبی کتابوں کی اشاعت کیلئے دینا منظور کیا ہے اور اس کی فی الفور ادائیگی کا حکم جاری کر دیا گیا ہے،

ان کتابوں کی اشاعت کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی اور یہ مدت مدید سے کم یاب بھی ہیں۔

اس کے علاوہ روزمرہ سائنس کا ایک سلسلۂ مضامین جاری کرنے کے لئے حکومت نے انجمن ترقی اردو کو مزید ۵۰۰۰ روپے دیئے ہیں، یہ منصوبہ ۷ کتابوں پر مشتمل ہوگا جو سائنس کے مختلف موضوعات پر لکھی جائیں گی، ان کی تدوین و ترتیب کا کام مشہور و معروف ماہرین فن کے سپرد کیا جائے گا، جب یہ کتابیں مرتب ہو جائیں گی تو ماہرین کی ایک کمیٹی ان سب کا جائزہ لے گی، کمیٹی کی منظوری کے بعد کتابیں شائع کر دی جائیں گی، ہر کتاب کم و بیش ۷۵ صفحات پر مشتمل ہوگی، اور اس کی ایک نمایاں خوبی یہ ہوگی کہ کتاب روزمرہ سائنس کے متعلق غیر اصطلاحی زبان میں لکھی جائیگی اور خط نسخ میں چھاپی جائے گی جس میں حسب ضرورت توضیحی اشکال بھی ہوں گی۔

ان سب کتابوں کو ایک سال کی مدت میں مکمل ہو کر چھپ جانا چاہئے، اس زر امداد دینے کا مقصد یہ ہے کہ ملک کی ادبی انجمنیں اردو ادب کو ترقی دینے کے لئے مخصوص منصوبے بنائیں اور انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کریں، "ترقی اردو فنڈ" کے ماتحت حکومت کے شعبۂ تعلیم اور مختلف یونیورسٹیوں کے درمیان اردو کی ترویج و ترقی کی دوسری اسکیموں کے متعلق گفت و شنید ہو رہی ہے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) حسب ذیل دکنی ادب کی اشاعت کرے گی :—

[illegible]	ابن نشاطی	۴۔ سیف الملوک	غواصی	۷۔ قطب مشتری	وجہی
[illegible]	غواصی	۵۔ گلشن عشق	نصرتی	۸۔ سب رس	وجہی
[illegible]	وجہی	۶۔ خوب ترنگ	خوب محمد	۹۔ من لگن	محمود بحری

۱۰۔ کلیات ولی ——— ولی دکنی

اکادمی پنجاب کتب ذیل کی اشاعت کی ذمہ دار ہو گی، یہ کتابیں اردو میں ادبیات عالیہ کا درجہ رکھتی ہیں۔

۔دیوان شاہ نصیر	۸۔ فغان بہ دہلی معاصرین غالب	۱۵۔ حیات جاوید حالی
۔کلیات جرأت	۹۔ تذکرہ گلشن بے خزاں قطب الدین	۱۶۔ سر سید اور ان کے رفقا
۔دیوان شیفتہ	۱۰۔ میر امن	۱۷۔ انتخابات شاہ عظیم آبادی
۴۔ کلیات میر حسن	۱۱۔ سخن سرا عبد الغفور شاہ	۱۸۔ انتخابات خان بہادر ناصر علی دہلوی
۵۔ دیوان شاہ حاتم	۱۲۔ زاد کامل عیار مظفر علی اسیر	۱۹۔ مجموعۂ نواب ناصر علی خیال
۶۔ انتخابات کلیات مصحفی	۱۳۔ مطالعۂ غالب	۲۰۔ کاشف الحقائق امداد امام اثر
۷۔ شعرائے مرثیہ نگار	۱۴۔ داستان غدر ظہیر دہلوی	

انجمن ترقی اردو حسب ذیل چھ سائنس کی کتابوں کی بھی اشاعت کرے گی جو مختلف موضوعات پر ہوں گی

۱۔ سیر فلک (JOURNEY THROUGH SKY)

۲۔ ذرۂ عظیم (THE MIGHTY ATOMIC ENERGY)

۳۔ ایجادوں کی کہانیاں (STORIES OF INVENTIONS AND DISCOVERIES) خاص اور اہم سائنسی دریافتوں کے متعلق۔

۴۔ موسمیات (METEOROLOGY) اس موضوع پر اردو میں اور کوئی دوسری کتاب موجود نہیں ہے، یہ کتاب اس موضوع کے ہر پہلو پر روشنی ڈالے گی۔

۵۔ حیوانی عجائبات (WONDERS OF THE ANIMAL WORLD) جانوروں کے متعلق اہم اور عجیب حقائق

۶۔ کیمیائی کرشمے (MARVELS OF CHEMISTRY) علم کیمیا کے تجربات اور دریافتوں

کے متعلق ضروری تفصیلات۔

پنجاب کا پانچ سالہ تعلیمی جائزہ

اس صوبے میں تعلیم کو عام کرنے کی کوشش برابر جاری ہے تعلیم کا میزانیہ دو کروڑ روپے (۴۷ - ۱۹۴۶ء) سے بڑھ کر تین کروڑ روپے (۵۲ - ۱۹۵۱ء) ہو گیا ہے تعلیمی سہولتوں کی توسیع میں جو کامیابی اب تک حاصل ہوئی وہ حسب ذیل مختلف شعبوں پر مشتمل ہے ۔

۱۔ تقسیم ملک کے بعد ۲۵۰۰ نئے مدارس اور ۲۱ نئے کالج قائم کئے گئے۔

۲۔ مہاجر طلبہ کو کم و بیش ۳۶۰۰۰۰۰ روپوں کی مدد دی گئی ۔

۳۔ چھ نئے نارمل اسکول مردوں کے لئے اور دو عورتوں کے لئے کھولے گئے جو ۱۰۰۰ مردوں کو اور ۹۰۰ عورتوں کو تعلیمی تربیت دے رہے ہیں۔

۴۔ ۶۸ ہمہ وقتی اور ۲۵۲ قلیل وقتی مدارس بالغاں کا انتظام کیا گیا ۔

۵ ۔ حکومت نے پاکستان آرٹ کونسل، یوم اقبال اور پنجاب لٹریری لیگ کو امدادی رقوم دی ہیں، مذہبی کتابوں کی اشاعت کے لئے اسلامیات کا ایک نیا شعبہ قائم کیا گیا ۔

تعلیمی توسیع و ترقی کا چھ سالہ منصوبہ تیار کیا گیا ہے ۔ اور حسب ذیل پروگرام کے ماتحت اس کی تکمیل کا سلسلہ جاری ہے ۔

۱۔ ہر سال ۱۲۰۰ پرائمری اسکول کھولے جائیں گے ۸۰۰ لڑکوں کے لئے اور ۴۰۰ لڑکیوں کے لئے ۔

۲۔ ہر سال ۵۰ مڈل اسکول ۱۲ ہائی اسکول کھولے جائیں گے، اس کے علاوہ موجودہ اسکولوں کی توسیع اور تعمیر میں اضافے کا کام بارہ لاکھ روپے کی لاگت سے فی الفور شروع کیا جائے گا ۔

۳۔ دو نئے ڈگری کالج حسن ابدال میں ایک پری کیڈٹ کالج ۔ سہالہ (ضلع راولپنڈی) میں ایک انجینئرنگ کالج گلبرگ کالونی میں عورتوں کی تربیت کے لئے ہوم اکنامکس کالج اور ایک دوسرا فزیکل ایجوکیشن کالج (عورتوں کے لئے) قائم کئے جائیں گے

۵ لاکھ روپے سے سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کی توسیع کی جائے گی۔

انگلستان اور ویلز میں نئے مدارس

انگلستان کی وزارت معارف نے اٹھاسی نئے مدارس کی عمارتوں کو منظور کر لیا ہے، اس طرح مہینے میں کم و بیش بارہ مدارس کھلتے رہیں گے، اور اگر ترقی کی یہی رفتار جاری رہی تو ایک سال میں ۱۲۰ — ۱۵۰ مدارس کے قیام کا اہتمام ہو سکتا ہے، حالانکہ یہ ضرور ہے کہ ان مدارس کی تعمیر میں کافی وقت لگے گا، کسی میں کم کسی میں زیادہ، لیکن خیال یہ ہے کہ ان میں سے کچھ ۱۹۵۳ء تک مکمل ہو کر تعلیمی خدمات سرانجام دینے لگیں گے، اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر مدارس کی تعمیر کی رفتار یہی رہی تو ۱۵ مدارس کم و بیش ۴ لاکھ سے ۵ لاکھ طلبہ کی تعلیم و تربیت کا انتظام کر سکیں گے۔

مسئلہ ڈرہم

ڈرہم کا مسئلہ ایک مدت سے چلا آرہا ہے اور پچھلے چند مہینوں میں کچھ نیا جوش و خروش اور گرما گرمی پیدا ہو گئی تھی، کاؤنٹی کونسل نے انڈسٹریل ڈسپیوٹس آرڈر ۱۹۵۱ء (INDUSTRLAL DISPUTES ORDER 1951) کی رو سے اس تنازعہ کو وزیر محنت کے سپرد کر دیا، جہاں تک معلمین کا تعلق ہے ابھی یہ واضح نہیں ہوا کہ اس سلسلے میں وزیر محنت کیا صورت اختیار کرے گا۔ اور اس کے فیصلے وزیر معارف کے فیصلوں سے کہاں تک تجاوز کریں گے۔

کاؤنٹی کونسل کے اراکین پروفیشنز جوائنٹ ایمرجنسی اور وزارت محنت کے مابین گفتگو ہوتی رہی، لیکن پریس میں اس کے متعلق اب تک کچھ مزید اطلاعات موصول نہیں ہو رہی ہیں۔ دونوں گروہ اپنی اپنی پوزیشن کا مطالعہ کر رہے ہیں، بہرصورت انجینئر، دائیوں اور نرسوں نے تھوڑے بہت حقوق حاصل کر لئے ہیں، اب دندان ساز طبیب اور معلمین اور ان کی حیثیت ایک سی ہو گئی ہے، انہیں یونین کا ممبر بننے کے لئے رسمی قاعدوں کی پابندی نہیں کرنی ہو گی، جملہ پیشوں کی حیثیت ایک سی ہو گی، مگر بیماری کی رخصت کے لئے قوانین کی رو سے یونین کی رکنیت کے بالواسطہ نفاذ کو ہنوز قائم رکھا گیا ہے۔

این، یو، ٹی حسب ضرورت طول و طویل جنگ کے لئے تیار ہے، اور ضرورت کے مطابق ڈرہم کے ممبروں کی مالی امداد کے لئے ابتدائی انتظامات ہو رہے ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ ۲ شلنگ ۶ پنس کا ہفتہ وار ٹیکس یونین کے ہر ممبر سے وصول کیا جائے گا۔ اور حصول آزادی کے لئے یہ رقم اتنی زیادہ نہیں ہے۔

ایمیل یا روسو کی تعلیم

مسلسل ۱۳

کسی قسم کا وعدہ کرتے وقت بچہ جھوٹ بول ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ اپنے وعدے کی ذمہ داری سے واقف ہی نہیں ہوتا، لیکن جب کبھی وہ وعدہ خلافی کرتا ہے تو یہ معاملہ ہی دگرگون ہوتا ہے، کیونکہ یہ ایک قسم کی دروغ گوئی ماضیہ ہوتی ہے، اس لئے کہ وعدے کا کرنا تو وہ خوب یاد رکھتا ہے لیکن ایفا کی اہمیت کو وہ بالکل نظر انداز کر دیتا ہے مستقبل کو نہ دیکھ سکنے کے باعث معاملات کے نتائج کے متعلق وہ پیش بینی سے کام نہیں لے سکتا۔ اور جب وہ وعدہ خلافی سے کام لیتا ہے تو وہ کوئی بات اپنے شعور و فہم کے مدارج کے خلاف نہیں کرتا۔

لہٰذا بچوں کی دروغ گوئی بالکلیہ ان کے استادوں ہی کی کارگذاری ہوتی ہے، کیونکہ ان کو راست گوئی کی تعلیم ہی دینا فن دروغ گوئی سکھانے سے کسی حال میں کم نہیں ہوتا، بچوں کو دباؤ اور قابو میں رکھنے اور تربیت دینے کی دھن میں آپ مناسب ذرائع استعمال کرنے کا خیال نہیں کرتے، آپ ان کے دلوں پہ بے بنیاد اصولوں اور نامعقول احکام کے ذریعہ تازہ اثرات نقش کرنا چاہتے ہیں اور یہ آپ کی منشا ہوتی ہے کہ جاہل اور صادق القول رہنے کی بجائے وہ اپنے سبق سے واقف ہوں اور جھوٹ بولیں۔

عملی سبق ہم اپنے شاگرد کو محض عملی سبق دیتے ہیں اور ہوشیاری کی بجائے اس کی نیکی کو ترجیح دیتے ہیں، ہم اس سے کبھی راست گوئی کا مطالبہ نہیں کرتے کہ مبادہ وہ اس کو چھپانے لگے اور نہ ہم کبھی اس سے کوئی وعدہ ہی لیتے ہیں کہ کہیں اس کی خلاف ورزی کی اس کو ترغیب ہو، اگر میری عدم موجودگی میں کوئی نقصان ہو جاتا ہے تو میں یہ بھی دریافت نہیں کرتا کہ یہ کس نے کیا ہے؟ میں اس کی بڑی احتیاط

[illegible] کی الزام عائد ہو جائے، نہ میں اس سے یہ دریافت کرتا ہوں کہ کیا تم نے [illegible]

[illegible] کو ایسے سوال سے میں سوائے انکار کے اسے اور کیا سکھا سکتا ہوں؟

اگر اس کی خواہش ہی مجھے اس سے کسی قسم کا راضی نامہ کرنے پر مجبور کرے تو میں اس امر کا بخوبی خیال رکھوں گا کہ جو تجاویز ہمیشہ وہی پیش کرے میں خود کبھی کوئی مشورہ نہ دوں، اور یہ کہ جب کبھی کسی کام کی وہ ذمہ داری لے اس کے پورا کرنے میں ہمیشہ حسب موقع موثر دلچسپی لے، اور اگر کبھی کہیں وہ کوئی خلاف ورزی کر بیٹھے تو اس پر صدمہ گزرنی کہ وہ جو نتائج ظاہر ہو جائیں جن کو وہ مادی اشیاء کے قدرتی نظام کے ذریعہ پیدا ہوتا ہوا دیکھے کہ اتالیق کی قوت انتقام کے نتیجے کے طور پر ایسی شدید اور بے رحمانہ تدابیر اختیار کرنا تو درکنار مجھے تو یقین کامل ہے کہ میرے اسمٰعیل کو برسوں یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ جھوٹ ہے کیا چیز۔ اور جب اس کو اس کا پتہ چلے گا تو وہ حیرت زدہ ہو جائے گا اور اس کا استعمال اس کی سمجھ ہی میں نہ آسکے گا، یہ تو صریحاً واضح ہو چکا ہے کہ میں جس قدر اسمٰعیل کی خوش باشی کو دوسروں کی رائے سے آزاد رکھوں گا اس کے لئے جھوٹ بولنا اتنا ہی غیر سود مند ہوگا۔

تعلیم اور تربیت دینے کی جب ہم کو جلدی نہیں ہے تو کسی اور مطالبے کی بھی ہمیں کیا جلدی ہے اپنا وقت ہم اس طرح بسر کر سکتے ہیں کہ جب تک موزوں اور مناسب حالات رونما نہ ہوں ہم کسی چیز کا مطالبہ نہ کریں اس وقت تک بچہ اپنی تعلیم خود حاصل کرتا رہے گا اور وہ بگڑے گا نہیں لیکن نادان (اتالیق جو اپنے کام کی ابتدا سے بھی ناواقف ہو) اگر بر موقع اور بے موقع اپنے شاگرد سے عہد و پیمان لئے جاتا ہے کہ پہلے یہ وعدہ کرو اور پھر یہ وعدہ کرو اور ان میں کوئی امتیاز نہ کر سکتا ہو تو بچہ حیران اور پریشان ہو کر ان تمام وعدوں کے بوجھ سے دب جاتا ہے اور بالآخر ان کو نظر انداز کر کے فراموش کر دیتا ہے یہاں تک کہ ان سے نفرت کرنے لگتا ہے، اور ایسے وعدوں

۱ے خاص طور پر جبکہ بچہ واقعی قصوروار ہو تو اس سوال سے زیادہ نامعقول اور کوئی سوال نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سوال پر اگر اس کو یہ خیال گذر جائے کہ آپ اس کے فعل سے واقف ہیں تو وہ یہ بھی سوچے گا کہ آپ اس کو جانچنے کی کوشش میں ہیں اور محض یہ تصور ہی اس کو آپ کے خلاف کر دینے کے لئے کافی ہے، اور اگر اس کو یہ خیال ہو کہ آپ اس کے فعل سے لاعلم ہیں تو وہ یہ سوچے گا کہ میں قصور کا اعتراف ہی کیوں کروں؛ پس اس احمقانہ سوال کے لازمی نتیجے کے طور پر دروغ گوئی کی ترغیب ہمیں پہلی مرتبہ ہوتی ہے۔

کے وعدہ کو بے معنی بیان کرتے ہوئے ایک نمونہ کرنے میں دوسرے کی خلاف ورزی کرنے کو کھیل کا درجہ بنالیتا ہے پس اگر آپ چاہتے ہیں کہ اپنے وعدے کو وہ ایمانداری سے پورا کرے تو آپ اپنے مطالبات میں اعتدال سے کام لیں۔ میں نے جھوٹ بولنے کے متعلق جو تفصیل اوپر بیان کی ہے وہ ہر اس فرض کے متعلق بھی استعمال ہوسکتی ہے جو بچوں پر عائد کیا جاسکتا ہے جس کی وجہ سے یہ فرائض قابل نفرت بلکہ ناقابل عمل ہو جاتے ہیں۔ تلقینِ پارسائی کی نمائش کے خاطر آپ ہر بدی کی محبت اس کے دل میں ڈال دیتے ہیں اور آپ ضابطہ کے ذریعہ ان برائیوں کو آہستہ آہستہ ذہن نشین کرادیتے ہیں، چنانچہ جب آپ ان کو نیک اور پارسا بنانا چاہتے ہیں تو خود آپ انہیں گرجا میں لے جانا شروع کردیتے ہیں حتیٰ کہ وہ اس سے جو آجانا چاہتے ہیں، آپ اس کو نماز میں بے سمجھے بڑبڑانا سکھاتے ہیں حتیٰ کہ وہ اس دن کا متمنی رہنے لگتا ہے کہ جس دن اس کو خدا کی نماز ہی پڑھنے کی ضرورت نہ رہے۔ خیرات آپ اس سے اس طرح کراتے ہیں کہ گویا خود آپ دینا ہی پسند نہیں کرتے یہ خیرات بچے کو نہیں بلکہ خود استاد ہی کو کرنی چاہیئے۔ اور بچے سے خواہ کتنی ہی محبت ہو اس اعزاز کے حصول کے لئے آپ کو بچے کی رقابت ضرور کرنی چاہیئے اور بچے کو یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ اس کام کا اہل بننے کے لئے ابھی بہت کم سن ہے اور یہ خیرات کرنا تو ایسے بڑے آدمی کا کام ہے جو اپنی خیرات کی قدر و قیمت سے واقف ہو اور اپنے ہم جنس انسانوں کی ضروریات کا توازن اور اندازہ کرسکتا ہو۔ بچہ جو ان امور سے قطعاً ناآشنا ہوتا ہے اس کو خیرات کا کوئی صلہ حاصل نہیں ہوتا وہ خیرات اور بخشش بغیر تخیل کے بخشش کرتا ہے اور خیرات دیتے ہوئے وہ تقریباً شرماتا ہے، کیونکہ اپنے ذاتی عمل اور آپ کے عمل کو دیکھ کر وہ اس فیصلہ پر پہونچتا ہے کہ خیرات کرنا محض بچوں ہی کا کام ہے، بڑے ہونے کے بعد پھر کسی خیرات اور بخشش کی ضرورت نہیں رہتی۔

بچوں کی خیرات، بخشش یا سخاوت

آپ ذرا بھی غور فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بچہ محض اپنی ان چیزوں کو دے دیتا ہے جن کی اس کے پاس کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی، یہی دھات کے ٹکڑے جو اس کی جیب میں ہوتے ہیں وہ اس کے کسی کام کے نہیں ہوتے، ایک بچہ سو روپیہ دے دیگا لیکن کیک کا ایک ٹکڑا نہ دے گا، بس اس سخی داتا حاتم ثانی کو

[illegible] لئے جن کو وہ مزید رکھتا ہے یعنی اس کے کھو دینے. اس کی [illegible]
[illegible] سا آپ نے اس کو سخی بنا دیا ہے۔ لوگ ایک طریقہ اور بھی استعمال کرتے ہیں
[illegible] دیتا ہے وہ فوراً اسی کو واپس کر دیتے ہیں تاکہ وہ پھر اس چیز کو دینے کا عادی ہو جائے
جس کو [illegible] واپس حاصل کرنا چاہتا ہو یا جس کی بابت یقین رکھتا ہو کہ لازماً وہ اس کو واپس مل جائے گی
[illegible] ایسی شے کی خیرات جس کی اس کو کوئی قدر ہی نہ ہو یا اس شے کی جس کی واپسی کا یقین رکھتا ہو ان
[illegible] قسم کی خیراتوں کے سوا ہم نے کسی تیسری قسم کی خیرات تو بچوں میں اِلّا ماشا اللہ کبھی دیکھی نہ سنی۔
لاک کا بیان ہے۔ "دو معاملات کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ بچہ کو بھی تجربہ حاصل ہو کہ سخی کو سب سے
بڑا حصہ ملتا ہے" اس طریقہ سے بچے میں نمائشی اور دکھاوے کی یعنی فی الواقع خودغرض اور لعین سخاوت
پیدا ہو جائے گی۔ لاک اپنے بیان بالا میں مزید یہ بھی بیان کرتا ہے۔ "ایسے عمل سے بچے میں سخاوت کی
عادت پڑ جائے گی"۔ درست اور بجا ہے جناب عالی بنیوں اور ساہوکاروں کی سی سخاوت پیدا ہو گی، جس میں
سو فیصدی منافع کی توقع رہتی ہے، اور جب کبھی حقیقی خیرات کا سوال درپیش ہو گا تو یہ نمائشی عادت ختم
ہو جائے گی، اس لئے کہ جب دی ہوئی چیز ان کو واپس نہ مل سکے گی تو وہ دینا اور خیرات کرنا ہی ترک
کر دیں گے۔ داد و دہش تو طبعی ہونی چاہئے جس کو کسی نگرانی کی ضرورت ہی نہ ہو۔ ساری کی ساری نیکیاں
جو بچوں کو تعلیم دی جاتی ہیں اسی قبیل کی ہوتی ہیں۔ ان غیر سودمند خوبیوں اور بھلائیوں کی بچوں کو تعلیم
دے کر آپ بچپن کی فضا ہی مکدر اور برباد کر دیتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ بھلا ایسی تعلیم میں کوئی معقولیت
بھی ہے؟

سرکاری جریدہ کے اعلانات

نمبر و تاریخ	نام اور عہدہ	کس جگہ تبادلہ یا تقرری ہوئی	کس تاریخ سے	کیفیت
۲۲۵۰۵، ۵۲/۸/۴	جناب ڈاکٹر محمد جہانگیر خاں ایم اے (کنٹب) پی، ای ایس (انتخابی درجہ) ڈپٹی ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب	قائم مقام ڈی، پی، آئی پنجاب بشاہرہ ۲۰۰۰-۷۵/۲۴۰۰	۵۲/۸/۱۸ تا ۵۲/۹/۶ (مشمول ہر دو روز)	جناب یو. کرامت ایم اے (کنٹب) ڈی پی، آئی پنجاب کی جگہ جو بیس دن کی رخصت پر ہیں
۲۲۵۸۵ ۵۲/۸/۱۸	پیرزادہ محمد اکرم مخدومی ایم اے (علیگ) ایم، ایڈ (لیڈز) پی۔ ای۔ ایس (۱) انسپکٹر آف ٹریننگ انسٹی ٹیوشن پنجاب	ڈپٹی ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب (قائم مقام)		جناب ڈاکٹر محمد جہانگیر خاں کی جگہ جو بطور قائم مقام ڈی پی آئی کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔
〃	جناب نثار اللہ ایم، اے افسر بکار خاص، دفتر ڈی پی آئی پنجاب۔	انسپکٹر آف ٹریننگ انسٹی ٹیوشنز (قائم مقام، پی۔ ای۔ ایس (۱) ۳۵۰۔۴۰/۷۰۰۔۵۰/۹۵۰۔۵۰/۱۲۰۰		جناب محمد اکرم مخدومی کی جگہ جو بحیثیت ڈپٹی ڈی پی آئی کام کر رہے ہیں۔
۲۳۳۳۱ ۵۲/۸/۷	جناب فضل احمد اعوان سینئر لیکچرر انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور پی ای ایس (۲) ۲۵۰۔۲۵/۵۵۰۔۲۵/۷۵۰	پی۔ ای۔ ایس (۱) بشاہرہ ۳۵۰۔۴۰/۷۰۰۔۵۰/۹۵۰۔۵۰/۱۲۰۰	۱۵ فروری ۵۲ء (قبل دوپہر)	عارضی تقرر

[illegible]	[illegible]	کس جگہ تبادلہ یا تقرری ہوئی	کس تاریخ سے	کیفیت
[illegible]	مرزا انعام علی ایم اے، بی ٹی سینیر لیکچرر گورنمنٹ کالج کیمل پور پی۔ ای۔ ایس (۱۱)	پی۔ ای۔ ایس (۱) پرنسپل گورنمنٹ کالج کیمل پور۔ قائم مقام	۵۲،۵،۱۲ تا ۵۲،۵،۲۶ بشمول ہر دو روز	جناب عبدالحمید کی جگہ جنہیں رخصت مل گئی ہے۔
۲۰،۸۰ ۵۲،۷،۱۵	جناب تاج محمد خاں ایم اے لیکچرار فارسی۔ ایس، ای، ایس (کالج کیڈر) ڈیرہ غازی خاں	پی۔ ای، ایس درجہ (۱۱) قائم مقام پرنسپل گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خاں	۵۲،۵،۱۲ تا ۵۲،۶،۱۹	جناب غلام عباس خاں پی، ای۔ ایس (۱) کی جگہ جو رخصت پر ہیں۔
۱۹،۰۷ ۵۲،۷،۴	جناب ایس، این حسین نقوی ایم اے، اسسٹنٹ ماسٹر سینئر اسکول لارنس کالج گھوڑا گلی	حسب ذیل گریڈ میں مستقل کئے گئے ۲۲۵-۱۵/۵۰۰ + ۵۰ ڈیوٹی الاؤنس یکم مارچ ۱۹۵۲ء سے		

صیغۂ رجال شعبہ اسکول

ای ۱۸،۴۴ ۵۲،۸،۲۰	ایم عبدالحمید خاں بی اے بی ٹی ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول کھروڑ پکا۔	ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پاک پٹن	تاریخ حاضری سے	چودھری رحمت علی کی جگہ جو یکم اگست ۱۹۵۲ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے
؍؍	ایم۔ ظہور الحق فاروقی بی اے ایس اے وی۔ اے ڈی۔ آئی آف اسکول، سیالکوٹ	ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول کھروڑ پکا۔		ایم عبدالحمید کی جگہ جنہیں تبدیل کر دیا گیا ہے۔
ای ۱۸،۴۸ ۵۲،۸،۱۴	محمد شریف ایم اے۔ بی، ٹی۔ اے، ڈی آئی۔ گوجرانوالہ	سلیکشن گریڈ (انتخابی درجہ ۲۵۰/۱۵/۲۵۵	۵۲،۵،۱۱	

نمبر اور تاریخ	نام اور عہدہ	کس جگہ تقرری یا تبادلہ ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
ای ۲۱۳۳۶ ۲/۷/۵۲	ایم عبدالحمید ایم ایس سی معلم انچارج تجدیدی کورس (روزمرہ سائنس) ۱۳۰، ۱۰، ۲۰۰، ۱۰	معلم انچارج تجدیدی کورس	۱-۸-۵۲	انتخابی درجہ ۲۵۰-۱۵-۵۰۰ (ایک سال پروبیشن) حلقہ راولپنڈی کے نئے روزمرہ سائنس کے اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز مقرر ہوئے
″	ایم عبدالرشید ایم ایس سی ایک امیدوار	اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز برائے روزمرہ سائنس حلقہ ملتان	تاریخ حاضری سے	ایس نیاز احمد ترمذی کی جگہ جو مستعفی ہو گئے
″	ایم اکرام الحق ایم ایس سی ایک امیدوار	اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز برائے روزمرہ سائنس حلقہ لاہور	″	ایک خالی آسامی پر جو ایم محمد حفیظ کی ملازمت سے سبکدوشی کی وجہ سے خالی ہوئی
″	ایس اقبال حسین بی اے۔ ایس اے وی اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز حلقہ راولپنڈی	ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ۔ بشاہرہ خود	۱-۸-۵۲	قاضی محمد صدیق بی اے پی ای۔ ایس (۱۱) کی جگہ جو معطل کر دیئے گئے ہیں

نمبر ۱۹۳۷۶/ای ۲ جولائی ۱۹۵۲ء

حسب ذیل ترقیوں کے احکام صادر کئے گئے

نمبر شمار	نام اور عہدہ	ترقی دی گئی: درجہ سے پیمانہ تنخواہ	ترقی دی گئی: درجہ میں انتخابی درجہ	تاریخ	کیفیت
	ایم محمد صدیق معلم انگریزی سنٹرل ماڈل ہائی اسکول لاہور	(۱۳۰-۱۰-۲۰۰-۱۰-۲۵۰)	(۲۵۰-۱۵-۵۵۰) مستقل	۱/۴/۵۲ تا ۱۲/۴/۵۲	غلام محمد کھوکھر کی جگہ جو فوجی ڈیوٹی پر ہیں اور جنکا حق ملازمت معطل کر دیا گیا

۰ ۵ شمارہ ۷] لاہور [اکتوبر ۱۹۵۲

اس شمارہ میں

مدیر : شبیر ہاشمی

معاونین : عبدالغفور چودھری

[illegible]

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

اکتوبر ۱۹۵۲ء

جلد ۵
شمارہ ۷

سالانہ چندہ
پاکستان کیلئے ۶ روپے
غیر ممالک کیلئے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز:۔
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور

ایچ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کر یونیورسٹی بک ایجنسی
۲ - کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا۔

لارڈ برٹرنڈرسل

۱۸ مئی سنہ ۱۹۵۲ء کو برٹرنڈرسل اپنی زندگی کی اسی منزلیں طے کر چکا ہے۔ اس کی یہ سالگرہ سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے رسل کی زندگی میں ہی نہیں۔ آزادی، حریت اور نئی تعلیم کی شاہراہ پر بھی اس کی حیثیت سنگ میل کی سی ہے اور آزادی اور علمی بغاوت کی یہ پہلی صدا ایسی جگہ سے اٹھی جو پرانی روایات کا مرکز نہیں بلکہ یوں سمجھئے کہ مدفن تھی سنہ ۱۹۱۴ء کا پُرآشوب زمانہ۔ جنگ شروع ہو چکی تھی، انگلستان پورے قومی جوش عصبیت سے سرشار جنگ میں شریک ہو چکا تھا، اس کی پوری فضا جنگی نعروں سے معمور تھی اور جبری فوجی خدمت قانون کا درجہ حاصل کر چکی تھی، اس ہنگامہ خیز ماحول میں ایک آواز اٹھی، یہ آواز برٹرنڈرسل کی تھی، امن و آشتی اور صلح و محبت کی۔ اس میں حقائق کی تلخی بھی تھی اور اقتدار پسندی کے خلاف اعلان جنگ بھی۔ وہ خود "انجمن امتناع خدمات جبریہ" (NO CONSCRIPTION FELLOWSHIP) کا ایک عملی کارکن تھا، حکومت کی بارگاہ بڑی ہوتی ہے اور غالباً اس کے فیصلے بھی بہت اونچے ہوتے ہیں، تنقید اور پھر حکومت کی تنقید ایسے "غزل سرا" کو بالعموم "چمن" سے نکلنا پڑتا ہے، ابھی جنگ کے شعلے بھڑک ہی رہے تھے کہ ایک مبصر سیاست نے جبری بھرتی پر کڑی نکتہ چینی کی، کہنے کو تو اسے صرف جنبش قلم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ تحریر قصر حکومت میں ایک دھماکا ثابت ہوئی اور وہ اور رسل نہ سہی قید و بند کی نوبت تو پہونچ ہی گئی، رسل نے اس ظلم کو شدت سے محسوس کیا اور ظلم بھی کیا؟ ظلم ناروا، آزادی اور حریت کا گلا گھونٹنا اسی کو تو کہتے ہیں، اس نے اس اقدام کی مذمت میں ایک نہایت سخت مضمون لکھا پہلے ہی گھونٹ کی تلخی کیا کم تھی کہ

شبہ کا پیالہ سمجھا جاتا۔ اسے اپنی اس بے باکی اور جسارت کی سزا ملی، اس پر ایک سو پونڈ جرمانہ کیا گیا جسے اس نے دینے سے انکار کر دیا۔ اس انکار پر اس کے پورے کتب خانے کو ضبط کر کے نیلام کر دیا گیا۔ کتب خانے کو اس کے ایک دوست نے خرید لیا، مگر پھر بھی بہت سی نادر و نایاب کتابیں ضائع ہو گئیں، اب تو اس کے لئے قدم قدم پر دشواریاں تھیں، ذرہ ذرہ دشمن ہو رہا تھا، اس کی اپنی مادر علمی نے جہاں وہ متعلم اور معلم دونوں حیثیتوں سے متماز رہا، اسے ملازمت سے محروم کر دیا، اسی زمانے میں ہارورڈ یونیورسٹی نے ایک عہدے کی پیشکش کی، وہ امریکہ جانے کے لئے تیار تھا مگر حکومت نے پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں جنگ کے بادل چھٹ چکے تھے، امن و آشتی کی باتیں ہو رہی تھیں، انسان جنگی صعوبتوں کے اڑن چکر میں ایک نہیں بیسیوں قلابازیاں کھا چکا تھا، اب زندگی کے دوراہے پر زخموں سے چور چور حیرت و استعجاب کے عالم میں کھڑا تھا رسل نے رستے ہوئے زخموں پر پھاہا رکھنا چاہا، ماحول کی آزردگی و اضمحلال کو دور کرنے کی کوشش کی لیکن جب ٹریبونل (TRIBUNAL) میں اس کا ایک مضمون نکلا تو اسے چھ ماہ اسیری میں گزارنے پڑے، اس کی معرکۃ الآرا کتاب ریاضیاتی فلسفہ کا تعارف INTRODUC-TION TO MATHEMATICAL PHILOSOPHY انہیں ایام کی یادگار ہے۔

رسل ۱۸ مئی ۱۸۷۲ء کو پیدا ہوا۔ اس کے دادا کا نام (لارڈ) جان رسل تھا۔ تین سال کی عمر میں اسے داغ یتیمی سہنا پڑا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی اتالیق اور معلمہ کی نگرانی میں ہوتی رہی، اس زمانے میں اس نے فرانسیسی زبان سیکھی، اکتوبر ۱۸۹۰ء میں جب وہ ٹرنیٹی کالج کیمبرج - TRINITY COLLEGE (CAMBRIDGE) کے رہائشی ادارے میں داخل ہوا تو اس کی شوخ و شنگ فطرت میں شرمیلے پن کا عنصر غالب تھا، یہاں اس نے فلسفے کے امتحان میں درجہ اول میں کامیابی حاصل کی ۱۸۹۵ء میں وہ اپنے کالج کا فیلو بھی منتخب ہو گیا ۱۹۱۰ء میں وہ اسی کالج میں فلسفے کا لکچرر مقرر ہوا، لیکن یہاں فلسفے کی بجائے سیاست اس کا خاص موضوع فکر رہا۔

ایک عملی مفکر ہونے کی حیثیت سے اسے ہمیشہ تعلیم سے دلچسپی رہی، کیونکہ جو شخص زندگی کو نئے نصب العین اور نئے آئیڈیل پر ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے اسے یقیناً تعلیم سے بھی لگاؤ ہوتا ہے اس نے

اپنے ان تاثرات کے بنیادی اصولوں کو اپنی معروف کتاب آن ایجوکیشن (ON EDUCATION)
میں پیش کیا ہے۔ اس کی اس کتاب میں ایک ہمدرد باپ، ایک صاحب الرائے مفکر اور ایک باعمل
معلم کے افکار و خیالات اور تجربے اور مشاہداتی زندگی کے ایسے چمکتے ہوئے نقوش ہیں جنہوں نے
ترقی پسند تعلیم کی راہوں کو جگمگا دیا ۱۹۲۷ء میں اس نے اپنی بیوی کے تعاون سے ایک تجربی مدرسے
کی بنیاد ڈالی جو ۱۹۳۲ء تک جاری رہا۔ ۱۹۳۱ء میں اسے ارل بنایا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں وہ یو۔ ایس۔ اے
گیا۔ اور اپنے دوران قیام میں ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں فلسفہ کی تعلیم دیتا رہا۔ ۱۹۴۰ء میں نیویارک
کالج میں اسے اس کے حق درس وتدریس سے محروم کر دیا گیا تو اس نے بارنز فاؤنڈیشن (BARNES -
FOUNDATION) سے ایک پانچ سالہ معاہدہ کیا، لیکن کچھ دنوں بعد یہ معاہدہ بھی منسوخ
کر دیا گیا۔

رسل برطانیہ کے ایک پرانے اور اعلیٰ خاندان کا فرد ہے اور ایک اونچے طبقے سے متعلق ہوتے
ہوئے بھی سماج میں ایک نمایاں انقلاب لانے کے لئے کوشش کرتا رہا، وہ جذبات کی تندرو
میں بہنا نہیں جانتا، بلکہ وقت کی ضروریات اور عمومی رجحانات کا جائزہ لے کر خود ایک راہِ عمل تجویز کرتا ہے
اس نے اپنے عہد کے عام رجحانات اور رسمی طریق فکر کے خلاف آواز اٹھائی، آواز ہی نہیں اٹھائی -
بغاوت کی، لیکن بغاوت کی خاطر بغاوت اس کا مطمح نظر کبھی نہیں رہا، یہی وجہ ہے کہ اس سے اپنے
اور پرائے سبھی ناخوش رہے اور وہ جس ماحول اور جس فضا میں پہونچا وہ اسے ساز گار نہیں آسکی حتیٰ کہ اسے
اپنی مادر علمی ٹرینٹی کالج کیمبرج سے بھی نکلنا پڑا، مگر اپنے فکر و تدبّر سے جو باغ اس نے لگایا ہے اور جس کی
آبیاری اس نے اپنے خونِ جگر سے کی ہے اس کی ترو تازگی اور شادابی میں ہمیشہ ہی جاذبیت باقی رہیگی
البتہ ابھی حال ہی میں اس نے جرمنی کی اصلاح پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ جرمنی کی تاریخ از سر نو لکھی
جائے تاکہ وہ اپنے ماضی کو بھول جائیں اور نازی افکار و خیالات ان کے لئے ماضی کی ایک بے وقیع داستان
بن کر رہ جائیں، یہ ایک عجیب بات ہے کہ رسل جیسا مفکر اور صاحب بصیرت انسان بھی علم و فن کی بلندی
سے اسقدر پستی میں آجاتا ہے کہ علم کو اپنی اغراض کی خاطر توڑ موڑ لینے میں اسے باک نہیں ہوتا۔ علم کو

یہ غرض کا آلہ کار بننا علم اور عالم دونوں کی شان کے منافی ہے اور درس کی جگمگاتی ہوئی شخصیت پر تو ایک بدنما داغ ہے۔

پروفیسر عبدالغفور صاحب ایک کہنہ مشق اور تجربہ کار استاد ہیں، انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ علمی تحقیقات میں بسر کیا ہے اور لکھنا پڑھنا تو ان کا اوڑھنا بچھونا ہے، وہ طلبہ کے متعلق سوچتے ہیں اور اپنے تاثرات کو نہایت سادہ مگر موثر الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ زیر نظر شمارہ میں "امتحانات" کے متعلق ان کے ترتیب دیئے ہوئے چھوٹے چھوٹے نوٹ شائع کئے گئے ہیں، یہ بظاہر تعمیری معلوم ہوتے ہیں لیکن تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہی مختصر نوٹ دعوتِ فکر و عمل دیتے ہیں۔

کیسی اچھی بات ہو کہ اس مسئلہ کی جانب اور معلمین بھی اپنی توجہات مبذول کریں تعطل اور جمود کی بندشوں کو توڑیں اور اپنے تعلیمی تجربات کی روشنی میں کچھ سوچیں، کچھ لکھیں اس عمل اور ردِ عمل سے بعض کارآمد نتائج مرتب کئے جا سکتے ہیں جن سے طلبہ اور متعلمین کی ایک بہت بڑی تعداد متمتع ہو سکتی ہے، امتحانات کا مسئلہ ہماری تعلیمی زندگی کا ایک اہم مسئلہ ہے، اور موجودہ صورتِ حالات کچھ ایسی ہے کہ اس سے مفر بھی نہیں، غفور صاحب نے جو یہ سلسلہ شروع کیا ہے وہ ہر پہلو سے قابلِ تحسین ہے۔

اسی شمارے میں ایک مضمون "مدرسین کی ڈائری" کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے جس کی افادیت اور اہمیت مسلّم۔ یہ ایک ایسا مضمون ہے جو ہر مدرس کی عملی زندگی میں کام آتا ہے، ہمیں امید ہے کہ یہ مضمون دوسرے احباب کے اظہارِ خیال کا محرک بنے گا، اور اس موضوع پر اس قسم کے متعدد مضامین لکھے جائیں گے، ادارہ کسی اگلی اشاعت میں اس موضوع پر اپنے تاثرات کو پیش کرے گا۔

اس سے پہلے بھی ان صفحات میں نارمل اسکول کے اساتذہ سے یہ استدعا کی گئی تھی کہ مدرسین اور والدین کی حیثیت سے وہ اپنے طلبہ و اپنی اولاد کے مفاد کے پیشِ نظر تعلیمی مسائل پر غور و فکر کریں۔ اور اپنے محسوسات کو الفاظ کا دلچسپ روپ دیکر اس سے دوسروں کو استفادہ کرنے کا موقع عنایت فرمائیں لیکن

یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی، یا یہ کہ اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ ہم میں سے ہر شخص تعلیم سے کسی نہ کسی طرح وابستہ
ضرور ہے بحیثیت ایک معلم یا ایک طالب علم کے۔ یا بحیثیت والدین کے۔ سماج کا قصرِ عالی بچوں کی صحیح
تربیت پر ہی تعمیر ہو سکتا ہے، اگر بچوں کی تعلیم سے یوں ہی اغماض کیا گیا تو سماج کی یہ فلک شکوہ عمارت حوادث
روزگار کا زیادہ مقابلہ نہیں کر سکے گی اور دیکھتے ہی دیکھتے امیدوں کا یہ خیش محل دھڑام سے گر جائیگا جو تعلیم
ہم اپنے بچوں کو دینا چاہتے ہیں، یا جس نصب العین کے ماتحت ہم انہیں ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کے
آرزو مند ہیں، ان سب کا ہماری اپنی ضروریات اور سماجی تقاضوں کے ساتھ ساتھ ہمارے اپنے محسوسات
سے بھی ہم آہنگ ہونا ضروری ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ جو انسانی قدریں ہماری معاشری زندگی میں ایک
لابدی سچائی کا درجہ رکھتی ہیں۔ آیا ان میں زندگی کا سوز و گداز موجود ہے یا نہیں، اگر ہے تو اس کی تجلیاں
ہماری ہئیت اجتماعی کے تاریک گوشوں کو روشن کر رہی ہیں یا ان پر ہنوز تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے؛

یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ یوں تو تعلیم کی ضرورت اور اسکی سیاسی اور سماجی افادیت کو ہم بھی محسوس
کرتے ہیں تعلیمی سہولتوں کے فقدان اور اپنی بے بضاعتی کا رونا بھی روتے ہیں لیکن جب غور و فکر اور جہدِ
عمل کا موقع آتا ہے تو ہر شخص پہلو تہی کرتا نظر آتا ہے، اسوقت سارا جوش سرد پڑ جاتا ہے۔ احساس مردہ
ہو جاتا ہے اور زندگی کی قدریں بدل جاتی ہیں۔

ہم نارمل اسکول کے معلمین کے علم و فضل کے معترف ہیں اور ان کی امعانِ نظر کے قائل، ہم انہیں
خاص طور پر فکر و عمل کی دعوت دیتے ہیں، زمانہ بدل چکا ہے، زندگی کو تلاطم آشنا بنانے کی ضرورت ہے
اور سماج کی ٹھٹھری ہوئی فضاؤں میں حرارت کی ایک برقی رَو دوڑانے کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے
سماج کی اصلاح تعلیم کو فروغ دینے کے مسائل اتنے پیچیدہ اور الجھے ہوئے نہیں ہیں جتنا ہم سمجھتے ہیں
محض فکر و تدبر اور عمل کی ضرورت ہے، درس و تدریس کسی کا اجارہ نہیں ہے، شرارہ سے شرارہ جلایا جاتا
ہے، اور جب دو چراغ جلتے ہیں تو روشنی اور بڑھ جاتی ہے تعلیم کے مقاصدِ اعلیٰ کے حصول کے لئے ہم میں سے
ہر ایک کا فرض ہے کہ ہم ایک نئے عزم کے ساتھ اسکی تعمیرِ نو کے لئے اٹھیں، سماجی عمارت کی تعمیر میں شہری
اور دیہاتی مدرسین کی مساعی کی ضرورت ہے، بلکہ دیہاتی مدرسین کی ذمہ داریاں کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہیں، کیونکہ اس ملک

عبدالغفور چودھری

ایک بڑا تھرمامیٹر تھوڑے سے گرم پانی میں ڈالا جائے تو یہ اس پانی کا صحیح درجۂ حرارت نہیں بتا سکتا، کتنی حرارت تو خود تھرمامیٹر جذب کر لیتا ہے، اسی طرح امتحان بھی طالب علم پر بڑا گہرا اثر ڈالتا ہے۔ تھرمامیٹر کے متعلق تو ہم حساب لگا کر اس کے درجۂ حرارت کو صحیح بھی کر سکتے ہیں، لیکن طالب علم کے متعلق ایسی تصحیح کیونکر کریں۔

ہمارے بعض امتحانوں میں ہزاروں امیدوار شریک ہوتے ہیں، ایک مرتبہ مجھے امتحان لینے کا اتفاق ہوا، ٹریننگ کالج کے ۱۵۱ امیدوار اور ان میں سے ہر ایک نے دو پرچے تین گھنٹے میں مکمل کیے، یہ پرچے کم و بیش دس لاکھ الفاظ پر مشتمل تھے، میرے پاس نمبر لگانے کے لئے صرف دس دن تھے ذرا اندازہ تو کیجئے کہ دس لاکھ الفاظ کتنے ہوتے ہیں۔ اگر روزانہ آٹھ گھنٹے دو لفظ فی سیکنڈ کی رفتار سے گنوں تو سترہ دن صرف ہوتے ہیں اور مجھے ان پرچوں کو دیکھنے کے لئے صرف دس دن دیئے گئے ہیں اسی وقت میں مجھے ان پرچوں کو پڑھنا بھی ہے اور مطالب کو سمجھنا بھی۔ میں نے کسی پرچے کو دوبارہ نہیں پڑھا اور نہ کسی پرچے کو غور سے دیکھا بس اڑتا ہی چلا گیا۔ اور بمشکل تمام انہیں دس دن میں ختم کر پایا۔

ہر نوجوان کو نسلاً بعد نسلٍ نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے قدموں کو سماجی زینے کی اونچی سے اونچی سیڑھی پر جمانے کی کوشش کرے، اور ہم نے کچھ اس قسم کا انتظام کیا ہے کہ کم سے کم تعلیم میں اس سیڑھی

کا ہر حکم ایک آزمائش ہے، اسے ایک ایسے نامعلوم شخص نے بنایا ہے جسے امتحان دینے والے نے کبھی دیکھا ہی نہیں، ممتحن کے دماغ کے گورکھ دھندے کو طلبہ اپنی عمر کے بہترین حصے میں مطالعہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، اور بالعموم یہ دیکھا گیا ہے کہ طلبہ اکثر اسی موہوم کوشش میں اپنی ساری قوت اور اپنا ذوق سلیم قربان کر دیتے ہیں اور پھر تھک کر ایسے چور ہوتے ہیں کہ انہیں منزل کا خیال بھی نہیں آتا اور وہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

آج میں نے ایک نیا تجربہ کیا، میں نے بچوں کا تاریخ میں امتحان لیا۔ اور ہر بچے کو ایک نصابی کتاب استعمال کرنے کی اجازت دی، اس کے باوجود سب سے ہو شیار اور فہیم لڑکا اول رہا، اسے معلوم تھا کہ امتحان کیلئے کن کن موضوعات کو منتخب کرنا چاہیئے۔ مجھے عام قسم کے روایاتی امتحانوں سے سخت نفرت ہے، اور بالخصوص ان امتحانوں سے جن میں ہر پرچے کے لئے ایک خاص وقت مقرر ہوتا ہے، ہمارا ایک استاد ہمیں پرچے کرنے کے لئے غیر محدود وقت کی اجازت دے دیتا تھا بعض تو آدھ گھنٹے میں ہی پرچہ ختم کر لیتے تھے، اور بعض پانچ پانچ گھنٹے بیٹھے رہتے تھے، طلبہ مختلف رفتار سے لکھتے اور سوچتے ہیں، اس لئے وقت کا تعین کر کے پابندی لگا دینا ان کے حق میں ایک بہت بڑی بے انصافی ہے، اگر مجھے پرچے دیئے جائیں تو میں سوالات کی نوعیت ہی بدل دوں، میں کچھ اس قسم کے سوالات پوچھوں۔

سوالات :-

۱۔ اگر اکبر دوبارہ زندہ ہو جائے تو آجکل کے ہندو مسلمانوں کی حالت دیکھ کر کیا رائے قائم کرے گا؟

۲۔ امیر خسرو کا اردو و ہندی قضیئے کے متعلق کیا خیال ہوگا؟

۳۔ اگر اشوک اور ہٹلر کی ملاقات ہو جائے تو دونوں آپس میں کیا گفتگو کریں گے؟

۴۔ اکبر الٰہ آبادی کے مزاحیہ طرز کا اپنے دوست استاد کے مذاق سے [illegible] کرو۔

قدیم روایاتی سوالات :-

۱۔ ہندوستانی تاریخ میں مندرجہ ذیل سنوں میں کون کونسے مشہور واقعات ہوئے ۱۵۲۶ء ۱۸۵۷ء

۲ ۔ محمد غوری اور محمود غزنوی کا مقابلہ کرو۔ اور بتاؤ کہ تم کس کو اور کیوں بہتر خیال کرتے ہو؟

۳ ۔ ڈوپلے اور کلائیو کا مقابلہ کرو اور بتاؤ کہ دونوں میں سے کون اپنی قوم کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوا۔

۴ ۔ مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک موضوع پر بیس سطروں کا مضمون لکھئے ۔

مدرسہ، چھٹیاں، امتحان، کتابیں، میز اور کرسی ۔

ایسے ایسے سوالوں کے باوجود یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ پڑھانا ایک تخلیقی فن نہیں ہے ۔

ایک مرتبہ ایک ٹریننگ کالج کا طالب علم نظم پڑھا رہا تھا۔ اشعار میں کچھ ایسے خیالات تھے کہ مردوں کی روحیں اکثر پریشان اور آوارہ پھرتی ہیں، یہ سبق عملی امتحان کے لئے تیار کیا گیا تھا، اور ایک مشہور ماہر تعلیم بطور ممتحن بیٹھے ہوئے سبق کا جائزہ لے رہے تھے۔ بچے تعاون کے لئے بے قرار تھے۔ ایک چھوٹے بچے نے پوچھا کیا آپ کی روح بھی یہیں کبھی دوبارہ سبق پڑھایا کرے گی؟ استاد نے جواب دیا "ہاں ہاں، اگر ایسے مشہور اور لائق فائق ممتحن تشریف لایا کریں گے تو میری روح کو آنے میں واللہ کوئی اعتراض نہ ہوگا"

امتحان اچھے خادم ہیں لیکن برے آقا

امتحان کے خلاف اعتراضات :۔

۱ ۔ قدرتی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے، اور تمام تر توجہ محض امتحانی مضامین پر مرکوز ہو جاتی ہے

۲ ۔ ہر مضمون کا ماہر اپنا معیار بلند رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور امتحان میں مشکل سے مشکل سوال پوچھتا ہے۔

۳ ۔ مختلف ممتحن ایک معیار قائم نہیں رکھ سکتے ۔

۴ ۔ لکھائی کے کام کی بے جا اہمیت ۔

۵ ۔ امتحان میں اتفاق اور قسمت کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے ۔

ان اعتراضات کے پیش نظر خارجی امتحانوں کی جگہ دو چیزیں تجویز کی گئی ہیں ۔

۱۔ نئی قسم کی آزمائش (New Type Test) ان آزمائشوں میں خرابی یہ ہے کہ یہ مضامین کے مندرجات کے لئے تو مناسب ہیں، لیکن مضامین میں مہارت پیدا کرنے کے لئے مناسب نہیں، اس آزمائش کی تحریک ابھی تجرباتی دور سے گزر رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک نمبر دینے کا تعلق ہے اس کی واقعیت مسلّم لیکن اس کا احاطہ کار محدود ہوتا ہے اور یہ محض بچے کی ذہنی نشوونما کا جائزہ تو لے سکتی ہے، مگر اس کی اجتماعی یا ہمہ گیر نشوونما کا اندازہ نہیں لگا سکتی۔

۲۔ مجموعی شہادتی ریکارڈ کارڈ کا طریقہ:۔

نئی قسم کی آزمائش اور ذہنی آزمائش کے ساتھ ساتھ ریکارڈ کا طریقہ بھی جاری رکھا جاتا ہے ریکارڈ بچے کی زندگی کے ہر شعبے کی مکمل تاریخ اور مکمل جائزہ ہوتا ہے، اس میں جسمانی ذہنی سماجی، ذاتی صلاحیتوں، طبعی میلانات، و تعلیمی ترقی کا ذکر ہوتا ہے، اور بعض ریکارڈ تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں بچے کے ان تعلقات اور ان رجحانات کو بھی واضح کیا جاتا ہے جن کے مظاہرے وہ گھر یا کھیل کے میدان میں کرتا ہے، بلجیم، آسٹریلیا اور امریکہ میں بچوں کے تعلیمی ریکارڈ ان کے نظامہائے تعلیم کا ایک ضروری جزو بن گئے ہیں، فی الحقیقت ریکارڈ بچے کی ذہنی نشوونما کے متعلق معلم کی رہبری کر سکتا ہے، اسے محض ایک نظر میں یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس میں کون کونسے نقائص یا کمزوریاں ہیں، یا کون کونسی خوبیاں اور اچھائیاں ہیں، کن مقامات پر وہ توانا اور بالغ دکھائی دیتا ہے اور کن مقامات پر اس کے طریق فکر میں کمزوریاں پائی جاتی ہیں، اس طرح باسانی بچے کی اٹھان کو ترقی دی جا سکتی ہے، اس ریکارڈ سے بچے کی ذہنی استعداد کو بڑھانے میں ہی مدد نہیں ملتی بلکہ زندگی میں ایک خوشگوار مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں بھی کافی مدد ملتی ہے۔

آجکل بالعموم ملازمتوں میں خارجی امتحانات کی سندوں کو ترجیح دی جاتی ہے، لیکن اسے محض

سے ذہنی عصبیت اور خیالات کی فرسودگی پر محمول کیا جاسکتا ہے، ریکارڈ بچے کی ذہنی اور جسمانی خصوصیات
ان گوشوں کو روشن کرتا ہے جسے خارجی امتحان ہرگز واضح نہیں کرسکتا۔ امتحانات کے موجودہ طریقے کو بالکل
چھوڑ دینا تو ناممکن ہے، ہماری قدامت پسندی اسے کبھی گوارا بھی نہیں کرے گی، پھر بھی اس کے نقائص کو ایک
حد تک دور کیا جاسکتا ہے۔ خارجی امتحانوں کے ساتھ ساتھ ایک زبانی امتحان لینا بہت مفید ثابت ہوگا۔ سولہ
سال سے کم عمر کے بچوں کے لئے لکھائی کے پرچے میں ان کی مضمون نویسی کا امتحان لینا بالکل بیکار ہوگا
کیونکہ چھوٹے بچے اپنے مافی الضمیر کو مکمل طور پر تحریر میں واضح نہیں کرسکتے، اس لئے زیادہ مناسب یہی ہے
کہ ان کا تحریری امتحان نہ لیا جائے، بلکہ کچھ ایسی آزمائشیں ہوں جو بہت اونچی اقدار کی حامل ہوں اور جنہیں
عملی زندگی اور حیرہ وری بھی ہو۔ اب تک تجربات سے یہی ثابت ہوا ہے کہ اساتذہ کا جائزہ یا داخلے کا
امتحان اس قسم کی قدروں سے محروم رہتا ہے، ہمارے خیال میں ہمدرد اور ذہین قسم کے انسپکٹر اس
معاملے میں اساتذہ کا اچھا خاصا ہاتھ بٹا سکتے ہیں، اساتذہ اور انسپکٹروں کا باہمی جائزہ سب سے کامیاب
طریقہ پیش کرتا ہے۔

ایک مرتبہ میرے بچپن میں تاریخ کے پرچے میں یہ سوال پوچھا گیا کہ ۱۸۶۵ء کے تین مشہور
واقعات بیان کرو"، مجھے دو ہی یاد تھے، اور اب تو میں انہیں بھی بھول گیا۔ تیسرے کی جگہ میں نے یہ جملہ
بڑھا دیا تھا۔ "اس سال ہم پیدا بھی ہوئے تھے"۔

ایک بچے سے یہ پوچھا گیا کہ "ہاتھی کہاں پائے جاتے ہیں"؟ اس نے جواب دیا کہ وہ اتنے بڑے
ہوتے ہیں کہ کہیں کھوئے ہی نہیں جاتے۔

میں بالعموم امتحانوں میں اچھا خاصہ قسمت والا رہا اور حقیقت یہ ہے کہ میرے بعد کے تجربات نے
ثابت کردیا ہے کہ امتحان میں قسمت اور اتفاق کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے، ٹرینیٹی کالج کے پروفیسر ٹامسن
نے کہا تھا کہ امتحان ایک گستاخانہ کوشش ہے۔ انسانی گہرائیوں کو ناپنے کے لئے۔ میں تو تقریباً
ہمیشہ اس گہرائی ناپنے والے آلے کو زیادہ دور گہرائی میں جانے سے روک دینے میں کامیاب رہا ہوں
پیشتر اس کے کہ یہ میری لاعلمی کے تاریک خلا کی تہہ تک پہونچ سکے، میری لاعلمی کے صحرائے ناپیدا کنار کے
تجسس میں قسمت اکثر ممتحن کے ساتھ نہیں رہتی، اس نے بہت سے موقعوں پر ہماری بھی یاوری کی ہے

قسط ۲

مصری تعلیم اور دورِ جدید

محمد تاثر علی جعفری

مصر میں سائنس کی موجودہ حیثیت سائنس مصری ثقافت کا ایک اہم جزو ہے، قدیم مصریوں نے جب نیچر کے ساتھ کشمکش شروع کی تو ان کا ابتدائی ذریعہ تجربی طریق اور نیچر کے علم پر مشتمل تھا۔ اس جدوجہد کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ وادی نیل جہاں دلدل اور وحشی جانور پائے جاتے تھے، وہ اب زرخیز اور جہاں نوا علاقہ میں تبدیل ہو گئی، ان کی سائنس خصوصاً ان مشاہدات کا نتیجہ تھی جو انہوں نے بالضرورت عملی طور پر اپنے مادی ماحول سے رابطہ پیدا کرنے کے لئے کئے، انہوں نے جگہ اور وقت کی پیمائش کرنے میں جن ترکیبوں سے کام لیا ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ علم ریاضی و نجوم میں کتنے ماہر تھے انہیں مسالہ لگا کر لاش کو سڑنے سے بچانے کی جو ترکیب آتی تھی اس سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ عمل جراحی پر جتنی کتابیں موجود ہیں اُن میں سب سے پرانی اُنہی کی لکھی ہوئی ہے جسمیں انہوں نے دماغ کی فعلیت کو محدود کرنے کے طریق کو ثابت کیا ہے، جس طریق سے کہ انہوں نے دریائے نیل پر قابو پایا اور اہرام اور معابد کی تعمیر کی، اس سے ان کے علم جرثقیل میں مہارت کا پتہ چلتا ہے سائنس کی تاریخ لکھنے والے اس بات کو بخوبی تسلیم کرتے ہیں کہ یونانی سائنس کی بنیاد قدیم مصریوں کی معلومات پر مبنی تھی، مسلمانوں کے مذکورۃ الصدر ابتدائی زمانہ میں سائنس نے جو ترقی کی وہ بھی مصر کی سائنٹیفک روایات کا اور عنصر ہے۔

ایک صدی سے زائد زمانہ گذرا کہ مصر میں پھر سے سائنس کے علم اور اس کے طریقوں کا وسیع

پیمانے پر استعمال کیا جارہا ہے۔ حکومت کی تجاویز اور منصوبوں کی بنیاد تجرباتی تحقیق پر رکھی جاتی ہے۔ حکومت کے بہت سے شعبوں میں تحقیق کے لئے عملی تجربہ گاہیں قائم ہیں۔ مثال کے طور پر وزارت زراعت میں کپاس کا تحقیقاتی بورڈ، کیمیائی شعبہ، تجربہ گاہ باقاعدہ تجربی نظام۔ نباتاتی اور اشجار کی پرورش کا شعبہ، کتابی کو بڑھنے کا شعبہ، شعبہ قطریات، شعبۂ حشریات، شعبۂ تحفظ فصل، ریشم کے کیڑوں کے پالنے کا شعبہ، شعبہ باغبانی، جانوروں کے امراض کے لئے تجربہ گاہ، جانوروں کی پرورش کا شعبہ اور دیگر بہت سے شعبے پائے جاتے ہیں۔ ایسی ہی باقاعدہ تجربہ گاہیں حکومت کے تمام دوسرے محکموں میں موجود ہیں۔

سائنٹیفک تحقیقات کے دوسرے ذرائع حکومت کی تین یونیورسٹیاں ہیں جو قاہرہ اور اسکندریہ میں قائم ہیں، بہت سی غیر سرکاری ایجنسیاں مختلف شعبوں میں باقاعدہ تحقیقات کرتی رہتی ہیں۔ ایسی ایجنسیوں کی مثالیں مصری انسٹی ٹیوٹ قائم شدہ سنہ ۱۸۵۹ء، مصری رائل جغرافیائی سوسائٹی قائم شدہ سنہ ۱۹۰۲ء مصری رائل حشریاتی سوسائٹی قائم شدہ سنہ ۱۹۰۷ء۔ اسکندریہ میں آثار قدیمہ کی رائل سوسائٹی، مصری باغبانی کی سوسائٹی قائم شدہ سنہ ۱۹۱۵ء مصری میڈیکل ایسوسی ایشن قائم شدہ سنہ ۱۹۱۷ء دی بی کنگڈم لیگ (THE BEE KINGDOMLEAGUE) قائم شدہ سنہ ۱۹۳۰ء۔ فواد اول صحرائی انسٹیٹیوٹ (THE FOUAD DESERT INSTITUTE) قائم شدہ سنہ ۱۹۲۸ء ہیں۔

اس کے علاوہ مصری اسکولوں کے نصاب تعلیم میں سائنس کو نمایاں جگہ حاصل ہے۔ قاہرہ کے قریب ابوزابل کے مقام پر اسکول آف میڈیسن میں علماء یا الازہر کے پروفیسروں نے سنہ ۱۸۲۷ء میں اس کی مخالفت کی۔ ایک صدی گذرنے کے بعد علماء کے اسی گروہ نے اپنی تمام یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں اسکول شامل کر لیا تاکہ دینیات کے دوش بدوش اس کی تعلیم دی جائے۔ ان کے نزدیک قوانین سائنس اور ان کا مادی دنیا میں استعمال، اور قوانین قرآن اور ان کا روحانی زندگی میں استعمال کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

لیکن یہ کہنا کہ سائنس ملک کی حیات میں ایک اہم کام کرتی ہے، اس بات سے بالکل مختلف ہے کہ وہ قوم کی زندگی کے ہر ممکن شعبہ میں مکمل طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ ہم یہاں کچھ مثالیں پیش

کرتے ہیں، مثلاً زراعت کے حلقۂ عمل سے باہر ملک کے قدرتی وسائل کو کام میں لانے کے لیئے سائنس کا مکمل طور پر استعمال نہیں کیا گیا، معدنی دولت وسیع صحراؤں سے ذرائع آمدنی۔ زمینی اور بحری پیداوار، جڑی بوٹیوں کا کیمیائی استعمال اور دوسرے اور بہت سے شعبوں میں سائنس کے استعمال کو ابھی مکمل طور پر ترقی نہیں دی گئی۔

سائنس کے استعمال کے طریق میں سب سے زیادہ کوتاہی اس بات کی ہے کہ ابھی تک اس کو مادی دنیا کے دائرہ تک محدود رکھا گیا ہے، لیکن سائنس محض قابل تصدیق اور قابل اعتماد علم کے مجموعہ یا قابل اعتماد قوانین کا نام نہیں، سائنس سب سے بڑھ کر غور و فکر کا ایک طریقہ ہے جس پر انسانوں کے تمام اخلاقی اور سماجی مسئلوں کا حل تلاش کرنے کے لیے بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ اس مضمون کے نقطۂ خیال سے انسانی مسائل کا اخلاقی پہلو خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اخلاقی فیصلوں اور عامتہ الناس سے متعلق سوالات مثلاً طلاق، کثرتِ ازدواج، سود، زندگی کا بیمہ، ساہوکارہ اور اسی نوعیت کے اور معاملات میں ماضی کی سند کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اگر اس میدان عمل میں سائنس کا استعمال کیا جائے تو ایسے بحث طلب امور کا فیصلہ اُن نتائج کے مطابق ہونا چاہیے جو آدمیوں کی عمومی زندگی پر موجودہ معاشرتی حالات کے ماتحت ان پر مترتب ہوتے ہیں۔

سائنس کے معاشرتی اور اخلاقی مفہوم کا ایک اور پہلو وہ بے بنیاد اعتقادات ہیں جو اوسط درجہ کے شہری کے دماغ میں گھر کر جاتے ہیں، اولیاء اللہ کی وساطت، مرحوم آئمہ کی قبور کی زیارت سے استفادہ، تعویذات کا اثر اور قسمت میں کیا لکھا ہے بتانے کا پیشہ، یہ سب سائنٹیفک نظریہ کی کمی کی مثالیں ہیں۔ ایسے اعتقادات قوم کی ترقی کے لئے سنگ راہ ہوتے ہیں اور حیاتِ قومی میں ایک آدیزش کا باعث جس کا لوگوں کو پوری طرح علم نہیں ہوتا، بہت سے لوگ بہ یک وقت ادویہ اور تعویذات کی طرف رجوع کرتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ غور و فکر کے جدید طریقے رواج پاتے جا رہے ہیں، لیکن پرانے اعتقادات ابھی تک جمائے ہوئے ہیں اور اس پسندیدہ تبدیلی کے راستہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

عوام کا نظریۂ قضا و قدر اس غیر سائنسی انداز (UNSCIENTIFICATTIFUDE) کا ایک اور

ہوا ہے۔ از منہ وسطیٰ کے علماء دین نے خداوند عالم کی پروردگاری پر اعتقاد کی جو توضیح کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمل میں بسوم مقدمیں اندھا اعتقاد پیدا ہو گیا، اس لئے بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے ذہن میں یہ بات موجود ہی نہیں کہ مسائل پر متانت سے غور کرنا، ہوشمندانہ منصوبہ بندی، ذریعہ معاش کی تدبیر میں سعی کرنا اور اپنی تقدیر بنانا ان کا کام ہے، اس نظریہ کا تجارت کے اہم میدانِ عمل میں جو اثر ہوا ہے اس کا ذکر اسمٰعیل صدقی پاشا نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

اکثر یہ ہوتا ہے کہ مصری تاجر وسطائی عقیدوں کا غلط ترجمہ کرتے ہوئے مسئلہ جبر میں لغزش کر جاتا ہے اور یہ تجارتی روح کے عین خلاف ہے، وہ کہتا ہے کہ نیکی اور بدی خدا کی طرف سے ہے اور اس اصول پر اعتماد کرتے ہوئے وہ اپنے پرانے گاہکوں کو سنبھالنے یا دوسروں کو موہ لینے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے تاجروں میں بہت سے ایسے ہیں جن میں غرور، اخلاق کی کمی اور متمردانہ خود رائی پائی جاتی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جب تک انفرادی اور جمہوری زندگی کے ہر دائرہ عمل میں سائنس کے طریقہ کو استعمال نہ کیا جائے اور جب کہ یہ طریقہ انسان کے اختیار میں قابل اعتماد علم کے حصول اور صحیح فیصلہ کرنے کا بہترین ذریعہ ہے تو ہم یہ فرض نہیں کر سکتے کہ ہم نے سائنس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے، یہ نظریہ اسلامی روح کے عین مطابق ہے، اور اس کا مطلب معاشرتی معاملات میں اجتہاد اور رائے کے طریقوں کی طرف مراجعت کرنا ہے، جیسا کہ ان طریقوں کا اسلام کے سنہرے زمانہ میں استعمال کیا جاتا تھا، مثال کے طور پر جب خلیفہ دوم حضرت عمر ابن الخطاب نے قحط سالی کے زمانہ میں ڈاکہ اور چوری کی سزا کو موقوف کر دیا تھا تو وہ حقیقتاً ایک ایسے اخلاقی اصول پر عمل کر رہے تھے جو سائنس کے مطابق تھا اور جس کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار حقیقی زندگی کے حالات واقعی پر مبنی تھا۔

مصر میں جمہوریت کی موجودہ حیثیت | مصر کی موجودہ تہذیب کا غالباً سب سے زیادہ نمایاں رجحان جمہوری طرز زندگی کے قیام اور ارتقا کے لئے سعی کرنا ہے۔ مصری ثقافت کے قومی عناصر، فرعونی اور اسلامی دونوں مصریوں کی اس سعی میں متحد ہوتے ہیں۔ کارل بیکر (CARL BECKER) کا قول ہے کہ وہ اقدار

جن پر موجودہ جمہوریت قائم ہے، جمہوریت کی نسبت زیادہ پرانی اور عالمگیر ہوتی ہیں اور ان کا انحصار جمہوریت پر نہیں ہوتا اور ان کی بقا کسی خاص معاشرتی نظام یا طرز تہذیب سے منسلک نہیں ہوتی۔"

اگر ہم اس ممتاز امریکی مورخ اور فلسفی کے نظریہ کی پیروی کریں تو ہم قدیم مصریوں کی تہذیب میں موجودہ جمہوریت کی چند اخلاقی اقدار کا کھوج لگا سکتے ہیں۔ تاریخی دستاویزات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم مصریوں نے سب سے پہلے انصاف کا ذکر کیا ہے۔ جیمز ہنری بریسٹڈ (JAMES HENRY BREASTED) بیان کرتا ہے

یہ محض مذہبی عقیدہ اور معاشرتی اصول ہی نہ تھا بلکہ باقاعدہ اعلان شدہ شاہی پالیسی تھی کہ عدالت کے کٹہرہ میں اعلیٰ اور ذی اثر حضرات کو اسی فیصلہ اور سلوک کی توقع کرنی چاہیے جو ایک غریب اور بے یارومددگار کے ساتھ کیا جائے گا۔

مصر کے قدیم تاریخی ادوار میں حکومت کا معمول خواہ کچھ بھی رہا ہو مگر انسانی مساوات کے خیال کو قدیم مصریوں کے سورج دیوتا نے جتنے پر زور اور فیصلہ کن الفاظ میں بیان کیا ہے اس طرح کبھی بھی بیان نہیں کیا گیا۔ الفاظ یہ ہیں۔

میں نے چار ہوائیں پیدا کی ہیں تاکہ ہر شخص اپنی زندگی میں اپنے بھائی کی طرح سانس لے سکے۔ میں نے بڑے سمندر پیدا کئے ہیں تاکہ ایک محتاج بھی امیر کی طرح ان کا استعمال کر سکے۔ میں نے ہر شخص کو اس کے بھائی کی شکل پیدا کیا ہے۔

جمہوریت کے تمام دستاویزات پر ان کے اجرا کے بہت دیر بعد عمل ہونا شروع ہوا۔ لیکن پالیسی کی وضاحت بالذات ایک گرانقدر بات تھی، اس فلسفہ کو اسلام کی جمہوری روایات نے تقویت پہونچائی اور ان روایات کی بدولت جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے محکوم کی رضامندی کا اصول اصولی اور عملی طور پر قائم ہوا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں جمہوری تحریک کے پس پشت یہی روایات تھیں۔ قومی دشواریوں کو جن کا نتیجہ غیر ملکی مداخلت کی شکل میں ظاہر ہوا صحیح طور پر استبدادانہ نظام سے منسوب کیا گیا، جس کے زیر اثر قوم بڑے لمبے عرصہ تک اپنے دن بسر کرتی رہی۔ قائدین پر جلدی ہی اس امر کا انکشاف ہو گیا کہ مطلق العنانی مستند اسلامی طرز زندگی سے مختلف ہے اور سرکاری دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کے جمہوری اصول

کی طرف لوٹنے کا خیال کیا گیا لیکن اسلامی روایات میں جمہوری اداروں کی مختلف صورتیں موجود نہ تھیں اس لئے ان کو مغرب سے اخذ کیا گیا۔ جب ابتدا میں جمہوریت کے لئے جنگ کی گئی تو مصریوں کے جمہوریت پر اعتماد کا خاکہ ان کے لیڈروں نے بہت اچھے الفاظ میں کھینچا ہے، انہوں نے لکھا ہے۔

معاشرتی نظام کی بہبودی کے حصول کا ذریعہ محض انصاف اور آزادی ہیں جو ہر فرد کی جان و مال کے تحفظ اور اس کے اقوال اور افعال کی آزادی کے ضامن ہیں۔ تاکہ وہ اپنی آسودگی کے پیچھے لگا رہے اور اپنی فلاح و بہبود قائم رکھ سکے، اس کے مقصد کے حصول کا واحد ذریعہ ایک ایسی آئینی حکومت کا قیام ہے جس کے راستہ میں مطلق العنانی اور رشوت ستانی روڑے نہ اٹکا سکیں۔

اس نصب العین کے حصول کے لئے ایک لمبا عرصہ اور سخت جدوجہد کی ضرورت تھی اور بلاشبہ جدوجہد اب بھی جاری ہے، کیونکہ جمہوریت کے دشمن ہر جگہ موجود ہیں۔ مصری دستور اساسی کا اعلان ۱۹۲۳ء میں ہوا، اس کی دفعہ ۲۳ میں لکھا ہے "تمام اختیارات افراد قوم کو حاصل ہیں"۔ قانون سازی کے اختیارات مصری پارلیمان کے دونوں ایوانوں کو حاصل ہیں، اور کابینہ ان ایوانوں کو جواب دہ ہے۔

لیکن حکومت کے مختلف پہلو جمہوریت کا مکمل مافیہ نہیں ہیں، جمہوریت تو ایک روح ہے جسے تمام قومی سرگرمیوں میں جاری و ساری ہونا چاہیئے۔ موجودہ دور میں اس امر کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے مثال کے طور پر جمہوریت کا ایک اقتصادی پہلو ہے، جمہوریت کے نزدیک کچھ لوگوں کے پاس زیادہ اور کچھ کے پاس کم دولت کا ہونا بجا ہے، تاہم یہ اس بات کا تقاضہ ضرور کرتی ہے کہ ہر فرد کے رہنے سہنے کا معیار معقول ہو، جمہوریت کے اس اقتصادی پہلو کو ابھی تک عملی جامہ نہیں پہنایا گیا، یہاں ہمیں جس بات سے سروکار ہے وہ یہ ہے کہ زمانہ حاضرہ کی جدید مصری تہذیب میں جو بھی نقائص ہوں ان کی ذمہ داری اسلام پر ایک عمل کی حیثیت سے جو لوگوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہو عاید نہیں ہوتی، ایسے نقائص فطرت انسانی کے قومی رجحانات میں جبلی طور پر پائے جاتے ہیں جنکی وجہ سے مذہب خطرہ میں رہتا ہے، یہ خامیاں مصر میں تعلیم کے لئے ایک چیلنج ہیں۔

جدت پسندی کا تعلیم کو چیلنج اوپر کی بحث سے ظاہر ہے کہ مصر میں ثقافتوں کا تصادم موجود

ایک طرف اسلامی ثقافت کا مطالبہ ہے کہ اس کی نگہداشت کی جائے، دوسری طرف ثقافت جدید کی حمایت میں موجودہ زندگی کی ضروریات اور عصر حاضر کی روح کارفرما ہے، اگرچہ دونوں کی بنیادی قسم میں کوئی تضاد نہیں ہے لیکن ہر ایک کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں اور آسانی سے ایک دوسرے کے مفاد میں پیچھے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہیں، اسلامی ثقافت چونکہ صدیوں سے ارتقائی منازل طے کرتی آرہی ہے، اس لئے وہ قدامت پسندی کی طرف مائل ہے اور اس کے معیار ماضی سے وابستہ ہیں، اسکے برعکس ثقافت جدید کے معیار اُن انسانی اغراض ومقاصد کے سیاق و سباق سے وابستہ ہیں جن کے ماتحت قوم زندگی بسر کر رہی ہے۔

تعلیم ثقافتوں کے اس تصادم کی آئینہ دار ہے، درسگاہیں دو طرح کی ہیں، ایک طرز قدیم کی جو جامعۂ ازہر پر مشتمل ہے، یہاں ثقافت قدیم کی نمائندگی ہوتی ہے، دوسری طرز جدید کی جو ابتدائی اور ثانوی مدارس اور سرکاری یونیورسٹیوں پر مشتمل ہے۔ یہاں ثقافت جدید کی نمائندگی ہوتی ہے درسگاہوں کے ان دونوں نظاموں میں سے ہر ایک خاص قسم کا رجحان پیدا کرتا ہے جو اس خاص قسم کی ثقافت کے مناسب حال ہوتا ہے جس کی وہ نمائندگی کرتا ہے، اس لئے مصری تعلیم دو طرح کی ذہنیتیں اور طریقۂ خیال پیدا کرتی ہے۔

پس ہر نتیجہ یا امر واقعہ کو جامعہ ازہر کا گریجویٹ ایک زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے، اور مدارس جدید کا گریجویٹ دوسرے نقطۂ خیال سے، اس طرح یہ دونوں مختلف گریجویٹ نہ اپنے خیالات میں ہم آہنگ ہوتے ہیں، نہ تشخیص اقدار میں، نہ استنواری ع۔م وفیصلہ میں نہ عمل اور طریقہ کار میں۔

اس لحاظ سے مسئلۂ تعلیم مسئلۂ ثقافت کا آئینہ دار ہے، اس مسئلۂ ثقافت کی یوں تعریف کی جاسکتی ہے کہ ہماری ایک قدیم تہذیب ہے، جسے ہم باقی رکھنا چاہتے ہیں، لیکن اس کے حسن و قبح سے بخوبی واقف نہیں، اور یہاں ہم ایک عرصہ سے ثقافت جدید کو اختیار کر رہے ہیں، لیکن اسے ثقافت قدیم سے منسلک کرنیکی کوئی حقیقی کوشش نہیں کرتے مصر کا حقیقی ثقافتی مسئلہ یہ ہے کہ ایسی ملکی تہذیب قائم کی جائے جو اپنے مختلف عناصر کے ماخذوں کا خیال کئے بغیر ملک کے احتیاجات و خصوصیات

کا حامل ہو۔

عصر جدید کے تعلیمی مسئلہ کی اس سے نہایت واضح تعریف ہو جاتی ہے۔ تعلیم محض ایک ذہنی عمل نہیں ہے، بلکہ تاوقتیکہ وہ کسی ثقافت کی آئینہ داری نہ کرے، اس کے اغراض پورے نہ کرے، اور اسکے وسائل کا حل نہ بتائے، تعلیم کی صحیح تعریف نہیں کی جا سکتی۔ کسی تعلیمی نظام کے مطمح نظر کو اس معاشرہ کی منازل مقصود سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، جس کے لئے اسے وضع کیا گیا ہے، موجودہ حالات کو مسخ کر کے منتقل کر دینے کی بجائے تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ عامتہ الناس کی زندگی پر تنقیدی اور انتخابی نظر ڈالے اور اس کی منتہائے منزل یہ ہے کہ ثقافت میں پسندیدہ تبدیلیاں پیدا کرے۔

اگر مصر کو عصر حاضر میں کامیاب زندگی بسر کرنا ہے تو اسے تہذیب جدید کو پروان چڑھانا چاہیئے، اس خاص صورت حال میں تہذیب جدید سے ایک تو جمہوریت مراد ہے جو ایک خاص طرز حیات ہے اور دوسرے سائنس جو ماحول پر تسلط پانے کا ذریعہ ہے، اس راستہ کو اختیار کرنے کے لئے اسلامی تہذیب ایک سازگار اثاثہ کا کام دیتی ہے۔

جمہوری طرز زندگی بسر کرنے کے لئے تعلیمی پروگرام کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہر فرد کی شخصیت کی اس طرح تربیت کی جائے کہ جمہوریت کے نصب العین سے اس کی وفاداری یقینی ہو جائے، اور ایک جمہوری معاشرہ میں اس کے حصہ لینے کی استعداد کو تقویت پہونچے، چونکہ تعلیم ہمیشہ کردار کی تعمیر کا ایک عمل ہے، اس لئے ایسے ملک میں جہاں طرز حکومت جمہوری ہو، اس کو اپنی مساعی ایک ایسی صاحب عزم شخصیت کی تربیت کی طرف منعطف کرنا چاہیئے جو منقولات کی بجائے معقولات پر اعتماد کرے، جو نہ صرف ماضی بلکہ حال اور مستقبل پر بھی نگاہ رکھے اور جو موجودہ تنظیمات کی تعلیم و تنقید کے لئے کافی مواد اور علم کی حامل ہو اور جو اپنی ذات کے علاوہ دوسروں کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے تجاویز پر عمل پیرا ہونے اور مسائل کو حل کرنے کے لئے کافی سوجھ بوجھ رکھتی ہو اور جس میں تصمیم عزم بھی ہو، جس کی مدد سے وہ ان امور پر قائم رہے جن پر وہ یقین اور اعتقاد رکھتی ہو۔

اسی طرح سائنٹفک نظریہ پیدا کرنے کے لئے تعلیمی پروگرام کو ایسا ہونا چاہیئے کہ معلومہ جو

میں سوچنے کا مادہ پیدا کرے جس کی مدد سے وہ اپنے طبعی اور معاشرتی ماحول پر زیادہ موثر طریقہ پر قابو پا سکیں، پروگرام کے اس جزو کا ایک منفی اور ایک مثبت پہلو ہے، منفی پہلو کے لحاظ سے ضروری ہے کہ تعلیم عصر کی نئی پود کو نظریات زندگی کے دقیانوسی طریقوں کی گرفت سے آزاد کرائے اور مثبت پہلو کے لحاظ سے وہ ان میں سائنٹیفک طریقۂ فکر کی عادت ڈالے جسے وہ اپنے طبعی اور معاشرتی مسائل کے حل کرنے میں استعمال کر سکے، اس طرح بہ یک وقت نوجوانوں کو خارجی دباؤ اور معمول کے اقتدار سے آزاد کرنے کے ساتھ ساتھ درسگاہوں کو چاہئے کہ وہ ان کو اس معاملہ میں مدد دے کر وہ اپنے آپ میں داخلی طور پر ایک اور رہنمائی کرنے والی قوت پیدا کریں۔

جب یہ ذہانت نئی نسل کی ایک مشترکہ ملکیت بن جائے گی اور وہ اپنے قومی طبعی، معاشرتی داخلی اور بین الاقوامی مسائل کے سلسلہ میں اس پر عمل کرنے لگیں گے تو مغربی تہذیب میں ایک جدید اور ملکی خصوصیت پیدا ہو جائے گی، یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ موجودہ تہذیب کی کامیابی ملکی روایات کی اخلاقی تائید پر منحصر نہیں بلکہ وہ اس اثباتی جدوجہد پر منحصر ہے جس میں قوم عمداً منہمک ہوتی ہے، موجودہ دنیا میں تعلیم کی یہی ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے

طبیعات کا خانہ ساز معمل

عبدالغفور چودھری (ایم۔ایس سی)

آجکل کی دنیا طبیعات اور ریاضیات کی دنیا ہے، یہ دونوں علوم جدید سائنس کے دو بہت بڑے سہارے ہیں جن کی امداد سے یہ قصرِ عظیم روز بروز اونچا اُٹھتا جا رہا ہے، ریاضیات کا ماہر اس عمارت کا خاکہ تیار کرتا ہے اور اس نئی کائنات کا جسے انسان جدید تیار کرنا چاہتا ہے۔ اس کا تصور پیش کرتا ہے، طبیعات اس کے لئے سنگ و خشت چونا اور گارا مہیا کرتی ہے، دوسرے ممالک میں اِن مضامین کے پڑھانے کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن ہمارے پاس طبیعات کی تدریس کا کتنا کچھ انتظام ہے۔ اس پر بعض حضرات چونک کر کہہ اٹھیں گے کہ ہمارا ملک بہت غریب ہے، ہمارے یہاں ایسا انتظام ہونا آسان نہیں، لیکن سامان کے اس مسئلہ کو اکیلا محکمۂ تعلیم یا اس کے زیرِ امداد ہی حل نہیں کر سکتے، اس کے لئے تو ہر مدرسے، ہر مدرس، بلکہ مدرسے کے ہر بچے کو کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا، اپنے ملک کی سیدھی سادھی چیزوں سے سامان تیار کرنا ہوگا، اپنے ہاتھ سے ان کا ناک نقشہ ٹھیک کرنا ہوگا۔

طبیعات کے تجربے بہت سستے سامان سے کئے جا سکتے ہیں، بچوں کو یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ طبیعات کے تجربوں کے لئے سامان گھر میں بن سکتا ہے۔ بڑھئی کی مدد سے لکڑی کے مکعب۔ مکعب نما۔ بلاک۔ بیلن وغیرہ گھر میں بن سکتے ہیں، میٹر راڈ کی بجائے عام پیمانہ استعمال کیا جا سکتا ہے جس پر انچ اور سنٹی میٹر کے نشان موجود ہوں اور گھڑے کی بجائے

لکڑی کی گیند استعمال کر سکتے ہیں، حجم ناپنے کی مشق کرنے کے لئے کانچ کی گولی استعمال کریں۔ البتہ حجم ناپنے کا سلنڈر خریدنا پڑے گا جس کی قیمت کوئی پانچ چھ روپے ہو گی۔ ترازو کی بجائے وہ کانٹا استعمال کریں۔ جو گوٹے والے یا سنار استعمال کرتے ہیں۔ البتہ گرام کا ویٹ بکس خرید لیں۔ اس کی قیمت سات آٹھ روپے کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

اگر وزن تولے ماشوں میں کرنا ہو تو بازار سے تولے ماشے کے اوزان کا سیٹ خرید لیں جو سستے داموں مل جائیگا۔

مکعب سنٹی میٹر کا مفہوم واضح کرنے کے لئے ایک کھوکھلا ٹین کا مکعب بنوائیں جس کی لمبائی چوڑائی اور اونچائی ایک۔ ایک سنٹی میٹر ہو۔ اور پھر اس میں پانی بھر کر دکھائیں اور کہیں کہ اب اس پانی کا حجم ایک مکعب سنٹی میٹر ہے۔ اس طرح ایک اور بڑے مکعب کو بنوائیں جس کا ہر ایک ضلع ۲ سنٹی میٹر ہو۔ اس میں پانی بھر کر دکھائیں کہ اب اس کا حجم ۸ مکعب سنٹی میٹر ہے، کیونکہ مکعب سنٹی میٹر کا مفہوم بچوں کے لئے مشکل چیز ہے۔

سطح یا رقبہ کو مربع سنٹی میٹر میں دکھانے کے لئے ٹین کے مربع شکل کے ٹکڑے کاٹ لیں جنکی لمبائی اور چوڑائی ایک سنٹی میٹر ہو۔ اس ٹکڑے کو سیاہ رنگ سے رنگ لیں، اور بتائیں کہ اس ٹین کی سطح کا رقبہ ایک مربع سنٹی میٹر ہے۔ ایک اور ٹین کے ٹکڑے کی لمبائی چوڑائی ہر ایک دو سنٹی میٹر رکھیں اور کہیں کہ اس ٹین کے ٹکڑے کا رقبہ چار مربع سنٹی میٹر ہے، اسے بھی سیاہ رنگ سے رنگ لیں۔

مخروط، منشور، بیلن اور اہرام (PYRAMID) کے ماڈل گتے کے بنوالیں، یہی چیزیں مٹی سے بھی بنائی جا سکتی ہیں۔

ٹھوس کے خواص ٹھوس کی لچک کے ظاہرے کے لئے ایک کانچ کی گولی کو پتھر پر کوئی چار فٹ کی بلندی پر سے گرائیں تو یہ پتھر سے ٹکرا کر اوپر کو اچھلے گی، یہی تجربہ ٹھوس ربڑ کی گیند سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ چیڑ کی لکڑی کا اگر لمبا ۱ انچ چوڑا اور $\frac{1}{8}$ انچ موٹا ٹکڑا لیکر اسے دونوں ہاتھوں میں لیکر موڑ کر دکھائیں اور پھر یکدم چھوڑ دیں وہ سیدھا ہو جائے گا، اس طرح لچک کا مفہوم سمجھائیں۔

ٹھوس کے ورق اور تار بن سکتے ہیں، اس کے لئے چاندی کے ورق اور لوہے یا تانبے کے تار لگائیں، ورق کے بعد مگنیٹ کے بکس کا ورق بھی دکھائیں۔

ٹھوس میں مسام ہوتے ہیں۔ اس کو دکھانے کے لئے تھوڑی نیلی سیاہی کسی چیز میں لیکر اس میں ایک چاک کھڑا کر دیں، سیاہی چاک کے ٹکڑے کے مساموں میں چلی جائے گی۔

لیور (یا بیرم) کا اصول لکڑی یا دھات کا سیدھا یا مڑا ہوا لمبا سا ٹکڑا لیور کا کام دے سکتا ہے معمولی پیمانہ، لکڑی کی چھڑی، لوہے کا گز وغیرہ سب لیور کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ بچوں کو لیور کا اصول سمجھنے میں کچھ دقت ہوتی ہے، اس لئے بہتر ہے کہ ہر ایک لڑکے سے مندرجہ ذیل تجربے کرائیں۔ ان کے لئے سامان بالکل معمولی درکار ہے۔

لکڑی کا ایک ۲ فٹ لمبا ایک انچ چوڑا اور چوتھائی انچ موٹا ٹکڑا لیں، اس کے دونوں سروں پر دو سوراخ کریں اور تیسرا سوراخ بیچ وسط میں کریں، یہ لکڑی کا ٹکڑا لیور کا کام خوب انجام دیگا۔

پہلی قسم کا لیور اس کے لئے بیچ والے سوراخ میں سے ایک مضبوط سا کیل گذار کر کیل کو میز کی سائڈ میں گاڑ دیں، اب ایک اینٹ وغیرہ کو ستلی سے باندھ کر اسے ایک سرے والے سوراخ میں گذار کر باندھ دیں، دوسرے سرے والے سوراخ میں ستلی کا ایک اور ٹکڑا باندھ کر زور لگائیں تاکہ اینٹ اٹھی رہے۔

بیرم
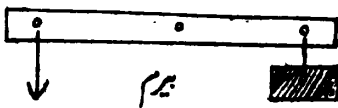
دوسری قسم کا لیور اس کے لئے کیل کو ایک سرے والے سوراخ میں گاڑیں اور اینٹ کو درمیان والے سوراخ سے لٹکائیں اور طاقت کو دوسرے سرے والے سوراخ میں سے ستلی ڈال کر لگائیں تاکہ اینٹ اٹھی رہے۔

تیسری قسم کا لیور کیل کو ایک سرے والے سوراخ میں سے گذار کر گاڑیں اور دوسرے سرے والے سوراخ میں سے ستلی کی مدد سے اینٹ کو لٹکائیں، پھر درمیان والے سوراخ میں ستلی باندھ کر اٹھائیں۔

چرخی یا پُلی (PULLEY) کا اصول اس کے لئے تاگے کی خالی ریل اور ۴ انچ لمبی لوہے کی کیل (بغیر سر کے) درکار ہے، اس کیل کو میز کی سائڈ میں گاڑ دیں اور اس پر ریل کو چڑھا دیں کہ وہ گھوم سکے، اب اس ریل پر سے سُتلی گذاریں اور سُتلی کے دوسرے سرے پر اینٹ باندھ کر اٹھائیں۔
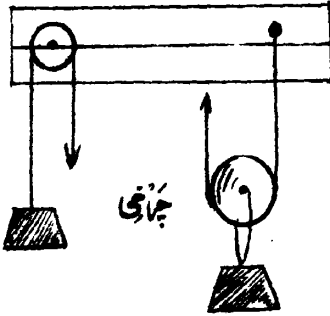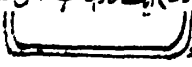
چرخی

متحرک چرخی اس کے لئے سُتلی کو ریل کے گرد گذاریں اور ایک سُتلی کا ٹکڑا لیکر اسے چرخی کے سوراخ میں سے گذاریں اور اس کے ساتھ اینٹ وغیرہ باندھ دیں۔ اور اب سُتلی کے آزاد سرے کو اوپر اٹھائیں، چرخی کے گرد گذرتی ہوئی سُتلی کا دوسرا سرا کیل کے ساتھ باندھ دیں جو کہ میز میں گڑا ہوا ہے۔

۲۔ **مائع کی خاصیتیں** پہلے ہم ان اپریٹسوں کے بنانے کی ترکیب بتائیں گے جو کہ کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں، تاکہ کتابوں میں دیئے ہوئے تجربے اس سامان کی مدد سے ہو سکیں جو عمل میں بنایا گیا ہو۔ اس سامان میں لکڑی کا اور لوہے کا حصّہ تو آسانی سے بنایا جا سکتا ہے، صرف گلاس ٹیوبگ یعنی شیشے کی نلی خریدنی پڑے گی سو یہ کافی سستے داموں مِل جاتی ہے۔

(۱) مائع کا دباؤ گہرائی کے مطابق ہوتا ہے اس کے لئے ایک کنستر لےلیں اور کنستر میں سوراخ کرلیں، یہ سوراخ ایک عمودی خط میں ہونے چاہئیں اور دو سوراخوں کے درمیان دو انچ کا فاصلہ ہونا چاہیئے، سوراخ ایک کیل سے کرلیں پھر ایک سوراخ کوئی ایک سوت موٹا ہو، ان سوراخوں کو کاغذ کی بتی دیکر بند کرلیں، کنستر کو پانی سے بھر کر کاغذ نکال لیں تو پانی کی دھار سب سے نیچے والے سوراخ میں سب سے دور تک جائے گی، سوراخ سیدھے کریں ٹیڑھے نہ ہوں، بہتر ہے کہ کنستر کا اوپر کا

ہمکن کاٹ لیں۔

(۲) مائع اپنی سطح ہموار رکھتی ہے۔ یا مائع کا لیول (LEVEL) ایک سا رہتا ہے۔ اس کے لئے واٹر لیول بنالیں، مگر واٹر لیول شیشے کا نہ بنائیں۔ ایک ٹین کی نلی کو شکل کی موڑ لیں۔ اور دونوں چھوٹے بازوؤں میں شیشے کی نلی کاٹ کر فٹ کر دیں، جوڑ پر سُرخ لاکھ ـ (SEALING WAX) پگھلا کر لگا دیں، یا موم ہی پگھلا کر لگا دیں۔ تاکہ پانی جوڑ میں سے نہ ٹپکے، اس واٹر لیول کو کسی لکڑی کے تختے پر کس لیں۔ اس طرح اگر تین نلیوں والا لیول بنانا ہو تو نمبر ا دی ہوئی شکل کا ٹین کا سامان بنالیں اور اس کی ہر ایک شاخ میں سیدھی نلی یا ٹیڑھی نلی یا دو خم والی نلی نمبر ۲ کی شکل کی لگائیں، اور اس کو کسی لکڑی کے ٹکڑے پر کس لیں، اس اپریٹس کا فائدہ یہ ہے کہ اگر شیشے کی نلی والا حصہ ٹوٹ جائے تو دوسری نلی لگا لیں، اپریٹس میں پانی بھر لیں، مشاہدے سے معلوم ہوگا کہ ہر شاخ میں پانی کا لیول ایک سا ہوگا۔

۳۔ **مائع کا فوارہ** ایک چھوٹے ٹین کے کنستر یا کسی بڑے ٹین کے ڈبے کے نیچے ایک ٹین کی نلی کا ٹانکہ لگا لیں۔
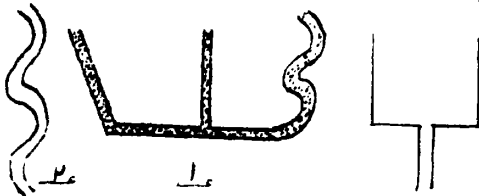
اب ایک ٹین کی قیف لیں اور اس کے چوڑے منہ پر ایک سوراخ والا ٹین کا ٹکڑا ٹانکا کر لیں اور ٹانکے والے جوڑ پر لاکھ یا موم لگائیں تاکہ پانی نہ ٹپکے اب ایک ربڑ کی نلی لیکر اس کا ایک سرا ٹین کے ڈبہ کی ٹونٹی پر لگائیں اور دوسرا سرا قیف کے سرے پر لگائیں جیساکہ شکل ۳ سے ظاہر ہے۔

ڈبہ میں پانی بھرنے سے قیف کے سوراخوں سے

[illegible]
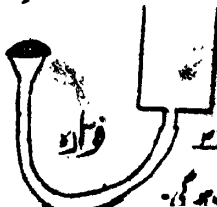
۴۔ مائع کا دباؤ چاروں طرف یکساں ہوتا ہے ایک ربڑ کا بڑا سا گیند لیں اور اس میں ایک ایک سوت برابر چاروں طرف سوراخ کرلیں، ہر دو سوراخ کے درمیان کا فاصلہ کوئی آدھ انچ کے قریب ہو، بہتر ہو کہ ہر ایک سوراخ کو پن سے صاف کرلیں تاکہ سوراخ صاف ہو، اب گیند کو پانی سے بھر لیں، دبانے پر چاروں طرف سے پانی نکلے گا۔

۵۔ پاسکل کا اصول مائع کا دباؤ پسٹن کے رقبہ کے متناسب ہوتا ہے:۔

ٹین کی دو فٹ لمبی اور ایک انچ چوڑی نالی بنائیں اور ایک دس انچ چوڑے قطر کا ایک ٹین کا ڈبہ لیں، نالی کو دو قائمہ زاویوں پر موڑیں اب چھوٹے سرے پر ٹین کا ڈبہ پیوستہ کریں۔ اب ہر ایک نالی میں ایک پسٹن فٹ کریں، پسٹن ایسے ہوں کہ ان میں سے پانی باہر نہ نکلے مگر نالیوں میں نرمی سے چلیں اب ان میں مائع بھر دیں اور چھوٹے پسٹن پر ایک پاؤنڈ کا وزن رکھیں تو بڑے پسٹن پر ۱۰۰ پاؤنڈ کا وزن سہارا جائے گا۔ شکنجہ آبی یا براما پریس میں یہی اصول کام کرتا ہے دیکھو شکل (ل)

۶۔ واٹر پمپ کا اصول اس قیف سے سمجھائیں جس سے تیل نکالتے ہیں، یہ قیف بازار میں ہر جگہ ملتی ہے اور ٹین ساز سے ٹین کی بنوائی جاسکتی ہے۔

۷۔ شکنجہ آبی اس آلے کی عام اسکولوں میں کمیابی ہوتی ہے، اس کے شیشے کے حصے اکثر ٹوٹ جاتے ہیں، ہم مندرجہ ذیل حل پیش کرتے ہیں۔
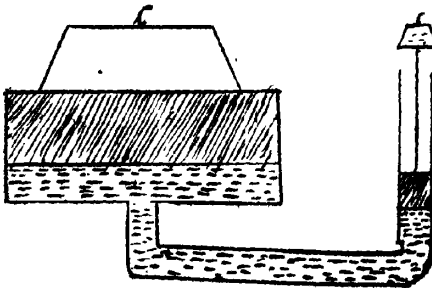
شکل (ل)

ایک تیل نکالنے والی قیف لو اور اس کی ڈنٹی کی بجائے ایک متوازی نلی لگاؤ، اس نلی کے دوسرے سرے پر ایک سگرٹ کے ٹین کا ڈبہ لگاؤ۔ اس ڈبہ میں ایک ٹین کا پسٹن لگاؤ، قیف کو پانی میں ڈال کر چلاؤ تھوڑی دیر بعد پسٹن اٹھنے لگے گا۔ دیکھو شکل (م)

(م)
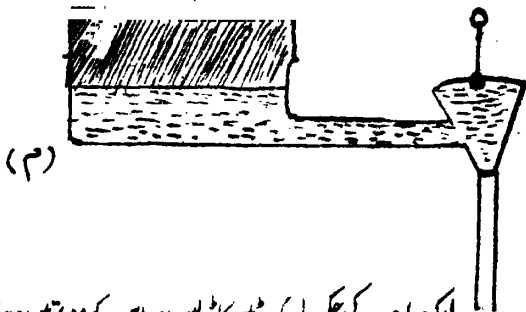
بارکر صاحب کی چکی ایک ٹین کا ڈبہ لیں اور اس کے منہ پر تین دھاگے باندھیں اور دھاگوں کو اکٹھا باندھ کر ایک اور دھاگہ سے باندھیں تاکہ ایک ڈول سا بن جائے۔ اس ڈبہ کے پیندے سے آدھ انچ اوپر چاروں طرف چار سوراخ کریں، سوراخ سب یکساں فاصلہ پر ہوں اور سب ایک ہی اونچائی پر ہوں، ڈبہ میں پانی بھر کر دھاگا کو پکڑ لیں، سوراخ ذرا ٹیڑھے ہوں تو ڈبہ گھومنے لگے گا، غور سے دیکھو کہ جس سمت میں پانی نکلتا ہے ڈبہ اس کے مخالف سمت میں گھومتا ہے، اس اپریٹس سے (REACTION) یعنی ردِّ عمل کا اصول بہت اچھی طرح سے سمجھ میں آجاتا ہے، غور سے دیکھو کہ جس سمت میں پانی نکلتا ہے۔ ڈبہ اس کے مخالف سمت میں گھومتا ہے، دیکھو شکل (ن)

شکل (ن)
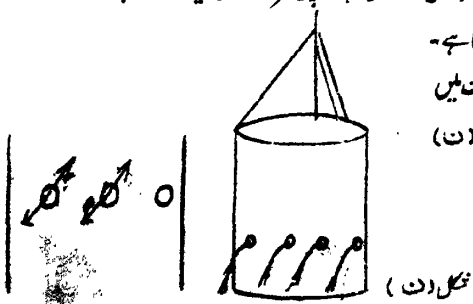
۹ مائع کا حجم دباؤ سے تبدیل نہیں ہوتا | ایک پچکاری میں پانی بھر کر پچکاری کا منہ بند کر کے ہینڈل کو دباؤ تو مائع ہرگز نہ دبے گی۔ اس سے ثابت ہوا کہ مائع اپنا حجم نہیں بدلتی۔

۱۰۔ مائع کا دباؤ اوپر کی طرف بھی ہوتا ہے۔ | ایک ٹین کا کھو کھلا سلنڈر بنائیں، سلنڈر کے نیچے ایک ٹین کا قرص لگائیں۔ قرص پر بہتر ہے کہ سائیکل کی ٹیوب کی ربڑ کا ٹکڑا لگائیں اور قرص پر ایک دھاگہ لاکھ سے چپکائیں، باہر کے برتن کی بجائے ڈبہ استعمال کریں، کھو کھلے سلنڈر کے نیچے ایک قرص لگا کر دھاگہ کو کس کر کھینچیں اور پانی میں تین چار انچ گہرائی تک لے جائیں اب کھو کھلے سلنڈر میں آہستہ آہستہ پانی ڈالیں تو قرص ساتھ ہی چپکا رہے گا نیچے نہ گریگا۔

دیکھو شکل (۹)

۱۱۔ سائفن کا اصول | ایک ربڑ کی نالی کو پانی سے بھر لیں اور دونوں طرف سروں پر انگلی لگا کر رکھیں۔ انگلی اور نالی کا سرا دونوں مائع میں ڈوبے رہیں اب دونوں انگلیوں کو ہٹالیں، مائع بہنا شروع ہو جائیگی ربڑ کی نالی کا ایک سرا ایسے برتن میں ہو جس میں مائع کی سطح اونچے لیول پر ہو اور دوسرا سرا نیچے لیول پر رکھیں۔

(۹)
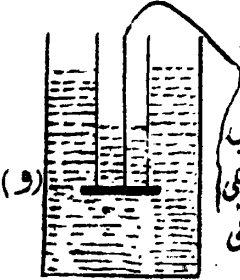
گیس کے خواص
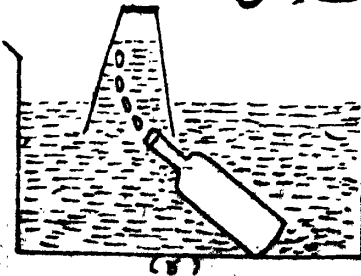
گیس شکل تبدیل کر لیتی ہے

ایک خالی بوتل لو۔ اور ایک گلاس پانی سے بھرا ہوا لیکر اس کو پانی میں الٹا کر دو خالی بوتل کو گلاس کے نیچے لیجاؤ بوتل کا منہ انگلی سے بند رکھو اور جب گلاس

(۲)

نیچے آجائے تو انگلی ہٹالو۔ بوتل کی ہوا نکل کر گلاس میں آجائے گی۔ بوتل کی ہوا نے گلاس کی
ں اختیار کر لی۔ دیکھو شکل (۲)

ں دب سکتی ہے | بائیسکل کے پمپ کا منہ بند کر کے ہینڈل کو دباؤ تو ہوا دب جائیگی
پمپ جائے گی۔ مگر ہینڈل پر سے دباؤ ہٹانے سے پھر ابھر آئے گی۔ اس سے ثابت ہوا
وا لچک دار ہے۔

ں گرم کرنے سے پھیلتی ہے | ایک بڑی اور چوڑی بوتل لو جس کا شیشہ پتلا ہو۔ اس کا
ک پانی سے گیلا کر کے ڈھیلا سا لگاؤ۔ اب خالی بوتل کو دو اٹھ باتھ میں گرم کرو۔ تھوڑی دیر بعد
ک باہر نکل جائیگا۔ کارک گیلا اس لئے کرتے ہیں کہ ہوا بند (AIR TIGHT) ہو جائے۔

یا

سرا تجربہ :۔ خالی بوتل میں کارک لگاؤ اور کارک میں سے پتلی شیشے کی نالی گزارو۔ اور نالی
ں ایک دو قطرے رنگین پانی کے ڈالو تاکہ نالی میں ساکن رہے۔ بوتل کو دو اٹھ باتھ میں رکھ کر گرم کرو
رنگین پانی اوپر چڑھتا نظر آئیگا۔

یا

ربڑ کے غبارے کو ہوا سے ذرا کم بھرو اور تاگے سے منہ بند کر کے دھوپ میں رکھ دو تو غبارہ
پھول جائے گا۔

حرارت کے تجربے

۔ مائع حرارت سے پھیلتی ہے | ایک بوتل میں ایک کارک فٹ کر کے شیشے کی نلی گزاریں
۔ بوتل میں پانی بھریں یہاں تک کہ پانی شیشے کی نلی میں ظاہر ہو اور بوتل کو دو اٹھ باتھ میں رکھیں
نی پھیلے گا۔ پانی کو رنگین کر لو۔

۔ گیس حرارت سے پھیلتی ہے | ایک اور جیسی بوتل میں کارک اور نلی فٹ کریں اور نلی میں ایک
[illegible]

کریں۔ مائع کا قطرہ اوپر کو حرکت کرے گا۔

۳۔ **دھاتیں حرارت کی موصل ہیں** | ایک ٹین کے ڈبے کے اوپر سے کاغذ اتار لیں اور ڈبے کے اوپر کس کر ایک کاغذ کی تہ لپیٹیں اور کاغذ کو کسی موم بتی کے شعلہ پر رکھیں، کاغذ نہیں جلیگا کیونکہ موم بتی کی حرارت ٹین کے ڈبے نے لے لی۔

۴۔ **گتہ یا لکڑی غیر موصل ہے** | ایک گتے کے ڈبہ پر کس کے کاغذ لپیٹیں اور موم بتی کے شعلہ پر رکھیں۔ کاغذ جل جائے گا، موم بتی کے شعلہ کی حرارت گتے میں سے نہیں گذر سکتی، اس لئے کاغذ جل جاتا ہے اسی طرح لکڑی کے گلاس پر کاغذ کس کر لپیٹیں اور موم بتی سے جلائیں تو کاغذ جل جائیگا، اس لئے کہ گتہ اور لکڑی غیر موصل ہے۔

ٹھوس حرارت سے پھیلتی ہے۔ | ایک دس انچ لمبا اور دس انچ چوڑا ٹین کا ٹکڑا لیں اور اس کے وسط میں سے ایک چار انچ قطر کا گول قرص کاٹ لیں۔ مگر کٹائی نہایت صحیح اور صفا ہو۔ تاکہ قرص کو سوراخ میں ڈالنے سے قرص آسانی سے گذر سکے، نرمی سے نہ گذرے، اور سوراخ میں ڈھیلا نہ گذرے، اب قرص کو برف اور نمک کے آمیزے میں رکھا رہنے دو، کچھ دیر بعد نکالکر سوراخ میں سے گذارو تو نہایت آسانی سے اور ڈھیلے پن سے گذر جائیگا۔ اب قرص کو اسپرٹ لیمپ کے شعلہ میں رکھ کر گرم کرو اور پانچ منٹ بعد اس کو چمٹے سے پکڑ کر سوراخ میں سے گذارنے کی کوشش کرو ہرگز نہ گذرے گا، اس سے ثابت ہوا کہ ٹین گرم کرنے سے پھیلے گا۔

مختلف موصل حرارت | ایک گیلی مٹی کا سوراخ والا قرص بنائیں اور اس قرص کی مٹی میں سے چار سوراخ کر کے ان میں سے تانبے، لوہے، پیتل اور جست کے موٹے اور سیدھے تار گذاریں۔ تاروں کی لمبائی برابر ہو۔ تاروں کے سرے ایک دوسرے سے قرص کی خالی جگہ میں چھپائیں اور تاروں کی لمبائی ۵ انچ کے قریب ہو۔ تاروں پر پگھلے ہوئے موم کی لپائی کردیں، اس کے بعد جب موم ٹھوس بن جائے تو تاروں کو مرکز میں اسپرٹ لیمپ سے گرم کریں، کچھ دیر بعد مختلف تاروں پر مختلف لمبائی تک موم پگھلے گا۔

[illegible] | ایک چوکور ڈبہ میں چار ٹین کی ٹونٹیاں ٹانکے سے لگائیں، ہر ٹونٹی میں ایک سوراخ والا کارک لگا دیں اور سوراخ میں سے مختلف دھاتوں کے موٹے تار لگا دیں، ڈبہ میں اتنا پانی ڈالیں کہ ٹونٹیوں تک آ جائے۔ تاروں پر موم پگھلا کر چڑھائیں، ڈبہ میں گرم پانی ڈالیں تو مختلف دھاتوں پر مختلف فاصلہ تک موم پگھلے گا، ٹونٹیاں سب ایک ہی لیول میں ہوں۔

مائعات غیر موصل ہیں | ایک شیشے کی امتحانی نلی میں پانی ڈالیں اور ایک برف کی ڈلی پر تار لپیٹ کر پانی میں ڈالیں تو برف کی ڈلی تہ نشین ہو جائے گی، اب اسپرٹ لیمپ کا شعلہ پانی کی اوپر والی سطح کے نیچے رکھیں، کچھ دیر بعد پانی ابلنے لگے گا، مگر برف نہ پگھلے گی۔ اس سے نتیجہ نکلا کہ پانی حرارت کا غیر موصل ہے۔

روشنی کے تجربے

روشنی سیدھی لائن میں گذر کرتی ہے | ایک اندھیرے کمرے میں جس میں روشنی داخل ہوتی ہو سب دروازے بند کر کے ایک دروازے میں چھوٹا سا سوراخ کر کے اور کمرے میں چاک کا بھرا جھاڑ کپڑا جھاڑو۔ یا بہت باریک ریت کو لیکر ململ کے کپڑے میں سے چھان کر اس ریت کو کمرے میں اڑا دو، تم دیکھو گے کہ روشنی کا راستہ بالکل سیدھی لکیر کے ذریعہ ہوتا ہے۔

دوسرا تجربہ:- ڈرائینگ پیپر یا دیگر قسم کا موٹا کاغذ لیکر اس کی ایک لمبی نالی سی بنالیں، نالی کا قطر ایک انچ کے قریب ہو، تین چار ایسی کاغذ کی نالیاں ایک ایک فٹ لمبی بنالیں اور سب کو بالکل ایک سیدھ میں لگائیں۔ اب اس لمبی نالی کے ایک سرے کے قریب موم بتی رکھیں اور دوسرے پر آنکھ سے دیکھیں، اگر تینوں نالیاں بالکل سیدھ میں ہوں گی تو موم بتی نظر آئے گی، اب اگر کسی بھی نالی کو ٹیڑھا کر دیں تو موم بتی نظر نہ آئے گی۔

روشنی کا انعکاس | اندھیرے کمرے میں چاک کا اجالا جھاڑیں اور سورج کی روشنی گذاریں، روشنی کی شعاع کا راستہ صاف نظر آئیگا، اس شعاع کو ایک آئینہ پر ڈالو، مگر آئینہ خوب اچھا کام دے [illegible]

دیکھو گے کہ روشنی شیشہ سے منعکس ہوتی ہے۔ بہتر ہے کہ آئینہ کو کسی اسٹول پر رکھدیں تاکہ جس مقام پر روشنی آئینہ پر گرتی ہے اگر وہاں ایک پنسل کھڑی کردیں تو دیکھو گے کہ اتصالی شعاع اور انعکاسی شعاع پنسل کے ساتھ یکساں زاویہ بناتی ہیں۔

روشنی کا انعطاف | ایک بالٹی میں صاف پانی لیکر اس میں بہت باریک پاوڈر کی دو تین چٹکیاں گھول دیں، پاوڈر باریک ململ میں سے چھان لو۔ اب اندھیرے کمرے میں چاک کا جھاڑن جھاڑ کر روشنی کی شعاع گذارو۔ اس شعاع کو پانی کی سطح پر ڈالنے سے تم کو روشنی کی شعاع کا راستہ پانی میں صاف نظر آئے گا اور تم دیکھو گے کہ اتصالی شعاع اور انعطافی شعاع (REPRECTID RAY) ایک سیدھ میں نہیں ہیں۔ دوسرا تجربہ:- ایک پانی کی بڑی بالٹی لیکر اس میں پانی بھرو اور پانی کے اندر ایک لکڑی کا ایسا لگڑ یا سیدھی بید کی چھڑی ڈالیں تاکہ لکڑی کے ٹکڑے کا چھ سات انچ کا حصہ پانی کے اندر رہے۔ لکڑی کے ٹکڑے کو ٹیڑھا رکھو گے تو دیکھو گے کہ ٹکڑا ٹوٹا ہوا نظر آتا ہے۔ واضح رہے کہ پانی کو ہلنے نہ دیں۔

پن ہول کیمرہ | ایک گتے کا ڈبہ بنائیں یا چھوٹا سا گتے کا ڈبہ لیں جس میں جوتے رکھے جاتے ہیں ڈبہ کی لمبائی چوڑائی اور اونچائی تقریباً چھ انچ ہو، ڈبہ کے اندر کوئلہ سے یا توے کی سیاہی سے کالا کر دیں، ڈبہ کے آگے کی طرف بالکل بیچ میں ایک سوراخ موٹی سوئی سے کریں، سوراخ کا سائز پنسل کے سرے جتنا ہو، ڈبہ کے پچھلی طرف ایک ٹیننگ کا سفید کاغذ گوند سے لگائیں۔ اب اندھیرے کمرہ میں اس کیمرہ کو لیجائیں اور کیمرے کے سوراخ کو دروازے کے سوراخ سے لگائیں تو باہر کی چیزوں کا عکس کاغذ پر آجائیگا۔ اگر اس کیمرہ پر ایک فٹ کے فاصلہ پر ایک موم بتی رکھیں تو موم بتی کا عکس بھی کاغذ پر آجائیگا۔

مدرسین کی ڈائری

—————— نذیر احمد آثم
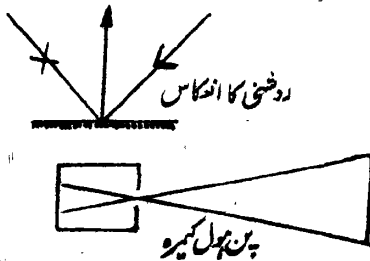
"مدرسین کی ڈائری" پولیس یا کسی اور محکمے کا روزنامچہ نہیں ہے اور نہ اس کا وہ مقصد ہے جو عموماً روزنامچوں کا ہوا کرتا ہے، اس لئے میری اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ اس کا نام۔ مدرسین کی ڈائری کی بجائے اگر "تیاری اسباق کی نوٹ بک" رکھا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ بعض مدرسین روزانہ اپنی ڈائری پُر کرتے ہیں۔ اور بعض ہفتہ وار اس کے اندراجات کی طرف توجہ فرماتے ہیں۔

ذیل میں بڑی چھان بین کے بعد دونوں قسم کی ڈائریوں کے دو نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ جو کم و بیش زیادہ مقبول ہیں۔

روزانہ ڈائری کا نمونہ

تاریخ	جماعت	مضمون	کیفیت
۵۰-۵-۲۵	ہشتم	حساب	آمیزش کا قاعدہ سمجھایا جائے گا، مشق نمبر ۵۸ کے ۵ سوالات حل کراؤں گا
" " "	"	اردو	مرقع ادب صفحہ ۲۱۳ لغایت ۲۱۵ پڑھاؤں گا۔
" " "	"	تاریخ	لارڈ ڈلہوزی کا حال پڑھایا جائے گا۔

ہفتہ وار ڈائری کا نمونہ

ہفتہ مختتمہ	جماعت	مضمون	مجوزہ کام	کام جو نہ ہوسکا معہ وجوہ	رائے ہیڈ ماسٹر
۲۵/۵/۵۰ تا ۳۰/۵/۵۰	ہشتم	حساب	آمیزش اور تقویم کے قاعدے سمجھانا مشق نمبر ۷۵، ۸۰ کے تمام سوالات سوائے شروع کے پانچ کے حل کرائے جائیں گے	تقویم کا قاعدہ	ڈائری تا تاریخ مکمل ہے نصاب ماہ مئی اب تک ختم نہیں ہوا اس طرف توجہ کی جائے۔
″	″	اردو	نو ترمیم اردو کورس صفحات ۱۷۸ سے ۲۱۴ تک۔ مرقع ادب صفحہ ۱۲۹ سے ۱۳۸ تک پڑھائے جائیں گے	مرقع ادب صفحہ ۱۲۹ تا ۱۳۸	
″	″	مضمون نویسی	دیہات سدھار پر مضمون لکھوایا جائیگا	مضمون	
″	″	جغرافیہ	شمالی امریکہ میں کنیڈا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کا حال پڑھایا جائے گا۔	کنیڈا	
″	″	تاریخ	لارڈ ڈلہوزی کے زمانے کے حالات مکمل پڑھائے جائینگے	نوٹ:- میری دو روزہ رخصت کی وجہ سے کام باقی رہ گیا ہے۔ کمی پوری کرادی جائیگی	

مدرسین کے لئے روزانہ ڈائری کا لکھنا وبال جان ہے، اس لئے وہ ہفتہ وار ڈائری لکھنا پسند کرتے ہیں کیونکہ اس میں بہت سی سہولتیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ اکثر مدارس میں ہفتہ وار ڈائریاں لکھنے کا طریقہ رائج ہے، بہرحال ڈائریاں ہفتہ وار ہوں یا روزانہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان کے لکھنے کا مقصد اور ضرورت کیا ہے؟ اس سلسلے میں میرے ذاتی تجربے نے جہاں تک میری

راہنمائی کی ہے میں نے تو یہی سمجھا ہے اور دیکھا ہے کہ معائنہ کے وقت اگر افسران ڈائریوں کا مطالبہ کریں تو ان کے سامنے پیش کر دی جائیں۔ اور بس۔ یہ تو ہوا اس کا مقصد۔ اب رہ گیا ضرورت کا سوال تو ضرورت اس کی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ہیڈ ماسٹر کا روزانہ اصرار ہے کہ ڈائری رکھو اور لکھو۔

ڈائری لکھنے کا وقت: اکثر اوقات یہ ڈائری کئی کئی مہینے کی ایک ساتھ ہی لکھی جاتی ہے، اور پھر ادھر معائنہ ختم ہوا ادھر ڈائری طاق نسیاں کی زینت بنی۔ لیکن اگر کسی سکول کا ہیڈ ماسٹر منطقی یا غیر معمولی طور پر باقاعدگی سے کام لینے والا ہے تو اساتذہ یہ سمجھ کر کہ جہاں افسران معائنہ کے مطالبات پورا کرنے کیلئے ہزاروں پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں وہاں اس ضدی ہیڈ ماسٹر کو خوش رکھنے کے لئے یہ ڈائری کی خانہ پری بھی سہی۔ بالفاظ دیگر گویا ڈائری کی تعریف یہ ہوئی کہ یہ مدرسین کا ایک ایسا روزنامچہ ہے جس میں وہ بقید تاریخ مضامین، جماعت، اسباق کے نام اور کتابوں کے صفحات و نمبروں کے اندراجات کرتے ہیں، تاکہ وہ ہیڈ ماسٹر کی روز روز کی بک بک جھک جھک اور افسرانِ معائنہ کی بروقت جھڑکیوں سے چھٹکارا پا سکیں۔

میں نے اپنی پچیس سالہ ملازمت میں بڑے جید قسم کے ہیڈ ماسٹروں سے نہایت سنجیدگی اور متانت کے پیرائے میں کئی بار یہ سوال کیا کہ آپ ڈائریاں کیوں لکھواتے ہیں؟ تو انہوں نے بڑی بے تکلفی سے یہی فرمایا "آپ کو معلوم نہیں کہ افسران معائنہ ڈائری لکھوانے پر بے حد اصرار کرتے ہیں اس کے متعلق بے شمار سرکلر آئے دن آتے رہتے ہیں۔ اگر یہ نہ لکھوائیں اور لسے نہ رکھوائیں تو اور کیا کریں" کچھ ایسے ہیڈ ماسٹر بھی تھے جن کا جواب یہ تھا کہ جناب اس کے بڑے فائدے ہیں، مدرس باقاعدگی پر مجبور رہتا ہے۔ مختلف جماعتوں کی تعلیمی رفتار کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے سلیبس اور ڈائری کا موازنہ کرنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ سلیبس کا کتنا حصہ پورا ہو جانا چاہئے تھا، اب کتنا ہوا اور کتنا باقی رہا اور کیوں باقی رہا وغیرہ وغیرہ۔

میں اپنے خیال کے مطابق ایسے تمام حضرات کو خواہ وہ ڈائری لکھنے والے ہوں یا دوسروں کو مجبور کر کے ڈائری لکھوانے والے ہوں اسی طبقے میں شمار کرتا ہوں جو مدرسین کی ڈائری کو پولیس یا کسی

اور محکمے کا روزنامچہ تصور کرتے ہیں، کیونکہ ان حضرات کے جوابات میں اس مقصد کے لئے ایک لفظ بھی موجود نہیں کہ اس ڈائری سے مدرسین اور ان کے طلبا کو کیا فائدہ پہونچتا ہے، یا آئندہ پہونچنے کی توقع ہے؛

نوٹ بک کیسے لکھی جائے اور اس میں کیا کیا لکھا جائے

اس سلسلے میں عرض ہے کہ اگر مدرسین کی نوٹ بک کو مفید بنانا مقصود ہے تو اس میں مضامین اور اسباق کی نوعیت کے اعتبار سے ضروری اشارات درج کرنے ہوں گے۔ لیکن ان اشارات سے میرا میرا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان میں خوامخواہ سبق کے پانچوں درجے (HESBABTION) ضبط تحریر میں لائے جائیں، اپنی جماعتوں کے جملہ مضامین کے اسباق کے مکمل اشارات روزانہ تیار کرنا اول تو قریب قریب ناممکن ہے اور اگر اس تکلیف مالایطاق کو برداشت بھی کیا جائے تو بے سود تضیع اوقات ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ مدرسین کی نوٹ بک (ندملاً) سے پیش ہوئی بیش بہا اور انمول معلومات کی ایک ایسی بیاض ہونی چاہئے جو جماعت کے کمرے میں پیش آنے والی مشکلات پر حاوی ہونے کے علاوہ مدرسین کی خود اعتمادی اور اسکی تقویت خاطر کا بہترین ذریعہ بھی ہو؛

ہر مدرس ادبی سبق کے دوران میں بعض الفاظ کی وضاحت کرنے میں دقت پیش آتی ہے محاورات کے محل استعمال ذہن نشین کرنے، موزوں فقروں کی تلاش یا فی البدیہہ ساخت سے طبیعت قاصر رہتی ہے، سائنس یا جغرافیہ کے اسباق میں طباع اور ذہین طلبہ کے برجستہ سوالات پر بغلیں جھانکنے کی نوبت بھی آجاتی ہے بعض اوقات طلبہ کی "کیوں" اور "کس طرح" قافیہ تنگ کردیتی ہے، حساب کے پیریڈ میں طلبہ کوئی نئی قسم کا سوال پیش کردیتے ہیں تو استاد کو اُسے فوراً حل نہ کرسکنے کے سبب سے خجالت اٹھانی پڑتی ہے۔

ان تمام مشکلات میں مدرسین کے کام آنے والی اور اس کے ہر قسم کے درد کا مداوا اسکی یہی نوٹ بک ہوسکتی ہے، ان ضروریات کے پیش نظر آپ خود ہی اس بات کا اندازہ لگالیں

کہ مدرسین کی اس قسم کی نوٹ بک میں کیا کیا درج ہونا چاہئے، میرے خیال میں ایسی نوٹ بک میں ہر جماعت کے ہر مضمون کے لئے علیحدہ علیحدہ کھاتے ہونا ضروری ہیں۔ مثلاً اردو کے کھاتے میں مشکل مترادف اور مشترک الفاظ درج کئے جائیں، جو الفاظ عام طور پر غلط بولے اور لکھے جاتے ہیں ان کی تشریح ہو، محاورات کا استعمال واضح کیا جائے۔ ضرب الامثال کے ماخذوں اور ان کے متعلق حکایات کے اشارات ہوں، وجہ تسمیہ، تلمیحات اور ان مصنفین کی سوانح حیات اور ان کی تصانیف کے چھوٹے چھوٹے نوٹ درج ہوں جن کے اقتباسات آپ کی درسی کتابوں میں موجود ہیں۔ تاکہ اس مواد کو کام میں لاکر آپ طلبا میں زائد مطالعہ کا شوق پیدا کر سکیں۔

ریاضی کے کھاتے میں جماعت کی درسی کتاب کے علاوہ بازار میں ملنے والی تمام کتابوں سے انتخاب کئے ہوئے نئی نئی طرز کے سوالات درج ہوں، تاکہ آپ کمرۂ جماعت میں پڑھاتے ہوئے اپنے طلبہ سے شرمندہ نہ ہوں۔ اور آپ کے طلبا، کمرۂ امتحان میں پرچے حل کرتے وقت پریشان نہ ہوں۔

اس قسم کی نوٹ بک کی فارم بھی موجودہ روزانہ اور ہفتہ وار ڈائریوں سے کچھ مختلف ہوگی اس کے ایک صفحہ پر نوٹ لکھے جائیں اور دوسرا صفحہ خالی چھوڑ دیا جائے، تاکہ مزید معلومات کی روشنی میں اضافے کی گنجائش رہے۔ جس صفحے پر نوٹ لکھے جا رہے ہیں اس کا بھی کچھ حاشیہ خالی رکھنا ضروری ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دوران سبق میں بعض باتیں سوجھ جاتی ہیں۔ یا نوٹس لکھنے کے بعد کوئی اور مفید بات یاد آ جاتی ہے، کبھی نوٹس کو دہرانے سے بعض نئے امور پیش نظر آ جاتے ہیں، ایسا بھی ہوتا ہے کہ جماعت کے کمرے میں طلبا کے سوالات بعض ایسی نئی باتوں کو زیر بحث لے آتے ہیں جو مزید معلومات کے متقاضی ہوتے ہیں یا نئی مشکلات رونما ہو جاتی ہیں، ان تمام صورتوں میں ضروری اضافہ کی یہی گنجائش حاشیہ مہیا کر دیتی ہے۔

اس کے بعد تاریخوں کا مسئلہ ہے۔ مدرسین کو چاہئے کہ سب سے پہلے اپنے اسباق کو وحدت درسوں (UNITS OF LESSONS) میں ترتیب دے۔ مثلاً کہ مدرس جماعت ہشتم کو اردو میں

ے کی پیدائش" کا حال پڑھانا چاہتا ہے تو اسے اس بات کا اندازہ لگانا ہوگا کہ اس سبق کو
، درسوں میں ختم کیا جا سکے گا، بعد ازاں ہر درس میں بتائی جانے والی باتیں خاص طور پر انتخاب
ِ جائیں، حاشیہ پر پنسل سے ہر درس کو پڑھانے کی تاریخ تحریر کر دی جائے، اگر کسی وجہ
، کوئی درس مقررہ تاریخ کو پورا نہ ہو سکے تو پنسل سے لکھی ہوئی تاریخ کو ربڑ سے صاف کر کے
تاریخ لکھی جا سکتی ہے، تاریخ کا ندراج اتنا اہم نہیں ہے جتنا اسے بنا لیا گیا ہے، اسکی
ن صورت یہ ہے کہ جب کوئی نیا سبق یا حساب کا کوئی نیا قاعدہ شروع کیا جائے تو ڈائری
ا اس دن کی تاریخ ڈال دیجئے۔ چلئے قصہ ختم ہوا۔

بادی النظر میں اس تیاری اسباق کی نوٹ بک پر ایک اعتراض وارد ہو سکتا ہے اور وہ
، مدرسین کو اس نوٹ بک کی تیاری کے لئے کافی وقت کی ضرورت ہے اور اس کے گراں بار
ض میں یہ ایک اور نیا اضافہ ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ کوئی اضافہ نہیں اسلئے
ڈائریاں مدرسین عرصہ دراز سے رکھتے چلے آئے ہیں اور جب اسے طوعاً و کرہاً ضروری سمجھا
ا ہے تو ہر حال پر بھی کرنا ہی پڑتا ہے، اس ڈائری کو تیاری اسباق کی نوٹ بک سمجھ کر اندراج
ینے میں صرف اس کا مقصد بدل جائیگا اور فارم میں تبدیلی آ جائے گی۔ مدرسین کو نہ زیادہ
ت کرنا پڑے گی نہ ان پر مزید بار پڑے گا، بلکہ وہی پہلے والی محنت مفید طریقے پر خرچ
ہ گی۔

مدرسین کو یہ امر بھی ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اسباق کی تیاری کرنا ان کے اہم ترین
فض میں سے ایک فرض ہے، جسے انہیں کسی حالت میں نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اس
م کی نوٹ بک انہیں اس فرض کو نہایت عمدہ طریقے سے پورا کرائے گی اور کافی حد تک انکی
و معاون ثابت ہو گی۔

ڈائری رکھنے اور اس کے لکھنے میں خواہ مخواہ اوراق سیاہ کرنا پڑتے ہیں اور وہ وقت جو اسکے
ھنے پر خرچ ہوتا ہے وہ بالکل بیکار اور ضائع جاتا ہے، خود مدرسین کو یا اس کے طلبا کو اس سے

قطعاً کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں پہونچتا، لیکن نوٹ بک رکھنے کی صورت میں وقت کا مفید اور صحیح استعمال ہوگا، مدرسین زیادہ عمدگی اور بیش از بیش کامیابی کے ساتھ اپنے تعلیمی فرائض کی بجاآوری کے قابل نظر آئیں گے جس سے طلبہ کو فائدہ پہونچنا لابدی ہے۔

اس کے علاوہ کسی نئے طریق کی افادیت، علیت اور عملیت کا صحیح اندازہ اسی وقت لگایا جاسکتا ہے جب کہ ایک عرصے تک اس پر عمل پیرا رہا جائے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی طریقہ ظاہر میں نہایت سہل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن آگے چل کر اس میں خلاف توقع نئی نئی مشکلات رونما ہوتی ہیں اور وہ مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا جس کے حصول کے لئے اسے اختیار کیا گیا تھا اور بعض دفعہ ایک طریقہ بظاہر دقت طلب محسوس ہوتا ہے لیکن جب صحیح طریق سے اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں تو تمام مشکلات کافور ہو جاتی ہیں۔

ایسی تیاری اسباق کی نوٹ بک کے مطالعہ سے اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جماعت کو مختلف مضامین میں عام طور پر کون کون سی باتیں بتائی گئی ہیں اور ان کے آموختہ کا ان کی قابلیت کے مطابق اندازہ لگانے میں آسانی رہتی ہے، جب بھی جماعت ترقی پاکر کسی دوسرے مدرس کے پاس جائے گی تو اسے طلبہ کی سابقہ واقفیت کا پتہ چل جائے گا اور اس کی بنا پر اسے اپنے نئے اسباق کی بنیاد قائم کرنے میں پوری پوری مدد ملے گی۔

اس طرز کی نوٹ بک تیار کرنے کے سلسلے میں پہلے سال تو ممکن ہے کچھ دقت ہو لیکن بعد کے سالوں میں بہت ہی معمولی اور جزوی بلکہ محض برائے نام کام باقی رہ جائے گا جبتک کوئی مدرس ایک ہی جماعت کو سابقہ مضامین پڑھاتا رہے گا۔ اس کی یہی نوٹ بک برابر اس کے کام آتی رہے گی۔ کیونکہ آئندہ سالوں میں تاریخ درج کرکے صرف نئے نوٹ لکھنے پڑیں گے اور سابقہ ریکارڈ کا مطالعہ کرلیا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ڈائری رکھنے کی صورت میں ہر روز یا ہفتہ وار مدرسین کو اسے لکھتے رہنا پڑتا ہے

اور یہ ایک سلسلۂ لاتمناہی ہے۔ ایک اور غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ ایک لائق اور اعلیٰ قابلیت والے مدرس کو تیاری کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کونسا لفظ یا محاورہ ایسا ہے جو وہ نہیں جانتا ہوگا۔ اور پھر آجکل سی سہل درسی کتابوں میں کونسا سوال ایسا ہو سکتا ہے جس پر وہ سالہا سال کے تجربے اور ڈگری یافتہ ہونے کے باوجود اٹک جائے؟

اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ ذاتی قابلیت اور شئے ہے اور اپنی قابلیت سے طلبا کو فائدہ پہونچا سکنا اور بات ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ بارہا ایسا اتفاق ہوا ہے کہ معمولی الفاظ کی تشریح یا وضاحت کرتے وقت قابل سے قابل مدرس کو بھی مشکل آپڑتی ہے، مدرس باربار سمجھا چکا ہے لیکن بعض طلبا بالکل نہیں سمجھتے وغیرہ وغیرہ امور اس کے متقاضی ہیں کہ تیاری کی جائے اور اسی بنا پر یہ بالکل بجا ہے کہ جتنی چھوٹی جماعت ہوگی اتنی ہی زیادہ تیاری کی مدرسین کو ضرورت پیش آئے گی۔

تیاریٔ اسباق کی نوٹ بک کے متعلق موٹی موٹی باتیں عرض کردی گئی ہیں۔ اور اس بارے میں میں نے اپنا مطمح نظر پوری طرح واضح کردیا ہے، اب اس خاکے کو اپنی اپنی ضروریات کے مطابق کام میں لانا مدرسین کا کام ہے۔ مگر یہ مضمون اس وقت تک مکمل نہیں کہلا سکتا جب تک اس قسم کی نوٹ بک کے مختلف جماعتوں سے متعلق متفرق مضامین کے چند نمونے درج نہ کئے جائیں، چنانچہ ذیل میں اس کمی کو پورا کیا جاتا ہے۔ اور بطور نمونہ چند مثالیں اس کے متعلق پیش کی جاتی ہیں۔

جماعت دہم مضمون جغرافیہ (پنجاب کی نہریں)

نوٹ:۔ اس سبق کو بطرز احسن پڑھانے کے لئے کم از کم ذیل کے چار درسوں میں تقسیم کرنا پڑے گا۔

(۱) بارش، پنجاب کے دریاؤں کے فائدے، قدرتی نباتات کے مطالعہ سے انہار کی ضرورت کا احساس، نہروں کی اقسام۔ کسی قریب کی نہر کے مشاہدے سے نہر کے متعلق واقفیت

کسی بند کا موڈل بنا کر یا تصویر کے ذریعہ تصوّرات۔

(۲) نقشے کی مدد سے نہروں کے نام معلوم کرنا، نہر جمن غربی۔ نہر سرہند۔ نہر اپر باری دوآب۔ نہر لوئر چناب۔ نہر لوئر جہلم۔ نہر باری دوآب۔ نہر اپر چناب۔ نہر لوئر چناب (بھارت کی نہروں کا حال نظرانداز کیا جاسکتا ہے)

(۳) ستلج دیلی پروجیکٹ کی اہمیت۔

(۴) انہار ثلاثہ یعنی نہر لوئر باری دوآب۔ نہر اپر چناب اور نہر اپر جہلم۔

اب ہم چوتھے درس کے متعلق نوٹ درج کرتے ہیں، اسی طرح دوسرے درسوں کے نوٹ تحریر کئے جاسکتے ہیں۔

تاریخ	نفس مضمون و طریقۂ تعلیم	حاشیہ برائے مزید معلومات
۵۰	نقشے پر دوآبہ باری دکھاؤ۔ اس دوآبے میں کون کونسے اضلاع ہیں اضلاع گورداسپور، لاہور اور امرتسر کو کونسی نہر سیراب کرتی ہے (اپر باری دوآب) باقی کون کونسے اضلاع باقی رہ جاتے ہیں (منٹگمری، ملتان) ان دونوں اضلاع کی بارش اور نباتات کا حال نقشے کی مدد سے معلوم کرو۔ علاقہ گنجی بار کونسے اضلاع پر مشتمل ہے۔ بار کے معنی بتاؤ۔ گنجی بار کے معنی بتاؤ۔ اس علاقے کی پیداوار بڑھانے کے لئے کیا کیا وسائل اختیار کئے جاسکتے ہیں۔ اگر دریائے راوی میں سے ایک اور نہر نکالی جائے تو اس نہر میں پانی کہاں سے آئیگا اب انہار ثلاثہ کی اہمیت ظاہر کرو۔ (۵) لوئر باری دوآب کونسے مقام سے نکالی گئی ہے (کونسے	

	نفس مضمون و طریقہ تعلیم	تاریخ
	ضلع میں واقع ہے) ۱۹۱۳ء میں جاری ہوئی (کتنے سال ہوئے) منٹگمری کے علاقے کو سیراب کرتی ہے. کپاس پیدا ہوتی ہے) (ب) نہر اپر چناب ۱۹۱۲ء میں جاری ہوئی (کتنے سال ہوئے) دریائے چناب سے نکالی گئی (کونسے مقام سے (مرالہ ضلع سیالکوٹ) کس جگہ ختم ہوتی ہے (دریائے راوی میں بلوکی کے مقام پر گرتی ہے) اس نہر کے کھودنے کا بڑا مدعا یہ ہے کہ دریائے راوی میں پانی ڈالا جائے. تاکہ لوئر باری دوآب نہر میں منٹگمری کے علاقے کو سیراب کرنے کے لئے پانی پہونچ جائے۔ اس کے علاوہ یہ نہر ضلع گوجرانوالہ کو بھی سیراب کر رہی ہے۔ اپر (UPPER) اور لوئر (LOWER) انگریزی کے دو لفظ ہیں۔ اپر کے معنی ہیں اوپر کا اور لوئر کے معنی نچلا۔ چونکہ یہ نہر دریائے راوی کے اوپر کے حصے سے نکالی گئی ہے۔ اس لئے اس کا نام اپر باری دوآب اور جو نچلے حصے سے نکالی گئی ہے اس کا لوئر باری دوآب نام رکھا گیا ہے۔ اسی طرح اپر چناب۔ لوئر جہلم وغیرہ کے متعلق ذہن نشین کیا جائے۔ (ج) نہر اپر جہلم۔ یہ نہر دسمبر ۱۹۱۵ء میں جاری ہوئی (کتنے سال ہوئے) کونسے مقام سے نکالی گئی ہے (منگلا ریاست جموں) اس کا زائد پانی کہاں جاتا ہے (خانکی کے قریب دریائے چناب میں ڈالا گیا ہے) خانکی سے کونسی نہر نکالی گئی ہے (نہر لوئر چناب) اب چناب کا پانی بھی بچ گیا۔ اسے پھر اپر چناب کے ذریعہ دریائے	

حاشیہ برائے مزید معلومات	نفس مضمون و طریقۂ تعلیم	تاریخ
	میں ڈال کر منٹگمری کے ویران علاقے کو سیراب کیا گیا۔ (اپر جہلم، اپر چناب اور لوئر باری دوآب) ان تینوں نہروں کا نام "انہارِ ثلاثہ" ہے۔ انہار جمع ہے نہر کی اور ثلاثہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی تین کے ہیں۔ اس لئے انہار ثلاثہ سے مراد تین نہریں ہیں۔ ثلاثہ سے لفظ مثلث بنا ہے مثلث کے معنی تین کونوں والی شکل۔ اسی طرح ثالث وہ تیسرا آدمی جو دو آدمیوں کے درمیان میں لڑائی جھگڑے کا فیصلہ کرائے نوٹ۔ نمبر (۱) اس سبق میں مشرقی پنجاب اور بھارت کے نقشوں سے حسب ضرورت مدد لی جائے اور بھارتی علاقوں کے متعلق امور کا بھی ذکر ساتھ ساتھ کیا جائے۔ نوٹ نمبر (۲) سبق کے آخر میں طلبہ سے یہ تینوں نہریں انکے خاکوں میں پُر کرائی جائیں۔ نوٹ نمبر (۳) متعلقہ طریقۂ تعلیم مدرسین۔ پنجاب کی بارشیں پیداوار اور انہار کے علیحدہ علیحدہ نقشے ہوں گے، جو واقفیت لڑکوں سے اخذ کرانی ہو۔ وہ ان سے بذریعہ نقشہ اخذ کرائی جائے اخذ کراتے وقت نقشوں سے پوری پوری امداد لی جائے۔ جو باتیں بتانے کے قابل ہوں وہ خود بتا دی جائیں، تختہ سیاہ پر ایک خاکہ کھینچا جائے جس میں دوآبہ باری۔ رچنا اور چج نمایاں طور پر دکھائے جائیں۔ ضلع منٹگمری کو اس خاکے میں رنگ سے پورے طور پر ظاہر کیا جائے، جوں جوں کسی نہر کا حال پڑھایا جائے ساتھ ساتھ اس خاکے میں پُر کیا جائے۔	

ترقیِ زبانِ اُردو میں بنگال کا حصہ

(ابوالقاسم مدناپوری)

کچھ دنوں سے مشرقی پاکستان میں اردو کے خلاف ایک سیلاب سا امنڈ رہا ہے اور اس تند رو میں چھوٹے بڑے سبھی بہتے نظر آتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہاں بھی اہل بصیرت اور اہل احساس کا فقدان نہیں ہے، اردو کی ہمہ گیری اور قومی زندگی میں اس کی قطعیت کے پیش نظر بعض سنجیدہ حضرات مشرقی پاکستان میں اردو کی حمایت میں بہت کچھ کر رہے ہیں، اور ان نامساعد حالات میں جب اردو کی مخالفت میں اتنی شدت پیدا ہو چکی ہے۔ زیر نظر مضمون سید ابوالقاسم صاحب مدناپوری کا ہے، آپ کو اردو زبان و ادب سے گہرا لگاؤ ہے اور اپنی علمی و ادبی دلچسپیوں کے زیر اثر اور قومی اتحاد و ترقی کے لئے اردو کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے آپ نے یہ مضمون تحریر فرمایا ہے جو شہاب چٹاگانگ میں شائع ہو چکا ہے، ہم اسے معاصر عزیز کے شکریہ کے ساتھ دوبارہ شائع کر رہے ہیں، کیونکہ اس مضمون میں اس دور کا ایک مختصر سا خاکہ موجود ہے، جہاں نفرت کی گھن گرج سنائی نہیں دیتی تھی، ہر شخص نہایت دیانتداری سے اردو کی ترقی کو اپنا قومی فریضہ تصور کرتا تھا اور حسب استطاعت اس کی ترقی میں حصہ لیتا تھا۔ (ادارہ)

آپ کو ضرور تعجب ہو گا کہ بنگال کے باشندوں نے اردو ادب کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا، اور آج وہی بنگال والے اسے قومی زبان بنانے سے انکار کر رہے ہیں یہ بات صحیح ہے کہ بنگالیوں نے اردو کی ایسی خدمت کی ہے جو بھلائی نہیں جا سکتی۔ لیکن یہ اختلاف پھر کیوں پیدا ہوا۔ یہ آپ کو آنے والے اوراق بتائیں گے۔

آج بنگال دو حصوں میں منقسم ہو چکا ہے لیکن ادب کو اس حصے بخرے سے کوئی واسطہ نہیں، اس لئے یہ مضمون صرف مشرقی پاکستان تک محدود نہیں ہے۔ آئیے ذرا تاریخ کے پرانے ورق الٹیے اور بنگال کی اردو نوازی پر ایک طائرانہ نظر ڈالیے۔

بنگال میں پہلا مسلمان سپاہی بختیار خلجی کے روپ میں آیا، گویا باضابطہ اسلامی سلطنت کی ابتدا اسی دور سے شروع ہوئی۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پندرہویں صدی عیسوی تک بنگالی زبان ترقی یافتہ زبانوں میں نہ تھی، ہندو مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور مسلمان اور درویشوں کی علم دوستی، ادب نوازی اور لسانی رواداری کا نتیجہ ہے کہ بنگالی زبان والے اسقدر اہمیت حاصل کر چکے ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ منوجی کے دھرم شاستر کو دیسی پراکرت میں لکھنا نرکھ میں جانے کا کام سمجھا جاتا تھا حسین شاہ مرحوم نے انعام واکرام دیکر شاستروں اور رامائن کا ترجمہ پراکرت کرایا حسین شاہ کی سرپرستی اور لگاتار کوششوں نے ہندوؤں کو آخر کار اسطرف متوجہ کر دیا اور بنگالی کے پرچارک ہندو مذہب میں بہت سے پیدا ہو گئے۔

اس طرح ایک وقت وہ آگیا جب ہندو بنگالی ادب پر چھا گئے۔ لیکن مسلمانوں نے فارسی کو چھوڑا نہ تھا۔ اور اگرچہ بنگالی زبان پر ہندوؤں کا غلبہ تھا۔ پھر بھی مسلمانوں نے اسے اپنانے کی کوشش شروع کر دی، بارھویں صدی تک بنگالی ادب میں کوئی قابل ذکر مسلمان ادیب یا شاعر نہیں گذرا ہے، لیکن پندرہویں صدی میں جب مغربی بنگال میں بنگالی زبان کا پرچار ہو رہا تھا تو مشرقی بنگال میں بے شمار اہل باطن اور فقراء تبلیغ کا فریضہ خاموشی کے ساتھ

کر رہے تھے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان صوفیائے کرام اور علمائے دین نے عربی فارسی کی ملی جلی ایک نئی زبان کی بنیاد رکھ دی، جس کی زمین سنسکرت کی تھی، جڑ پراکرت کی تنا اور شاخیں عربی اور فارسی کی، ذرا مشرقی بنگال کے نقشے پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ بل کھاتے ہوئے دریا، ان کے کنارے سدا بہار ہریالی سے گھرے سیدھے سادھے کسانوں کے گھر اور ان کے پیچھے دھان رائی اور سرسوں کے مہکتے ہوئے کھیت، بےحس سے بےحس دل کو راگ الاپنے پر مجبور کرتے ہیں، بھرآئے ہوئے یا نکے سپاہی۔ مذہب سے سرشار صوفی، جوش عقیدت سے بھرے مبلغ منبر سے اُتر کر گاؤں کی پگڈنڈیوں پر جانے والے علما بھی لہرائے اور مشرقی بنگال پر چھا گئے اور ایسے چھا گئے جیسے دربن کے مانند پدمائیں خوبصورت اپسرا آکاش کی کمان کھینچ کر بر کھاکے تیر چلائے اور من موہنی روپ سے سب کو رجھائے، مشرقی بنگال کا گاؤں گاؤں اسی بھاشا سے گونج اٹھا۔ اور اسے پوتھی یا مسلمانی بنگالی کا نام ملا۔ یہ بنگالی تھی عربی فارسی سے ملی جلی۔ اور عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی، یہ پوتھی ساہتیہ (کتابی ادب) وقت کا ایک شاہکار تھا۔ اب میں بنگال کے ان شاعروں کے نام بتانا چاہتا ہوں جنھوں نے ادبی زبان کا سنگ بنیاد رکھا۔

سید سلطان اس ملی جلی زبان کے پہلے شاعر ہیں جن کی کتاب (وفات رسولؐ) آج تک مشہور ہے، مجھے افسوس ہے کہ یہ کتاب یہاں نہیں مل سکی ورنہ آپ کے سامنے اس کا کچھ نمونہ پیش کرتا۔ پھر شیخ فیض اللہ کا زمانہ آتا ہے۔ ایرانی تصوف اور وحدانیت کی جھلک "گورکھ وجے" میں نظر آتی ہے۔ فتح آباد (چاٹ گام) کے مشہور شاعر شاہ الاؤل نے ملک محمد جائسی کی مشہور کتاب پدماوت کا ترجمہ "پدماوتی" کے نام سے کیا ہے نظامی گنجوی کی کتاب ہفت پیکر کا ترجمہ قصہ سیف الملوک۔ بدیع الجمال اور تحفہ بھی آپ ہی کے شہ پارے ہیں اور ایک نظم "چندرانی" بھی ہے، یہ ساری کتابیں آپ کو عربی رسم الخط میں ملیں گی۔

بہرام خان اور قاضی دولت سترہویں صدی کے مشہور مصنف ہیں۔ ان کی کتاب "لیلے مجنوں" بہت مشہور ہے، عبدالحکیم کی "یوسف زلیخا"۔ نصراللہ خاں کا "جنگ نامہ" یہ حفیظ الدین احمد کی "الف لیلیٰ"، محمد دانش کا قصہ "چہار درویش"، تاج الدین احمد کی "قصص الانبیاء"، محمد خاطر کا "شاہنامہ" محمد خان کا "مقتول حسین"۔ یعقوب میاں کا "جنگ نامہ" ادب کے ایسے جواہر پارے ہیں جن کو ہم بھلا نہیں سکتے۔

اس کے علاوہ مولوی افسر علی کی "جنگ علی"، منصور ربانی کا "دیوان مدینہ" عبدالنبی کی "داستان امیر حمزہ" حد درجہ ہر دلعزیز کتابیں ہیں اور رومن رولاں جیسے مفکرنے بھی ان کی تعریف کی ہے۔

بنگالی زبان پراکرت سے نکل کر فارسی اور عربی کی گود میں پرورش پا رہی تھی کہ اسلامی حکومت کا آفتاب اقبال ڈھلنے لگا۔ بنگال پر انگریز چھانے لگے۔ مسلمانوں نے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے ان کا مقابلہ کیا۔ اس لئے انگریزوں نے ہندؤں سے ناتا جوڑا۔ اور مسلمانوں کو کچل دینے کی پوری کوشش شروع کر دی، انگریزوں کو مسلمانوں سے بہت بڑا خطرہ تھا، ادھر مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ ہم جلد ہی اپنی آزادی دوبارہ حاصل کریں گے، اس لئے جنگ جاری رہی، اسی حالت میں ایک صدی گذر گئی، فارسی بھی پس پشت ڈال دی گئی، "پوتھی ساہتیہ" کی تحریک دبا دی گئی۔ اور سنسکرت ملی ہوئی بنگالی فورٹ ولیم کالج والوں کے زیر اثر پرورش پانے لگی، راجہ رام موہن رائے ودیا ساگر اور بنکم چندر چٹر جی اور ٹیگور نے سنسکرتی بنگالی کو زندہ کیا۔

لیکن یہ سنسکرت آمیز بنگالی عوام میں مقبول نہیں ہوئی، ظاہر ہے کہ یہ زبان عوام کی زندگی سے دور تھی، اس لئے ایک محدود متوسط طبقہ سے باہر مقبول نہ ہو سکی، ضرورت تھی کہ "پوتھی ساہتیہ" تحریک کی تجدید کی جائے، اس تاریخی ضرورت کو قاضی نذرالاسلام اور ان کے اسکول کے شعراء نے پورا کیا، قاضی نذرالاسلام کی بہت سی نظمیں خالص

اردو میں لکھی گئی ہیں، صرف رسم الخط بنگالی ہے، اس کے علاوہ ان کی زبان میں ایسے فارسی عربی الفاظ بکثرت موجود ہیں جن سے بنگالی عوام کو مذہبی اور ادبی موانست حاصل تھی۔ قاضی نذر الاسلام کی اس انقلابی تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگالی شعرا کی ایک پوری نسل نے ان کے اتباع میں اس مقبول عام بنگالی زبان کو شاعری میں استعمال کیا، چنانچہ جسیم الدین، غلام مصطفےٰ مرتضےٰ حسین اور محفوظہ خانم اسی اسکول سے تعلق رکھتے تھے، اس طرح نذرل اسکول نے بنگالی ادب کی زبان کو دوبارہ اس سطح مقبول پر پہونچا دیا، جہاں سے فورٹ ولیم کی تحریک نے اسے ہٹا دیا تھا۔

یہ تو ہوا بنگالی زبان پر اردو کا اثر۔ اس کے ساتھ خود اردو زبان اور ادب نے خالصتہً بنگال میں کافی ترقی حاصل کی، چنانچہ قرآن شریف کا پہلا اردو ترجمہ بنگال میں چھپا، انجیل کا اردو ایڈیشن بھی بنگال سے نکلا، اور بنگال سے متعدد کتابیں اکثر اردو میں شائع ہوتی رہی ہیں، ہمیں ڈھاکے کی تاریخ بتاتی ہے کہ کبھی یہ عمارت بھی عظیم تھی، مرشدآباد کے در و دیوار پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اردو کو خون پسینے سے سینچنے میں ہم نے بھی حصہ لیا ہے اور ہم کو فخر ہے کہ اردو کے بہت سے مایہ ناز شاعر ہماری سرزمین سے اٹھے اور مشہور ہوئے۔ سرزمین مدناپور بھی اردو کی آبیاری کی مدعی ہے۔ بنگال کے دیہاتوں سے لے کر شہر تک مکتبوں کا جال پھیلا ہوا ہے ان مکتبوں میں مذہبی تعلیم اردو ہی میں دی جاتی ہے اور دیوبند۔ سرائے میر۔ مدرسہ شاہی۔ ندوۃ العلماء اور فرنگی محل میں تعلیم حاصل کرنے والے اردو ہی میں تعلیم حاصل کر کے سارے بنگال میں پھیل جاتے ہیں، بنگال کے معزز خاندانوں میں اکثر شعرا گذرے ہیں۔ بعض تو صاحب دیوان بھی ہیں، مثلاً مرزا جان تپش۔ احمد بیگ تپش۔ غلام حسین تپش، فرزان علی بے خود، عبداللہ جنون۔ استاد منیم عبداللہ آشفتہ، حکیم نصرت علی مست، خواجہ عبدالغفار اختر، حافظ رشید الٰہی۔ واجد منعم تخلص مقرا ارمان۔ عبدالرحیم تمنا۔ خواجہ فیض الدین اور شائق۔ عبدالغفور نساخ کے شاگرد

شمس ایڈیٹر مشہور

آج بھی بنگال کا نام لندنے ہیں، آپ کے شاگرد حضرت رضا علی صاحب وحشت نے
عبیدی کے نام نامی کو روشن کر دیا ہے، معین الرسول شمشاد حضرت شمس کے ہمعصر تھے، مولانا عبید اللہ
بھی ان کا نمونہ کلام سے کون واقف نہیں ہے، آپ متبحر عالم بھی تھے اور لطیف طبع شاعر
اسرائیل ستل ... کلام ہم کسی دوسرے موقع پر پیش کریں گے، مولوی غلام رسول تحسین، مولوی
ادب کے ایسے ل تخلص بہ طین، یہ صاحبان بھی بنگال کے نامور شعرا میں ہیں، ہمیں یہ کہتے ہوئے
خوشی ہوتی ہے کہ بنگال میں طبقہ نسواں نے بھی فن شاعری میں نمایاں حصہ لیا ہے جن میں
سے چند کے نام ہم پیش کرتے ہیں، سیدہ بیگم محجوب، ضمیر النسا بیگم حجاب، شمس النہار بیگم محمودہ
زہرہ بیگم حیا، مہر تسکین بیگم نہال، مہ جبیں بیگم خمار وغیرہ۔ ان خواتین میں بعض صاحب دیوان ہیں
مہ جبیں خمار صاحبہ جن کی غزلیں اکثر بلند پایہ رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں صاحب دیوان
ہیں، حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت جگر مرادآبادی اور حضرت احسان دانش، حضرت ساغر نظامی
نے اپنی باوقعت رائے کا اظہار خمار صاحبہ کے کلام پر بہترین الفاظ میں کیا ہے۔

نثر نویسی میں بھی بنگال کی خواتین نے بیش از بیش حصہ لیا ہے، محترمہ اختر بانو سہروردی
کی "آئینہ عبرت" کورس تک میں داخل ہے، میلاد کی کتاب "کوکب دری" بھی ان کی تصنیف ہے
محمودہ بیگم کا ناول "روشنک بیگم" اور راحت آرا بیگم کے افسانوں کا مجموعہ "پریمی" کے نام سے شائع
جمیلہ بیگم کا ناول "فیروزہ" بہت مشہور ہے، شائستہ اختر سہروردی یعنی بیگم اکرام اللہ اردو میں پی ایچ
ڈی ہیں، غرض بنگال کی سرزمین ہی کچھ علم نواز واقع ہوئی ہے، دیکھیں خدا ہماری امیدوں کو کب
بار آور فرمائے اور ہماری نئی پود زبان اردو کو کس قدر جلد اپنا کر صاحب طرز و انشا پرداز بنتی ہے،

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

انگلستان کی وزارتِ معارف کی سالانہ رپورٹ

پچھلے ہفتے وزارت معارف کی تعلیمی رپورٹ سنہ ۱۹۵۱ء شائع ہوئی۔ اس کے بروقت شائع ہونے پر وزارت مستحق مبارکباد ہے، ہم اس شمارے میں نیز اگلے شمارے میں اس رپورٹ کی تفصیلات کا مجمل خاکہ پیش کریں گے۔

سنہ ۱۹۵۱ء میں ۲۷۰ ابتدائی اور ۴۷ ثانوی مدارس کی تعمیر مکمل ہوئی اور انہیں تعلیم و تدریس کے کام میں لایا گیا۔ سال کے اختتام پر ۵۰۲ ابتدائی اور ۲۷۶ ثانوی مدارس زیر تعمیر تھے۔ جن میں سے ۹۰ ابتدائی اور ۲۰ ثانوی مدارس میں اتنی توسیع ہو چکی تھی کہ انہیں بآسانی تعلیمی مصرف میں لایا جا سکتا تھا۔ اس رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس سال کے آغاز میں ہی مابعد جنگ کے ابتدائی سالوں کی دشواریاں رفتہ رفتہ ختم ہو رہی تھیں اور تعلیم کے تعمیری کاموں میں فی الواقع ایک نئی تحریک کارفرما نظر آتی ہے۔ انتظامی تعلیمی اور تکنیکل اسٹاف میں تعاون اور ان کے کاروبار میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ منصوبوں اور نقشوں کا معیار سب سے بہتر ہے اور روپیہ کی اقدار کا صحیح مصرف بھی حاصل ہو رہا ہے۔ مدرسوں کی تعمیر کے لئے ضروری سامان کی فراہمی میں پہلے سے زیادہ آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں اور جن مقامات پر مدرسوں کی عمارتوں کے بننے کا اہتمام ہے سامان تعمیر تیزی سے جمع کیا جا رہا ہے۔ پچھلے سال تعمیری کاموں

میں بہت سی رکاوٹیں پیدا ہوگئی تھیں اور موسم خزاں میں تو فولاد کی اتنی کمی ہوگئی تھی کہ صنعتِ تعمیرات بجائے خود ایک بارگراں معلوم ہو رہی تھی، اس کمی کے پیش نظر سارے تعلیمی تعمیری منصوبوں کو دسمبر کے شروع سے ہی تین ماہ کے لئے ملتوی کرنا پڑا، بہر صورت اس سال تقریباً ۷ کروڑ پونڈ لاگت کا نیا کام شروع کیا گیا ہے، جس میں سے ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ کا کام مکمل ہو چکا ہے اور سال کے اختتام پر تقریباً ۱۱ کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ کی لاگت کی عمارتیں زیر تعمیر تھیں ۱۹۵۰ء میں اس کے مقابل اعداد و شمار یہ تھے ۴ کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ، ۱۳ کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ اور ۸ کروڑ ۶۰ لاکھ پونڈ۔

ابتدائی مدارس کے لئے ہر مقام کے زیادہ سے زیادہ سالانہ اخراجات ۱۴۰ پونڈ ہوتے ہیں اور ثانوی مدارس کے ۲۴۰ پونڈ۔ یعنی پچھلے سال کے اخراجات میں ۱۲ ½ فیصدی کی تخفیف ہوئی اور باوجود تعمیری اخراجات میں ۲۲ فیصدی اضافے کے اس تخفیف کو قائم رکھا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو مدارس ۱۹۵۰ء میں شروع کئے گئے تھے وہ ۱۹۴۹ء کے مدارس کی نسبت ۴۰ فیصدی کم اخراجات میں بھی آپ اپنے کفیل ہو گئے، انہیں بنیادوں پر جو مدارس ۱۹۵۱ء میں شروع ہوئے ہیں انہیں ۱۹۳۰ء تک قائم ہونیوالے مدارس کے مقابلے میں بھی کم اخراجات کے اصولوں پر استوار کیا جا رہا ہے۔

جماعتوں میں طلبہ کی تعداد

۱۹۵۰ء میں سرکاری اور امدادی مدارس کے ابتدائی اور ثانوی مدارج میں طلبہ کی تعداد زیادہ تھی اس لئے درسی جماعتوں میں طلبہ کی اچھی خاصی بھیڑ رہتی تھی اور ایسی جماعتوں میں پڑھنے والے طلبہ ۴۸ فیصدی تھے، لیکن جنوری ۱۹۵۱ء میں یہی تعداد ۵۴٫۹ فیصدی رہ گئی اس طرح اساتذہ کی تعداد میں اضافہ اور مدرسوں کے لئے نئی عمارتوں کی تعمیر نے طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کا ساتھ دیا، مگر موجودہ حالات میں اس قسم کی ترقی و توسیع کی توقع اگلے چند سالوں میں نہیں کی جا سکتی، کیونکہ گمان غالب یہ ہے کہ اس اثنا میں اساتذہ

(خواتین) کی تعداد مجوزہ ابتدائی مدارس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء میں طلبہ کی تعداد کا تناسب فی معلم (ہمہ وقتی) ۲۷،۶ تھا اور جنوری سنہ ۱۹۵۲ء میں یہی تناسب ۲۷،۱ تھا، ایسے مدارس کا فیصدی تناسب ۱۴،۴ سے ۱۱،۹ ہوگیا ہے جن کے اسٹاف کا تناسب ۲۵ یا اس سے کچھ اوپر تھا، اور ایسی ادنیٰ اور بچوں کی جماعتیں جن میں طلبہ کی تعداد ۴۰ سے زیادہ تھی ان کی تعداد ۴۲،۲۰۷ سے گر کر ۳۶،۶۶۲ رہ گئی ہے، اعلیٰ جماعتوں میں جہاں طلبہ کی تعداد ۳۰ سے زیادہ تھی ان کے تناسب میں قدرے اضافہ ہوگیا ہے اور وہ ۷۶۳،۴۴،۳ سے بڑھ کر ۲،۴۴،۲۱۴ ہوگئی ہے۔ اور ایسی جماعتیں جن میں طلبہ کی تعداد ۵۰ سے زیادہ تھی ۱۵۵۷ سے ۱۱۲۳ رہ گئی ہے۔

مدرسین جنوری سنہ ۱۹۵۱ء میں ابتدائی اور ثانوی مدارس میں طلبہ کی تعداد ۶۲۴،۹۹،۵۰،۶ ہوگئی یعنی پچھلے سال کی نسبت ۴۳،۵۶۸ طلبہ کا اور اضافہ ہوگیا، جنوری سنہ ۱۹۵۲ء تک مدرسین کی تعداد کا تخمینہ ۲،۲۱،۲۵۰ تھا۔ اس طرح مدرسین کی تعداد میں کم و بیش ۵۰۰۰ کا اضافہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑھتی ہوئی تعداد آنے والے سالوں میں قائم نہیں رکھی جا سکےگی اس لئے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ ہر مقامی تعلیمی اتھارٹی کے لئے اساتذہ (خواتین) کی تعداد مخصوص کردی جائے، حالانکہ اس سال موجودہ اساتذہ کی تعداد کی تقسیم زیادہ موزوں اور مناسب رہی ہے۔ پھر بھی انگلستان اور ویلز کی ۱/۲ مقامی تعلیمی اتھارٹی اکتوبر تک خالی آسامیوں پر حسب ضرورت اساتذہ (خواتین) کو مامور نہ کرسکیں اور ۱۳ مقامی تعلیمی اتھارٹیز کا تناسب تو ان سے بھی ۵ فیصدی یا اس سے بھی کم تھا، وزارت معارف نے اس کمی کو پورا کرنے کی خاطر مقامی تعلیمی اتھارٹیز کی توجہ مدرسین (رجال) کی تقرری کی جانب منعطف کرائی اور شادی شدہ مدرسین (رجال) نیز وہ جو اپنے گھروں سے باہر نہیں جانا چاہتے، ان سب کو ملازم رکھنے کی ہدایت دی ہے۔

برن ہم کمیٹی

پچھلے پیر کو التوا کے بعد لندن میں برن ہم کمیٹی کا دوبارہ انعقاد ہوا۔
اس زمانۂ التوا میں مختلف ذیلی کمیٹیوں نے اپنی دستوری مجلسوں سے ان سفارشات کے متعلق مشورہ لیا جنہیں وہ وزیر معارف کے سامنے پیش کرنا چاہتی تھیں، اس کمیٹی نے اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ وزیر معارف سے یہ سفارش کی جائے کہ یکم جولائی سے پہلے برن ہم رپورٹ کے متعینہ مشاہروں میں مردوں کی تنخواہوں میں ۴۰ پونڈ اور خواتین کی تنخواہ میں ۳۲ پونڈ سالانہ کا اضافہ کیا جائے۔ اسی دن برن ہم ٹکنیکل کمیٹی نے بھی اسی قسم کی سفارشات کیں۔ زراعتی انسٹی ٹیوٹ کے اسٹاف کی تنخواہ میں اضافہ کرنے والی کمیٹی نے بھی یہی سفارشات کیں۔ وزیر معارف کی منظوری کے بعد یکم جولائی سے ان تمام اساتذہ کی تنخواہوں میں متذکرہ بالا اضافہ ہو جائے گا جن کی تنخواہیں ان تینوں رپورٹوں میں متعین کر دی گئی ہیں۔

ان سفارشات کے سلسلے میں جو گفت و شنید جاری رہی اس میں کافی وقت صرف ہوا، اس سے لوگوں کے دلوں میں کچھ شکوک بھی پیدا ہو چکے تھے، کیا آج بھی برن ہم کمیٹی اساتذہ کی تنخواہوں کے تعین میں ایک موثر آلۂ کار کی حیثیت رکھتی ہے، ان جملہ سفارشات کے لئے جو متفقہ آواز ہر گوشے سے اٹھی ہے اور جو متفقہ امداد اسے نصیب ہوئی ہے اس سے اس کے اثرات کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ برن ہم کمیٹی نے ایک مرتبہ پھر یہ ثابت کر دکھایا کہ مقامی تعلیمی اتھارٹی اور اساتذہ مل جل کر تنخواہ جیسے مشکل اور پیچیدہ مسئلے کو حل کر سکتے ہیں، اس مقام پر زیادہ وقت صرف ہونے کے متعلق بھی زیادہ غلطی نہیں برتنی چاہیئے۔ یہ درست ہے کہ اساتذہ نے سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۵۰ء میں یہ مطالبہ کیا تھا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ مقامی تعلیمی اتھارٹی کی متعلقہ کمیٹی نے اس وقت اس مطالبے کو مسترد کر دیا تھا، موجودہ بحث و تمحیص کا آغاز جنوری ۱۹۵۱ء سے ہوا، اور اس مسئلے کو کامیابی کے ساتھ حل کرنے میں افہام و تفہیم اور آپس کی گفت و شنید میں ۵ مہینے صرف ہوئے۔ اسے

کامیاب کہنے ہیں۔ میں اپنے اعتماد و ایقان کا اظہار کر رہا ہوں، مجھے یقین ہے کہ جب یہ سفارشات وزیر تک پہونچیں گی تو وہ اسے منظور فرما کے اس کے نفاذ کا حکم جاری کر دیں گی۔ ان سطور کے لکھنے کے وقت وزیر کے فیصلہ کا ہنوز انتظار کیا جا رہا ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے پیش رو کی روایات سے انحراف نہیں کریں گی، اور برن ہم کمیٹی کی رپورٹ کو منظور کرنے میں انہیں کوئی تامل نہ ہوگا۔

ان دنوں برن ہم کے مسائل میں جس نیک نیتی، خلوص اور فہم و فراست کا اظہار کیا جا رہا ہے اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اساتذہ کے مشاہرے کے مسئلے کا کوئی معقول اور قابل قبول حل تلاش کیا جا سکے گا، موجودہ سفارشات کے حصول میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ برن ہم کے مسائل میں نیک نیتی اور خیر سگالی کے ساتھ ساتھ ہوش و خرد کا عنصر بھی غالب رہا اور جیسا کہ بالعموم اور دوسرے مسائل میں بھی بہت سے لوگ میدان کے باہر کھڑے ہوئے کھلاڑیوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیئے اور کس طرح کرنا چاہیئے، اس میں اور اس قسم کے دوسرے معاملات میں بھی غالباً کھلاڑی ہی کھیل کی پیچیدگیوں اور اس کے مشکل مقامات کو میدان سے باہر کھڑے ہوئے ہدایت کاروں سے کہیں زیادہ سمجھتے ہیں اور یہ تو ایک یقینی امر ہے کہ اگر ان سب کے مشوروں کی جانب توجہ کی جائے۔ تو کھلاڑیوں میں وہ ذوق و شوق اور وہ سوجھ بوجھ باقی نہیں رہ جاتی۔

اس کامیابی پر مسٹر گولڈ اور مسٹر ہیرلڈ مستحق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے یہ دکھا دیا کہ برن ہم کمیٹی آپس کی گفت و شنید سے اپنے مسائل کا حل تلاش کر سکتی ہے۔

امیل
یا
رُوسو کی تعلیم

مسلسل ۱۴

اساتذہ! اس ریاکاری اور ظاہرداری کو خیرباد کہئے۔ آپ خود بھلے مانس اور محسن بنئے۔ اور اپنے ذاتی اعمال و محاسن کا بچوں پر ایسا اثر ڈالئے کہ بڑے ہونے پر بھی وہ ان کے دل پر پتھر کی لکیر رہیں، شاگرد سے داد و دہش کی خواہش کرنے کی بجائے اس کام کی انجام دہی کا فخر اس کی موجودگی یہ بندہ خود ہی حاصل کرے گا اور چونکہ یہ اعزاز اس کی عمر کے لحاظ سے اس کے لئے بہت بالاتر ہے۔ اس لئے میں اپنے اعمال کی نقل تک کے ذرائع¹ سے اس کو محروم رکھوں گا، کیونکہ خیال رکھنے کی اہم ترین چیز یہ ہے کہ بڑوں کے فرائض کو بچہ محض بچوں کے فرائض یا ذمہ داریوں کے مانند ہرگز خیال نہ کرنے پائے، غربا اور مساکین کی خدمت اور اعانت کرتے وقت اگر وہ اس کے متعلق مجھ سے کوئی سوال کر بیٹھے تو میں پہلے تو یہ دیکھونگا کہ اس سوال کے جواب کا وقت بھی آگیا ہے یا نہیں، پھر میں اس سے کہوں گا۔ "میری جان غربا کی محض نیک نیتی اور ساکھ پر ہی امراء اور رؤسا کے وجود کا انحصار ہے، پس اس لئے ان

---

¹ یہ خوب یاد رکھئے کہ میں اس کے سوال کا جواب جب وہ چاہے گا اسوقت نہ دوں گا، کیونکہ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میں اس کی مرضی کا تابع بن جاؤں گا اور اسقدر خطرناک اور مہلک محتاجی کی حالت میں جا پھنسوں گا کہ جس میں کوئی استاد کبھی نہ پھنسا ہوگا۔

لوگوں کو روزی پہونچانے کا ان امراء وغیرہ نے وعدہ کر رکھا ہے، جن کے پاس کھانے کو کافی نہیں ہے، یہ روزی چاہے کلیتہً خیرات کے ذریعہ پہونچائیں چاہے ان سے مزدوری اور محنت لیکر اجرت کی شکل میں پہونچائیں" بچہ دریافت کرے گا۔ "تو پھر کیا آپ نے بھی کوئی ایسا عہدو پیمان کیا ہے"۔ استاد بیان کرے گا " اس میں کیا شک ہے، مجھے بھی یہ دولت اسی عہدو پیمان پر حاصل ہوئی ہے جو اس کی ملکیت سے وابستہ ہیں"۔

مندرجہ بالا گفتگو کے ذریعہ یہ تو معلوم ہو گیا کہ اس معاملہ کو بچے کے ذہن نشین کسطرح کرانا چاہیئے۔ اس گفتگو کے بعد اسمٰعیل کے سوا ہر دوسرے بچے کو میری نقل اور میری طرح عمل کرنے کی ترغیب ہونا لازمی ہے، اندریں حالات میں کم از کم اتنی احتیاط ضرور برتوں گا کہ بچے کے افعال ریاکاری سے پاک اور ظاہر داری سے آزاد ہوں۔ اور یہ میری دلی تمنا ہوگی کہ چاہے وہ مجھکو میرے مراعات سے محروم ہی کرتا ہو لیکن وہ داد و دہش مجھ سے بھی چھپا کرہی کیا کرے، حسب اقتضاء عمر بس یہ بھی ایک فریب ہوگا جس کو میں معاف کر سکوں گا۔

میں جانتا ہوں کہ یہ تمام نقلی نیکیاں محض بندر کی سی نیکیاں ہوتی ہیں۔ اخلاقاً نیک کام جب ہی اچھا ہوتا ہے، جب اس کو اس کی ہی خاطر کیا جائے کسی اور خاطر نہیں، لیکن آپ ہیں کہ بچوں سے اس عمر میں جبکہ ان میں کوئی احساس اب تک پیدا نہیں ہوتا ان افعال کا عادی بنانے کے لئے اُن کی نقل کراتے ہیں، تاکہ وہ جان بوجھ کر نیکی کی خاطر ان افعال کے مرتکب ہونے لگیں، جانوروں کی طرح آدمی بھی نقل کرتا ہے، قدرت نے جب نقال بڑی خوبی سے منظم کی ہے۔ بندر انسان کی نقل اس لئے کرتا ہے کہ اُس سے وہ ڈرتا ہے اور جانوروں کی نقل نہیں کرتا ہے کیونکہ ان سے وہ نفرت کرتا ہے۔ یا ان کو حقیر خیال کرتا ہے بندر کو یہ گمان غالب ہوتا ہے کہ اس سے برتر جو کام کرتا ہے وہ اعلیٰ ہی ہوتا ہے۔ ہمارے مسخرے بھائیوں کا یہ خیال ہے کہ وہ ہر اچھی چیز کی نقل محض اس کو حقیر کرنے کے لئے کر

ہیں اور اس چیز کا مذاق اڑاتے ہیں، اپنے آقا اور افسر کی ذلیل اور رکیک باتوں سے واقف رہنے کے باوجود اس کو وہ شریف تر لوگوں کا ہم پلہ اور سادی ٹھہراتے ہیں۔ یا ان کی پسندیدہ باتوں کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی بد علاقی ان کے انتخاب نقل سے ہی خود ظاہر ہو جاتی ہے، وہ لوگوں کو دھوکہ دیکر اپنی ذہانت اور فراست کی داد کے خواہاں ہوتے ہیں۔ لیکن عقلمند اور اعلیٰ آدمی نہیں بننا چاہتے، اپنی شخصیت اور اصلیت سے علیحدہ رہنے کی خواہش فی الحقیقت نقالی کی جڑ ہوتی ہے، اگر میں اپنی ذمہ داریوں کو کامیابی کے ساتھ پورا کر سکا تو کم از کم اسمٰعیل میں تو ایسی خواہش قطعاً کبھی پیدا نہ ہو گی، پس ہر ایسی ظاہری یا نمائشی خوبی سے جو اس میں پیدا ہوتی نظر آئے ہمیں منہ موڑ لینا چاہیئے۔

اولین اخلاقی تعلیم۔ تقویٰ و پرہیز گاری اپنی تعلیم اور اس کے اصول و قواعد کی آپ ذرا تنقیح فرمائیں تو آپ بالخصوص نیک خصلتی اور اخلاقیات کے متعلق ان کو بالکل الٹ پلٹ ہی پائیں گے، بچے کے لئے موزوں ترین اخلاقی سبق جو عمر کی ہر نوبت کے لئے اہم ترین ہے محض ایک ہی ہے "کبھی کسی کو ضرر یا زیاں نہ پہونچاؤ"، عمل صالح کے قواعد اور اصول بھی اگر اس اصول کے از خود تابع نہ ہوں تو وہ بھی مہلک غلط اور متضاد ہوں گے، ایسا کون شخص ہوگا جو کبھی عمل صالح کا مرتکب ہی نہ ہوا ہو؟ ہر شخص حتیٰ کہ بدمعاش بھی نیک معاش اور خدا ترس آدمی کے مانند تھوڑا بہت نیک کام ضرور کرتا ہے۔ وہ سیکڑوں ہزاروں کو مصیبت اور مشقت میں ڈال کر کسی ایک شخص کو ضرور خوش کرتا ہے۔ اور اس سے ہی ہماری ساری بدنصیبیوں اور مصیبتوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ اعلیٰ ترین بھلائیاں تقویٰ اور پرہیزگاری میں پنہاں ہوتی ہیں اور یہ بھی سب سے زیادہ کٹھن ہے اس لئے کہ وہ نمائشی نہیں ہوتیں اور اس حظِ نفس کے لئے بھی گنجائش نہیں چھوڑتیں جو انسان کو اسی تصور کے باعث عزیز ترین لطف بخشتا ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ ہم سے خوش اور راضی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے کسی پڑوسی کو کبھی کوئی نقصان یا زیان نہ پہونچائے تو اس کی یہ کارگذاری کس قدر زبردست

نیک اعمالی میں شامل ہوگی! اس کو کس قدر شیر دل اور مضبوط طبیعت بننے کی ضرورت ہوگی؟ اس اصول کے متعلق ہیں زبانی جمع خرچ میں اس کی اتنی عظمت اور دشواری نظر نہیں آتی بلکہ عملی کوشش میں نظر آتی ہے ؎۱

اس سے آپ کو تھوڑا بہت ان تدابیر کا اندازہ ہو جائے گا جو میں چاہتا ہوں کہ آپ بچوں کی تربیت و تعلیم کے وقت کام میں لائیں۔ خود اپنی ذات کو یا دوسروں کو خدشے میں ڈالنے یا ایسی بری عادتیں پیدا کر دینے کے خطرۂ عظیم جو مابعد دور نہ ہو سکیں۔ ان ہدایتوں سے کبھی پہلو تہی یا غفلت نہیں برتی جا سکتی، لیکن بہ یقین جانئے کہ جو بچے صحیح اور درست تربیت پا جاتے ہیں ان کے لئے ایسی ضرورتیں پیدا ہی نہیں ہوتیں، کیونکہ سرکش، کینہ پرور، جھوٹا، دغاباز اور لالچی ان کا اس وقت تک بننا ناممکن ہوتا ہے جب تک کہ پہلے ہی ان برائیوں کا انکے دل میں بیج نہ بو دیا گیا ہو۔ محض استثنائی شکلیں ہی کُلیے کو ثابت کرتی ہیں۔ پس جب کبھی بھی بچہ اپنی حقیقی اور موزوں جگہ سے علیحدہ ہو کر دوسرے لوگوں کی برائیاں حاصل کرنے کا موقع پاتا ہے اسی وقت یہ استثنائی صورت پیدا ہو جاتی ہے، جلوت میں تربیت

؎۱ یہ حکیمانہ قول کہ "کبھی کسی کو زیاں نہ پہونچاؤ"، انسانی سماج کی عظیم ترین ممکنہ آزادی کی ضمانت ہے، کیونکہ سماجی حکومت میں ایک کی بھلائی دوسرے آدمی کی برائی کی دلیل ہوتی ہے۔ اور یہ رشتہ مادی اشیاء کی فطرت کا ایک جزو ہے جو اٹل اور لابدی ہے، آپ اس کسوٹی پر سماجی انسان اور ایک راہب کو جانچ کر معلوم فرمائیں کہ ان میں کون بہتر ہے، ایک مشہور مصنف کا قول ہے :۔ بدمعاش کے سوا کوئی اور شخص تنہا نہیں رہ سکتا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ بھلے مانس کے سوا کوئی اور تنہا نہیں رہ سکتا،" اور گو میری یہ تجویز زیادہ معقول اصولوں پر مبنی نہ ہو لیکن تجویز بالا کے مقابلہ میں حقیقی اور مدلل ضرور ہے، اگر بدمعاش اکیلا ہوگا تو وہ برائی ہی کیا کر سکیگا ؛ وہ تو اپنے ساتھیوں ہی میں اپنا جال بچھا کر دوسروں کو پھانستا ہے، اور اگر یہ لوگ اس دلیل کو صاحب جائداد اشخاص سے متعلق کرتے ہیں تو میرا جواب اسی فقرے میں موجود ہے جس کا کہ یہ نوٹ لکھا گیا ہے۔

...ے خلوت میں تعلیم پانے والوں کی نسبت زیادہ قبل از وقت تعلیم یافتہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ... کی تعلیم کو بچپن کے دور کو پختہ کرنے کے سوا اور کچھ بھی نہ کرے زیادہ مرجح ہو گی۔

مستثنیات کی بالکل ایک دوسری قسم بھی ہوتی ہے، یعنی بعض بچے قدرتاً اسقدر ذہین ہوتے ہیں کہ اپنے ہم عمروں سے بہت آگے بڑھ جاتے ہیں، پس جس طرح ایسے لوگ موجود ہیں جو بچپن کے باہر ہی نہیں ہوتے، اسی طرح ایسے بھی لوگ موجود ہیں جو کبھی بچے ہی نہ تھے ایسے لوگ پیدائش ہی سے پورے آدمی ہوتے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ ایسی مثالیں الشاذ کالعدم ہوتی ہیں، اس لئے ان کی تمیز بیحد دشوار ہوتی ہے، حالانکہ ہر ماں جو یہ جانتی ہو کہ کوئی بچہ غیر معمولی طور پر ذہین بھی ہوتا ہے۔ وہ یہی یقین رکھتی ہے کہ اس کا بچہ ہی وہ بچہ ہے۔ بلکہ وہ اس سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔ اور بالیدگی کی معمولی نشانیوں کو بھی استثنائی قابلیت کی علامتیں خیال کرنے لگتی ہے۔ پھرتی، تیز گفتاری، اچھلنا کودنا اور دلاویز سادگی اس عمر کی خاص نشانیاں ہوتی ہیں، جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ بچہ درحقیقت ابھی بچہ ہی ہے، جن بچے کو زیادہ باتیں کرنے کی ترغیب اور ہر بات کہنے کی اجازت ہو اور جس پر حکایات یا روایات کی کوئی پابندی نہ ہو۔ اگر بالاتفاق کوئی عقل و دانائی کی بات کہہ جائے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ اگر اس کا کبھی کوئی نشان صحیح نہ لگے تو اس کی مثال اس نجومی سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہو جائے گی جو ہزاروں غلط بیانیوں میں اتفاقاً کبھی کوئی صحیح بات بھی کہہ جاتا ہے، ہنری چہلم کا قول ہے" نجومی اسقدر جھوٹ بولتے ہیں کہ بعض اوقات صحیح بات بھی ان کے منہ سے نکل ہی جاتی ہے"۔ اگر آپ کوئی دانائی کی بات کرنا چاہتے ہیں تو آپ کافی دیر تک محض گفتگو کرتے رہیے" خدا ایسے بھلے آدمیوں پر رحم فرمائے کہ جن کے پاس سماجی امتیاز حاصل کرنے کے لئے سوائے باتونی ہونے کے اور کوئی صفت ہی نہیں ہوتی ہے۔

بچے کے دماغ سے بعض اوقات بہترین خیال ظاہر ہو سکتا ہے، یا یوں کہئے کہ اس کی زبان سے بعض اوقات بہترین الفاظ بالکل اسی طرح نکل سکتے ہیں جس طرح ایک بیش بہا

براس کے ہاتھ لگ جاتا ہے، درآنحالیکہ وہ خیال اور میرا دونوں ہی اس کے ذاتی نہیں
دستے، کیونکہ اس صغر سنی میں فی الواقع دونوں اس کے ہو بھی نہیں سکتے ہیں۔ بچے کے ذہن
ب اس کی باتوں کے وہ معنی نہیں ہو سے جو ہم خود سمجھ لیتے ہیں، ان الفاظ سے جو خیال وہ متعلق
رتا ہے۔ وہ بالکل ہی جدا ہوتا ہے، اس کے خیالات اگر حقیقتاً اس کے ذاتی ہوتے بھی ہیں تو
وہ بے تعلق اور بے جوڑ ہوتے ہیں، ان میں کوئی چیز قابل وثوق اور یقینی نہیں ہوتی، آپ
اپنے نام نہاد کرشمۂ قدرت کا امتحان لیں تو اکثر و بیشتر آپ اس کے ذہن کو بیحد چست اور خیالات
کو غیر معمولی طور پہ پاکیزہ پائیں گے اور بعض اوقات یہی ذہن ایسا سست اور بحس سا
معلوم ہوگا کہ گویا ٹھہرا ہوا سا ہو گیا ہے۔ بعض اوقات وہ آپ پر بھی سبقت لے جائے گا۔ اور
بعض اوقات ایک قدم بھی نہ سرکائیگا، کبھی اس کو آپ صاحبِ ادراک و فہم خیال کریں گے تو کبھی
بیوقوف اور غبی۔ ہر دو حال میں آپ غلطی پر ہوں گے۔ وہ تو ایک بچہ ہے جس کی مثال ایک عقاب
کے بچے کے مانند ہے، جو تھوڑی دیر بلند پروازی اس لئے کرتا ہے کہ اپنے گھونسلے میں واپس آ کر
گر پڑے۔

پس آپ ظاہری علامتوں کے باوجود بھی بچے سے اس کی عمر کے مطابق ہی سلوک روا رکھیں۔
اس امر کا خیال رکھیں کہ محنت و مشقت کی زیادتی سے اس کی قوت برباد نہ ہونے پائے۔ نوخیز
دماغ اگر گرما کر جوش سے ابلنے لگے تو آپ آزادی سے اپنا کام کرنے دیں اور مزید آنچ نہ آنے
دیں کہ کہیں اس کی خوبی ضائع نہ ہو جائے۔ اور جب ابتدائی ہوائیں خارج ہو جائیں تو ما بقی کو جمع
کر کے محفوظ فرما دیجیے تاکہ عمر مابعد میں وہ حیات بخش گرمی اور حقیقی چستی میں تبدیل ہو سکیں
اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو آپ کا وقت اور محنت سب کچھ اکارت چلی جائے گی، اور آپ خود اپنا کام
بگاڑ دیں گے۔ اور ان دماغی جذبات میں اپنی ذات کو مدہوش کر لینے کے بعد سوائے پھیکی بدمزہ
اور ناکارہ شراب کے آپ کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔
کند ذہن اور غبی بچے بڑے ہو کر معمولی آدمی بن جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ باوثوق مجھے

کی دوسرا قاعدہ نہیں معلوم حقیقی اور اس فریب آور ظاہری کند ذہنی میں جو ایک مضبوط طبیعت کی علامت ہوتی ہے۔ اس دنیا میں تمیز کرنا بیحد مشکل اور دشوار ہے، بادی النظر میں یہ واقعہ نہایت ہی حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے کہ دو متضاد اور مخالف سروں کی ظاہری علامت ایک ہی ہو، لیکن فی الواقع ایسا ہوتا ضرور ہے، کیونکہ اس سن میں جبکہ بچے میں کوئی تخیل ہی پیدا نہیں ہوتا، صاحب ادراک اور دوسرے بچوں میں امتیاز اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ آخر الذکر بچے نقلی اور فریب آور تخیلات کو قبول کر لیتے ہیں اور اول الذکر تخیلات میں نقل اور فریب کے سوا اور کچھ نہ پاکر کوئی تخیل قائم ہی نہیں کرتے ہیں، پس ان معاملات میں اسکی حالت ایک بیوقوف کی سی ہو جاتی ہے، کیونکہ اولاً تو وہ خود کسی کام کو کرنے کے قابل نہیں ہوتا دوئم وہ کوئی کام اپنے کرنے کے لائق پاتا بھی نہیں ہے، ان دونوں میں تمیز محض اتفاقی ہوتی ہے جس سے صاحب فہم و ادراک کو بعض ایسے تخیلات کے مواقع مل جاتے ہیں جن کو وہ سمجھ سکتا ہے، لیکن کند ذہن ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہتا ہے۔ نو عمر کیٹو (Cato) کے والدین اسکو بچہ ہونے کی حیثیت سے کند ذہن اور غبی بھی تصور کرتے تھے۔ وہ ایک ضدی اور خاموش بچہ تھا۔ پس اس سے زیادہ اس میں اور کوئی چیز نہ دیکھی گئی تھی، یہ تو محض سلا کے دیوان خانے میں اتفاق ہوا کہ کیٹو کے چچا نے اس کی اہلیت اور قابلیت کو پہچانا، پس اگر وہ اس وقت اتفاقاً نہ پہونچا ہوتا تو تاحصول سن شعور کیٹو بے وقوف اور کودن ہی خیال کیا جاتا اگر دنیا میں قیصر نہ پیدا ہوتا تو کیٹو جس نے قیصر کے مہلک ادراک کو پہچان لیا تھا اور اس کی بڑی بڑی اور اہم تجاویز کی بابت پیشین گوئی کر دی تھی ساری عمر خواب دیکھنے والا ہی تصور کیا جاتا پس جو لوگ بچوں کے متعلق کوئی رائے جلد قائم کر لیتے ہیں وہ مغالطہ میں پڑ سکتے ہیں، اس لئے کہ اکثر وہ خود بچوں سے زیادہ بچے ہوتے ہیں، میں ایک ادھیڑ عمر شخص کو جانتا ہوں جس کی دوستی پر مجھے ناز ہے۔ اس کے خاندان والے اس کو پاگل اور بیوقوف ہی خیال کرتے تھے۔ لیکن اس نے یکایک ایک فیلسوف کی حیثیت سے دور حاضر میں شہرت حاصل کر لی

ور مجھے کامل یقین ہے کہ آئندہ نسلیں اس کو اس زمانے کے بڑے بڑے مفکرین اور علم موجودات
کے جدید علما میں ہی شمار کریں گی۔

بچپن کی وقعت کیجئے اور اس کے متعلق بھلی یا بری رائے قائم کرنے میں جلدی نہ فرمائیے
مستثنیات کو چھوڑ دیجئے کہ وہ خود بخود ظاہر ہو جاتی ہیں۔ خصوصی طرز اختیار کرنے کے قبل اس کی
صفات اور گنوں کی جانچ فرما کر توثیق کر لیجئے۔ اس کے قبل کہ آپ قدرت کا کام سنبھالیں قدرت
کو اپنا کام خود تکمیل کرنے کی فرصت دیجئے تاکہ اس کے معاملات میں آپ کی بیجا مداخلت
نہ ہونے پائے۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ وقت کی قدر جانتے ہیں اور اس کو ضائع کرتے
ہوئے ڈرتے ہیں۔ لیکن آپ اس امر کا لحاظ نہیں فرماتے کہ کسی فعل کے نہ کرنے
کی نسبت بے جا اور نازیبا افعال کے کرنے میں وقت زیادہ ضائع ہوتا ہے۔ اور یہ
کہ بے تربیت بچے کے مقابلہ میں بدتربیت بچے کو بھلائی سے زیادہ بُعد ہوتا ہے۔ اچھا تو آپ کو
یہ اندیشہ ہے کہ ابتدائی عمر کے سال بیکار ضائع ہو جائیں گے۔ استغفر اللہ۔ بھلا آپ یہ کیا
فرماتے ہیں! کیا آپ کے نزدیک خوش رہنا کوئی چیز ہی نہیں اور دن بھر کھیلنا کودنا اور
دوڑنا کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا! یقین جانیے کہ ساری عمر بھر کبھی وہ اتنا مصروف نہ ہو
پائیگا۔ افلاطون اپنی کتاب "جمہوریت" میں جو بڑی دشوار خیال کی جاتی ہے صرف میلوں تماشوں
کھیل کود گیتوں اور موسیقی کے ذریعہ ہی بچوں کو تعلیم دینے کی تجویز پیش کرتا ہے اب معلوم ہوتا ہے
کہ بچوں کو ہنسی خوشی زندگی بسر کرنا سکھا کر ہی وہ اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ قدیم رومانوی لڑکوں
کی بابت سینیکا کا بیان ہے کہ وہ ہمیشہ ہر وقت پھرتے اور گشت لگاتے رہتے تھے اور ان کو ایسی کوئی
چیز نہ سکھائی جاتی تھی جو انہیں نچلا اور خاموش بیٹھنے یا ٹکنے دیتی، اس کی وجہ سے کیا ان لوگوں
میں کچھ آدمیت کی کمی تھی! پس آپ اس نام نہاد سستی سے نہ ڈریئے۔ ایسے شخص کی بابت
آپکی کیا رائے ہے جو محض اس وجہ سے نہیں سوتا کہ اسکی زندگی کا ایک حصہ بیکار ضائع جاتا ہے؟ آپ
یہی فرمائیں گے کہ وہ پاگل اور خبطی ہے جو زندگی کا لطف نہیں اٹھاتا۔ نیند سے گریز کر کے وہ اپنی
موت کو جلد بلانے کی دعوت دیتا ہے۔ شعور اور ادراک کی نیند کو ہی بچپن کہتے ہیں۔ بس یاد رکھیے کہ

سرکاری جریدے کے اعلانات

نمبر و تاریخ	نام اور عہدہ	کس جگہ تقرر یا تبادلہ ہوا	کیفیت
زیڈ/۲۸۹۱۵ ۲ اکتوبر ۵۲ء	میاں سراج الدین ۔ ایم اے بی۔لٹ (آکسن) پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور ۔	موجودہ عہدے کے علاوہ ۵ ستمبر ۵۲ء سے یورپی نمونے کے اسکولوں کے معائنے کا کام بھی انہیں سپرد کر دیا گیا ہے اس سلسلے میں انہیں ایک سو روپے ماہانہ اسپیشل تنخواہ ملے گی۔	
ای/۳۰۱۹۹ ۴ اکتوبر ۵۲ء	میاں محمد حسین ایم ایس سی (دوم)	قائم مقام لکچرار طبیعات گورنمنٹ کالج جھنگ بمشاہرہ ۱۵۰/ ماہانہ (کل	قائم مقام لکچرار طبیعیات ڈی مانٹ مرنسی کالج سرگودھا بمشاہرہ ۲۲۵/ - ۱۵/ - ۵۰۰/۔ (کالج کیڈر)
زیڈ/۲۶۸۲۷ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۲ء	ایم بشیر حسین پی ای ایس (دوم) ڈی۔آئی۔ایس۔ شیخوپورہ ۔	ڈی۔آئی۔ایس، گجرات	ایم فدا حسین کی جگہ جو منتقل ہو گئے ہیں ۔
	ایم فدا حسین پی، ای، ایس (دوم) ڈی۔آئی۔ایس گجرات	ڈی۔آئی۔ایس۔ شیخوپورہ	ایم بشیر حسین کی جگہ جو گجرات منتقل ہو گئے ہیں
ایف/۲۸۵۶۶ ۲۴ ستمبر ۱۹۵۲ء	ایم طالع مند، بی اے ، بی۔ ٹی ۲۵۰/۔ - ۳۵۰/ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ (شیخوپورہ)	ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول اکال گڑھ (ضلع گوجرانوالہ) بشاہرہ خود ۔	ایم عنایت اللہ کی جگہ جو منتقل ہو گئے ہیں ۔
	ایم عنایت اللہ بی اے بی ٹی ۲۵۰/۔ - ۳۵۰/ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول اکال گڑھ (گوجرانوالہ)	ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ (شیخوپورہ) بشاہرہ خود	ایم طالع مند کی جگہ جو منتقل ہو گئے ہیں ۔

۵ شمارہ ۸] لاہور [نومبر ۱۹۵۲ء

اس شمارہ میں

مدیر : بشیر ہاشمی

معاونین : عبدالغفور چودھری
ایم - اے - عزیز

ایچ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کر یونیورسٹی بک ایجنسی کچہری روڈ
لاہور سے شائع کیا

قومی صحت

ابھی حال ہی میں لاہور کارپوریشن کی سالانہ رپورٹ شائع ہوئی ہے صحت کے متعلق جو اعداد و شمار
اس میں مندرج ہیں، ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ قومی صحت کو بہتر بنانے کی طرف بہت کم توجہ دی
گئی ہے، لاہور شہر میں اس سال صرف دق سے ۸۰۰ موتیں واقع ہوئیں اور دق کے مریضوں کی تعداد
۱۲۰۰ سے بڑھ کر ۱۶۰۰ ہو گئی ہے، لوگ عام طور پر حکومت کی شکایت کے عادی ہوتے ہیں لیکن اگر
تھوڑی بہت ہمت سے کام لے کر خود اصلاحِ حال کی کوشش کریں تو اپنے گندے ماحول اور غلیظ
گلیوں کو صاف ستھرا رکھ سکتے ہیں، یہ مانا کہ ہماری آبادیوں میں نہ کھلے ہوئے میدان ہیں نہ تفریح گاہیں
نہ پارک اور نہ پھولوں کی خوشنما روشیں، زندگی میں بالیدگی پیدا ہو تو کیسے، پھر بھی اگر ہر شخص اپنی صحت کا
خیال رکھے، اپنے بھائی بہن اور بچوں کی صحت کو بہتر بنانے کی کوشش کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ خرابیِ
صحت کی اس بڑھتی ہوئی تعداد میں کمی واقع نہ ہو۔ پچھلے سال مچھروں کی کثرت سے بیماری پھیلنے کا
اندیشہ تھا، حکومت نے ڈی۔ ڈی۔ ٹی چھڑکوایا اور مچھروں کے مارنے کی مہم جاری کی تو بڑی آسانی
سے آنے والی بیماری کو روکا جا سکا، انگلستان کے ایک شہر میں لوگوں کو عام طور پر نقصِ بصارت کی شکایت
رہتی، مقامی آبادی نے اس سلسلے میں کچھ ایسے انتظامات کئے کہ یہ بیماری یوں ہی نہ بڑھتی رہے، طبی
معائنہ کے بعد اس کا معقول علاج کیا جا سکے اور بیماری کی ابتدا یا اس سے پہلے ہی اس کا تدارک کیا
جا سکے، وہ لوگ اپنی اس تگ و دو میں کامیاب رہے، ہم بھی اپنی جسمانی اور ذہنی صحت مندی کے لئے
خود اقدام کر سکتے ہیں، کسی دوسرے کی بجائے اپنی صحت کا خود خیال رکھنا زیادہ موزوں ہے، زیادہ بھی

کم سے کم اپنے گھروں کو توصاف رکھ سکتے ہیں، اپنے محلّے میں صفائی کا خیال رکھ سکتے ہیں، اور اگر فرداً فرداً اِس کارِ خیر میں ہم سب حصہ لیں تو ہماری بہت سی پریشانیاں آپ سے آپ دور ہو جائیں۔

اِس سے کہیں زیادہ غم انگیز داستان بچوں کی صحت کی ہے۔ مدرسہ جانے والے بچوں میں کم از کم ۹۰ فی صدی کسی نہ کسی مرض کا شکار ضرور ہیں، یہ بچے قومی امانت ہیں، اُنہیں پر قوم کی موت و زیست کا انحصار ہے، صحت مند بچے ہی صحت مند قوم بنا سکتے ہیں، آج جو بچے اس تنگ و تاریک ماحول اور غیر صحت مند فضا میں تربیت پا رہے ہیں ان میں تب و تابِ زندگی کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے، اس گھٹے ہوئے ماحول میں ان کی جسمانی اور ذہنی قدریں بھی گھٹ گھٹ کر ختم ہو جاتی ہیں، ان مضمحل چہروں پر زندگی کی مسکراہٹ نمایاں ہو تو کیوں کر رونق اور چمک دمک پیدا ہو تو کیسے ماہرین تعلیم نے بچوں کی صحت کی اہمیت کو محسوس کیا اور صرف اس کی نظری توضیح ہی نہیں کی، اس اہم قومی ضرورت کی طرف تعلیم گاہوں کی توجہ بھی دلائی، دوسرے متمدن اور ترقی یافتہ ممالک میں بچوں کی صحت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے، لیکن ہم آج بھی اسی مقام پر ہیں جہاں سے ہم نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا بعض مدرسوں میں طبی معائنے ہوتے ہیں۔ بچوں کے جسمانی نقائص کی طرف والدین کو متوجہ کیا جاتا ہے، مگر دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ طبی معائنے کے بعد معالج جو تجویزیں پیش کرتا ہے اس پر عمل درآمد نہیں ہوتا، والدین خود بچوں کی صحت کی طرف بہت کم دھیان دیتے ہیں، حالانکہ ان کی تھوڑی سی توجہ سے فائدہ اور عدم توجہ سے نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

بچوں کی صحت کی ذمہ داری بہت کچھ اساتذہ پر بھی عائد ہوتی ہے، ہمیں ٹوٹے ہوئے کمروں اور بوسیدہ فرنیچر سے آزردہ خاطر نہیں ہونا چاہئے، موجودہ حالات میں جو کچھ میسر ہے اسی کے ذریعہ بچوں میں عمدہ صحتی اطوار پیدا کئے جا سکتے ہیں، بچوں کی صحت کو قائم رکھنے کے لئے مدرسہ کا صاف ستھرا ہونا ضروری ہے حتیٰ کہ صحت کے عمدہ اور کارآمد اصولوں کی تلقین اور اس کے عملی نمونے سے بچے متاثر ہوں اور ان میں ایسی اچھی عادتیں پیدا ہو سکیں کہ اندرون مدرسہ اور بیرون مدرسہ انہیں اپنی نجی، گھریلو اور سماجی زندگی میں خوش رہنے کا موقع مل سکے، یہ اساتذہ اور مدرسہ کا ہی کام ہے کہ بچوں کے صحتی پروگرام کے ذریعہ والدین اور دوسرے بالغوں کو اچھی عادات اور اچھے اطوار اختیار

کرنے پر آمادہ کیا جائے، اِس طرح مدرسہ گھر علاوہ سماجی تعلیم صحت کا بھی ایک اہم مرکز بن سکتا ہے۔ آج کے بچے کل کے نوجوان انہیں کے ہاتھوں میں پورے سماج کا نظم ونسق ہوگا، حکومت کی باگ ڈور ہوگی ان کا صحت مند اور توانا ہونا ضروری ہے، قوم کی سماجی اور انفرادی زندگی کے مستقبل کو سنوارنا اور اسے بہتر بنانا ضروری ہے تاکہ اگلی نسل موجودہ نسل سے بہتر ہو اور تیسری اس سے بہتر صحت مند بالغ نظر اور متنوع ہو حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق مدرسہ کا صاف ستھرا ہونا ضروری ہے، ہمارے یہاں بعض مدارس کی عمارتیں اس قدر خراب خستہ اور بے ڈول ہوتی ہیں کہ صحت کے اعلیٰ اصولوں کو اپنانا مشکل ہوجاتا ہے بعض مہتمم بے پروا اور جاہل ہوتے ہیں، انہیں یہ تعلیمی اصول پرستی اچھی نہیں معلوم ہوتی، اگر کمرے صاف ستھرے ہوں معیار کے مطابق روشنی پہونچنے کا اہتمام ہو، ہوا کثیف اور گرد آلود نہ ہو، پانی پینے کا انتظام اور بچوں کی نشست کا انتظام حفظانِ صحت کے اصولوں کے عین مطابق ہو تو یہی ماحول دل خوش کن اور جاذب اثر بن سکتا ہے، اس سے صرف طلبہ کی صحت ہی قائم نہیں رکھی جاسکے گی، بچوں میں عمدہ عادات بھی پیدا ہوجائیں گی اور وہ قوم کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوسکیں گے۔

فل برائٹ فیلوشپ اسکیم کے ماتحت دو امریکی پروفیسر، ہوریس بی۔ انگلش اور جوزف ایڈورڈ گولڈ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں ایک سال قیام فرمائیں گے، ہم ان کی آمد پر انہیں مبارک باد کہتے ہیں۔ اور انہیں یقین دلاتے ہیں کہ ہم ان کی تعلیمی معلومات اور ان کے طویل تدریسی تجربے سے معتدبہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے، پروفیسر انگلش کی اہلیہ محترمہ کو موسیقی سے کافی دلچسپی ہے، اور وہ اپنے دورانِ قیام میں پنجابی دیہی گانے سیکھنے کی آرزومند ہیں، ہم انہیں بھی خوش آمدید کہتے ہیں اور متوقع ہیں کہ ان کا قیام خوشگوار اور مفید ہوگا۔

پروفیسر انگلش اوہیو اسٹیٹ یونیورسٹی امریکہ (Ohio State University) میں تعلیمی نفسیات کے پروفیسر ہیں، اِس سے پہلے وہ مختلف تعلیمی اداروں میں اہم تعلیمی آسامیوں پر بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر اور ناظم عمل اور علاوہ ۱۹۱۶ء سے بحیثیت پروفیسر کام کرتے رہے ہیں، پروفیسر انگلش کو

[illegible]ک کالج آکسفورڈ (Pembroke College Oxford) میں رہوڈس اسکالرشپ
اس ادارے میں انہوں نے سنہ ۱۴-۱۹۱۱ء تک تعلیم پائی اس کے بعد سنہ ۱۹۲۴ء میں وہ امریکی
[illegible]نسل کے مرکز تعلیم و تربیت بچگاں میں رفیق کار کی حیثیت سے کام کرتے رہے سنہ ۱۹۳۲ء میں وہ یونیورسٹی
پروفیسروں کی امریکی انجمن اوہی یو اسٹیٹ چیمبر کے صدر تھے سنہ ۴۹-۱۹۴۸ء میں علمی اور پیشہ ورانہ
اخلاقیات کے صدر منتخب ہوئے، اسی طرح سنہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں شعبۂ تعلیمی نفسیات کے صدر ہوئے
اور امریکن ایسوسی ایشن فار ایڈوانس سائنس نے انجمن تعلقات انسانی کی مشاورتی کونسل کا صدر منتخب
کیا، ویسٹ ورجینیا کے ریاستی محکمۂ تعلیم نے تربیت بچگاں کے نصاب کی تدوین میں انہیں اپنا مشیر
مقرر کیا، پروفیسر انگلش نے اپنی عمر کا ایک حصہ سیر و سیاحت میں بھی بسر کیا ہے، انہیں بعض یورپی
زبانیں بھی آتی ہیں، انکی تصنیفات کم و بیش دو سو کتابوں، مقالوں اور تبصروں پر مشتمل ہیں ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں

(۱) "چائلڈ سایکالوجی" ..... نیویارک ہنری ہولٹ اینڈ کمپنی سنہ ۱۹۵۱ء

(۲) اسٹڈی آف دی انڈیوجول اسکول چائلڈ (دی۔ اے مے کے ساتھ) نیویارک ہنری ہولٹ اینڈ کمپنی سنہ ۱۹۴۱ء

(۳) اے اسٹوڈنٹس ڈکشنری آف سایکالوجیکل ٹرمز چوتھا ایڈیشن - نیویارک ہارپر اینڈ برادرز سنہ ۱۹۳۴ء

(۴) لرننگ اینڈ سائیکوڈکنالوجی سنہ ۱۹۴۹ء

پروفیسر انگلش بی ٹی کے طلبہ کو تعلیمی نفسیات پڑھائیں گے۔ اس کے علاوہ عام تعلیمی مسائل پر کچھ مقالے بھی پڑھینگے

پروفیسر گولڈ سنہ ۱۹۵۰ء سے سیراکیوز یونیورسٹی (Syracuse University)
نیویارک میں (Comparative Education) کے پروفیسر ہیں۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں راچسٹر یونیورسٹی سے
بی اے اور کولمبیا ٹیچرز کالج سے (Ed. M.) کی ڈگری حاصل کی، سنہ ۱۹۵۰ء سے سیراکیوز یونیورسٹی
سے پی ایچ ڈی کیا، موضوع تحقیقات فلسفۂ تعلیم تھا، سنہ ۱۹۴۲ء سے وہ مختلف اداروں میں مختلف حیثیتوں
سے کام کرتے رہے۔ کولمبیا ٹیچرز کالج میں وہ تعلیمی نفسیات کے پروفیسر رہے، سنہ ۱۹۴۵ء میں ڈائریکٹر
آف اسٹوڈنٹس پرسنل رہے، اور سنہ ۱۹۵۰ء سے Comparative Education کے اسسٹنٹ
پروفیسر ہیں، ان کی اہم تصانیف کے نام یہ ہیں (۱) ولیم رے نے اینڈ شکاگو یونیورسٹی (۲) ریذیڈنٹ ایڈوائزرس

مُعائنہ

عبدالغفور چودھری

ہماری مدرسی زندگی میں معائنہ کو جو اہمیت حاصل ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر بلارڈ کے بعض تاثرات کو سطور ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

انسپکٹر کی آمد پر بالعموم مدرسہ کی مجلسِ انتظامیہ کا ایک جلسہ ضرور ہوتا ہے جس میں تقریریں بھی ہوتی ہیں، ایک مرتبہ اسی قسم کے ایک جلسے میں ایک ممبر نے تقریر کی "جناب صدر! میں چند لفظ کہنے کے لئے کھڑا ہونے کی جرأت کر رہا ہوں، میں اکثر تقریر کرنے کے لئے اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوتا، لیکن جب میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں تو سمجھ لیجئے کہ میں کوئی بہت ہی اہم بات کہنے والا ہوں، اور آج تو بالخصوص مجھے ایک اہم چیز کی طرف توجہ دلانی ہے، اور وہ یہ کہ اسکول کے پمپ میں پانی نہیں آتا ہے"۔

ایک مرتبہ ایک مدرس کو کاؤنٹی کونسل کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے ایک طالب علم کو "ڈیم فول" کہا تھا۔ ایک ممبر نے جوش میں آکر کہا۔ بھلا اس بیہودگی کے کیا معنی ہیں، آپ کے سامنے ایک مدرس پیش کیا گیا ہے جس نے ایک لڑکے کو "ڈیم فول" کہا ہے مجھے یقین ہے اور یقین کامل کہ وہ لڑکا ضرور "ڈیم فول" ہوگا۔ اور اگر استاد نے اُسے ایسا کہہ دیا تو اس میں کیا مضائقہ۔ میری رائے یہ ہے کہ اس دعوے کو یک قلم خارج کر دیا جائے"۔

بعض اوقات انسپکٹروں کو اچھی خاصی کھری کھری سننا پڑتی ہیں، ایک مرتبہ میں چند امیدواروں کا انٹرویو کر رہا تھا جو ٹریننگ کالج سے ابھی تازہ بتازہ نکلے تھے۔ میں نے ایک امیدوار سے دریافت کیا جس اسکول میں آپ نے عملی تربیت حاصل کی وہ کیسا تھا"؟

"بالکل لغو"

"کیوں؟"

"کیوں کہ اس مدرسے میں اساتذہ تعلیم و تدریس کے لئے نہیں۔ امتحانی نتائج کے لئے کام کراتے ہیں"

"مگر دیکھئے! ہر شخص نتائج کے لئے ہی کام کرتا ہے۔ تعلیم و تدریس تو ان نتائج کے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ کیا ایسا نہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں یہ تو درست ہے۔ مگر جس اسکول میں میں کام کرتا تھا وہاں تو لوگ غلط قسم کے نتائج کے لئے کام کرتے ہیں"

"بھلا غلط قسم کے نتائج کیا ہوتے ہیں؟"

"اس قسم کے جنہیں انسپکٹر پسند کرتے ہیں"۔ اس نے جواب دیا۔

میں نے فی الفور اس کا نام کامیاب امیدواروں کی فہرست میں لکھ لیا۔

ایک دفعہ میں ایک ہیڈ ماسٹر کا کام دیکھ رہا تھا جو ابتدائی مدرسہ کی سب سے اونچی جماعت کو علم العضویات پڑھا رہا تھا۔ مضمون تھا "ہڈیوں کے جوڑ"۔ مدرس کے پاس جوڑوں کے ایکس رے فوٹو کا ایک چارٹ بھی موجود تھا۔ استاد نے چارٹ میں ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا یہ بازو کی طرح کیوں نہیں دکھائی دیتا؟"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ہڈیاں بھی نظر آتی ہیں"۔ ایک لڑکے نے جواب دیا

"بہت خوب! اچھا اب یہ تو بتاؤ کہ یہ ہاتھ کی طرح کیوں دکھائی نہیں دیتا؟"

چاروں طرف ایک سکوت اور مکمل خاموشی تھی، اس کا جواب کسی نے بھی نہیں دیا۔
"بتاؤ! ہاں ہاں، شاباش بتاؤ! بتاؤ۔ یہ سچ مچ کا ہاتھ کیوں نہیں معلوم ہوتا؟" مدرس نے پوچھا
"جناب! اس لئے کہ یہ ہاتھ نہیں پاؤں ہے"
حقیقت یہ ہے کہ طالب علم ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اور ماسٹر صاحب بے چارے انسپکٹر صاحب کے ڈر کی وجہ سے اتنے بوکھلا گئے تھے کہ پاؤں کو ہاتھ بتا رہے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ طالب علم کا جواب اکثر صحیح ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک استاد اپنی جماعت کو جس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل تھے۔ مرچنٹ آف وینس (MERCHANT OF VENICE) کا ڈرامہ دکھانے کے لئے لے گیا، میں نے جب معائنہ کیا تو بچوں کے ساتھ اس موضوع پر مفصل گفتگو ہوئی۔
"میں نے سنا ہے کہ پچھلے بدھ کو تم مرچنٹ آف وینس (وینس کا سوداگر) کا ڈرامہ دیکھنے گئے تھے؟"
"ہاں جناب"
"اچھا یہ بتاؤ کہ ڈرامے میں سب سے ذہین کیریکٹر (کردار) کون تھا؟"
"پورشیا"
"یہ کیسے معلوم ہوا؟"
"چوں کہ اس نے اس ملعون بڈھے یہودی کی خوب خبر لی۔"
"تم شائی لاک کو ملعون کیوں کہتے ہو؟"
"کیوں کہ وہ ملونیو (انیٹونیو) کے پہلو سے ایک پونڈ گوشت کاٹ لینا چاہتا تھا"
"کیا اسے اس کا حق حاصل تھا؟"
"ہاں ہاں حق تو تھا"

"تو پھر اسے ملعون کیوں کہتے ہو"؟

"جناب! وہ اپنے حق کے لئے نہیں لڑ رہا تھا وہ تو بدلہ لینا چاہتا تھا"

"تو پھر ڈیوک نے اسے بدلہ لینے سے کیوں نہیں روکا۔؟"

"جناب! ڈیوک بھی نہیں روک سکتا تھا"

"کیوں؟"

"چوں کہ قانون شائی لاک کے حق میں تھا"

"اچھا تو پھر پورشیا نے کیسے اس کی خبر لی؟"

ایک لمحہ کے غور و فکر کے بعد محض ایک ہاتھ اٹھا۔

"میں جانتا ہوں پورشیا نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اگر شائی لاک ایک پونڈ گوشت کاٹے گا۔ تو وہ خود ہی قانون توڑنے والا ہوگا"

"کیا ڈیوک کے ذہن میں نکتہ نہیں آیا؟"

"نہیں جناب"

"انطونیو کو بھی اس کا خیال نہ آیا؟"

"نہیں"

"بسانیو کو؟"

"نہیں"

"عدالت میں کسی اور مرد کو؟"

"نہیں"

"اچھا تو پھر اس کا خیال ایک عورت ہی کو آیا.... تو پھر عورتیں بہتر ہوئیں نہ مردوں سے"

جماعت بھر میں ایک سناٹا سا چھا گیا۔ اور اس کے بعد دفعتاً ایک بچے کا ہاتھ اٹھا۔ اور اس نے نہایت متانت سے کہا۔

مگر جناب! یہ ڈرامہ تو ایک مرد نے ہی لکھا ہے۔"

ایک دفعہ میں ایک بچہ اسکول کا معائنہ کر رہا تھا۔ ایک جماعت میں داخل ہو کر دیکھا کہ بچے بھورے رنگ کے کاغذ پر مختلف رنگوں سے ڈرائنگ کا کام کر رہے ہیں۔

"اچھا ڈرائنگ ہو رہی ہے"۔ میں نے استانی سے کہا۔

"نہیں جناب یہ ڈرائنگ کا سبق نہیں ہے"

"معاف کیجئے مجھے تو ڈرائنگ سا ہی معلوم ہو رہا ہے، آپ اسے کیا کہتی ہیں؟"

"یہ ڈرائنگ نہیں، کنڈر گارڈن ہے، اگر یقین نہیں آتا تو وقت نامہ دیکھ لیجئے۔"

میں نے وقت نامہ (ٹائم ٹیبل) اٹھا کر دیکھا تو اس میں "کنڈر گارڈن" ہی لکھا ہوا تھا۔

"تو ڈرائنگ اور کنڈر گارڈن میں فرق کیا ہوا؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

اس پر مجھے بامعنی خیز جواب ملا:۔

"جب بچے سیاہ پنسل سے سفید کاغذ پر شکلیں بناتے ہیں تو یہ ڈرائنگ ہے، اور جب رنگین پنسلوں سے بھورے رنگ کے کاغذوں پر کام کرتے ہیں تو یہ کنڈر گارڈن (کنڈر گارٹن) ہے۔

ایک مرتبہ آٹھ سال کی عمر کے بچوں کی ایک جماعت ابھی ابھی ایک جزیرے کا سبق پڑھ چکی تھی اور میں اس سے اخذ کرانا چاہتا تھا کہ انگلستان ایک جزیرہ ہے۔ میں نے جنوب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "اس طرف کیا ہے؟"

"جرنیلی سڑک"۔

"یہ کون سی سمت ہے، مشرق، مغرب، شمال، جنوب"۔

"جنوب"

"اچھا فرض کرو میں ایک چھوٹی سی چڑیا بن جاؤں اور جنوب کی طرف اڑنے لگوں تو میں کہاں

کہاں سے گذروں گا؟"

"گھروں کے اوپر سے، دریائے ٹیمز کے اوپر سے، کھیتوں اور پہاڑوں پر سے"

"یادرکھنا میں ایک چھوٹی سی چڑیا ہوں۔ بالآخر میں کہاں پہونچوں گا؟"

"سمندر پر"

"اور اگر مشرق کی جانب پرواز کروں تو کہاں پہونچوں گا؟"

"سمندر پر"

اچھا اب ذرا سوچ کر جواب دینا۔ اگر میں ایک ہزار میل تک سمندر کے قریب پہونچے بغیر پرواز کرتا جاؤں تو مجھے کس سمت میں اڑنا چاہیئے؟"

میں بچوں سے یہ جواب اخذ کرانا چاہتا تھا کہ چونکہ انگلستان ایک جزیرہ ہے اس لئے ایک ہزار میل تک مسلسل خشکی پر کسی طرف نہیں جا سکتے۔

دفعتاً پچھلی بنچوں پر سے ایک ننھا سا ہاتھ اٹھا:۔

"تو جناب آپ کو مسلسل آسمان کی طرف اڑنا چاہیئے"

عالمی شہریت

فضل احمد

تعلیم کا مقصد گو ہر زمانے میں اچھے انسان پیدا کرنا رہا ہے، لیکن اچھے انسان کا تصور ہمیشہ ایک سا نہیں رہا، قرون مظلمہ میں ایک اچھا انسان غالباً وہ تھا جو توہم پرستی میں سب سے بازی لے جائے، قرون وسطیٰ میں یورپ میں اچھا آدمی اسے خیال کیا جاتا تھا جو تنگ نظرانہ مذہبی دیوانگی کا پیکر ہو۔ اور جدید یورپ میں اچھا انسان وہ ہے جو اپنے ملک کو باقی ہر شے پر مقدم رکھتا ہو۔ ان بدلتے ہوئے نظریوں کے ساتھ ساتھ تعلیم کے نصب العین کا بدلنا بھی ضروری ہے موجودہ صدی کی دو ہمہ گیر اور ہمہ سوز جنگوں نے مغرب میں ایک نئے احساس کو جنم دیا ہے۔ اب یہ بات اچھی طرح نظر آنے لگی ہے کہ موجودہ جنگجویانہ قوم پرستی نوع انسان کو ایک ایسے راستے پر چلا رہی ہے جو بہت جلد تباہی کے گڑھے میں دھکیل دینے والا ہے۔ اور اس ہلاکت سے بچاؤ کی صورت یہی ہے کہ اس راستے کو چھوڑ کر بین الاقوامی خیر سگالی کا راستہ اختیار کیا جائے، دنیا میں ہر جگہ نئی پود کو اس طرح تعلیم دی جائے کہ وہ اپنے آپ کو کسی خاص ملک یا قوم کے ساتھ وابستہ سمجھنے کی بجائے انسانی برادری کا ایک جزو خیال کرنے لگے، اس نظریہ کی اشاعت میں اضلاع متحدہ امریکہ پیش پیش ہے، اس کی وجوہ خواہ کچھ بھی ہوں اس میں کلام نہیں کہ یہ نصب العین فی الواقع بہت بلند اور پاکیزہ نصب العین ہے۔ اسلام نے آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے نوع انسان کو ایک نقطے پر جمع کرنے کے لئے کہا تھا کہ اے اہل کتاب

آؤ ہم آپس میں مل کر ایک منصفانہ مسئلہ پر ایکا کر لیں یعنی یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں گے اور نہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرائیں گے"۔ ظاہر ہے کہ عالمگیر سمجھوتے کے لیئے اس سے وسیع تر بنیاد خیال میں نہیں آسکتی، نوع انسان کو اس خدا کے نام پر جس نے ان سب کو پیدا کیا اور سب کا پالنے والا ہے ایک ہو جانے کی دعوت دی جا رہی ہے، لیکن دنیا اس وقت ابھی اتنا لمبا قدم اٹھانے کے لیئے تیار نہ تھی، آج مہیب واقعات کی منطق نے عصر حاضر کے روشن خیال انسان کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ عالمگیر بھائی چارے کی کوئی معقول راہ تلاش کرے اور اسے یہ راہ لامحالہ تعلیم کی شکل میں ہی نظر آئی ہے، مغربی ممالک اور بالخصوص امریکہ میں اب اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ عالمگیر خیرسگالی کے لیئے ضروری ہے کہ طلبہ کو عالمی امور سے اچھی طرح آگاہ کیا جائے تاکہ ان کی دلچسپیاں قومی اور ملکی حدوں پر ہی ختم نہ ہو جائیں، بلکہ وہ ان تمام معاملات میں دلچسپی لیں جن کا تعلق نوع انسان کی بہبود سے ہے۔

اس ضمن میں اساتذہ کے سامنے دو اہم سوال پیدا ہوتے ہیں (۱) عالمی معاملات کی مؤثر تعلیم کے لیئے کونسی شرائط ضروری ہیں؟ (۲) ان ضروری شرائط کی روشنی میں طریقہ ہائے تعلیم میں کسی حد تک ترمیم ہونی چاہیئے؟

پہلے سوال کے جواب میں سب سے قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اس وقت دنیا ایک ایسے مقام پر پہنچ چکی ہے، جہاں تاخیر اور التوا نہایت خطرناک ثابت ہوں گے، اگر یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ دنیا کے آئندہ شہریوں کو تو موزوں تربیت دینے کا سامان کر لیا جائے اور بالغوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو اس فیصلے کے نتائج اچھے نہ ہوں گے، کیونکہ اغلب یہی ہے کہ نئی پود کے جوان ہونے سے پہلے پہلے ہی دنیا کی قسمت کا فیصلہ ہو جائے گا پس بین الاقوامی تفہیم کے ہر منصوبے میں تعلیم بالغاں کو اہم جگہ ملنی چاہیئے، اب تک تو زبانی طور پر یہ کہا جاتا رہا ہے کہ مدرسہ کو ارد گرد کے معاشرہ کا آئینہ ہونا چاہیئے، لیکن عملاً مدرسہ نے اس نصب العین کو ابھی پورا نہیں کیا یہ اسی وقت ہوگا جب ہر مدرسہ نہ صرف مقامی بچوں بلکہ مقامی بالغوں کے لئے بھی تعلیم کا ایک موثر مرکز بن جائیگا

لیکن دنیا ابھی اس نصب العین سے کوسوں دور ہے، پاکستان جیسے پسماندہ ممالک کا تو ذکر ہی کیا ہے، ترقی یافتہ ملکوں کو بھی ابھی یہ بات نصیب نہیں ہوئی، اضلاع متحدہ امریکہ تعلیم و ثروت ہر دو لحاظ سے دنیا کا پیشرو ہے۔ مگر وہاں بھی یہ حالت ہے کہ بہت کم ریاستوں میں تعلیم بالغاں کی طرف توجہ کی جا رہی ہے۔ کیلے فورنیا کی ریاست اس میدان میں باقی سب ریاستوں سے آگے ہے اور سالانہ کوئی ایک کروڑ ڈالر کی خطیر رقم تعلیم بالغاں پر صرف کر رہی ہے، لیکن اس فیاضی کے باوجود صرف دس فی صدی بالغوں کو تعلیم کی سہولتیں پہونچائی جا سکی ہیں، یہاں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ امریکہ کے سامنے ہماری طرح ناخواندگی کا مسئلہ نہیں بلکہ وہاں تعلیم بالغاں کا مقصد یہ ہے کہ خواندہ بالغوں کے ثقافتی افق کو وسیع کیا جائے، تاکہ وہ عالمی مسائل کو اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔

شاید یہاں یہ کہا جائے کہ عالمی معاملات کے متعلق مدرسوں کو مرکز تعلیم بنانے کی کیا ضرورت ہے، ہر ملک میں کئی ایسے رضاکار ادارے موجود ہیں جن کا نصب العین ہی بین الاقوامی امور میں دلچسپی لینا ہے، پس ان اداروں کی رکنیت ہی لوگوں کو عالمی امور سے اچھی طرح آگاہ کر دے گی، اس میں کلام نہیں کہ اس قسم کے ادارے موجود تو ہر ملک میں ہیں، لیکن ان کے دائرۂ عمل کی وسعت کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ اضلاع متحدہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی ایسے لوگوں کی تعداد دس فیصدی سے زیادہ نہیں، جو اس قسم کے اداروں سے تعلق رکھتے ہوں اور جب یہ بات بھی پیش نظر رکھی جائے کہ ان اداروں میں سے بہتوں کو عالمی معاملات کے ساتھ دور کا لگاؤ ہے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ اس ضمن میں ان رضاکار اداروں پر سارا بھروسا رکھنا جائز نہیں، ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑے گا کہ مدرسا اور پیشۂ معلمی ہی وہ سہارے ہیں جن پر تعلیم بالغاں کے لئے پورے یقین کے ساتھ بھروسا کیا جا سکتا ہے، جب تک ہر مدرسہ سچے معنوں میں تعلیم بالغاں کی تمام ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل نہیں ہو جاتا اسوقت تک بین الاقوامی تعلیم کے عام ہونے کا کوئی امکان نہیں، چونکہ یہ تعلیم آج دنیا کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

اس لیئے اس معاملہ کو فوری توجہ ملنی چاہیئے ۔

بین الاقوامی تعلیم کے ضمن میں ایک قابل توجہ امر یہ ہے کہ جدید میکانکی تہذیب نے گو اقتصادی اور معاشی میدانوں میں انسانوں کے باہم مل جل کر کام کرنے کے امکانات کو از حد ترقی دی ہے اور عصر حاضر کی پیدائشی تکنیک باہمی تعاون اور رفاقت کو دور دور دراز حدوں تک لے جا چکی ہے تاہم سیاسی اور معاشری میدانوں میں یہ جذبۂ رفاقت اور تعاون باہمی دونوں کو سخت دھکا لگا ہے پہلے زمانوں میں معاشری اور سیاسی امور عام طور پر جماعتی بحث و تحیص کے بعد طے پایا کرتے تھے، ہر مقامی معاشرے میں ایک چھوٹی سی جماعت ان امور کے لیئے ذمہ دار ہوتی تھی اور اس کے افراد بالمشافہات چیت کر کے انہیں طے کرتے تھے۔ اس طرح گویا مقامی معاشرہ کے بیشتر افراد کو زندگی کی ذمہ داریوں سے باخبر رہنے اور ان میں زندہ دلچسپی لینے کا موقع مل جاتا تھا، یہ صورت حال اب بہت کچھ بدل چکی ہے۔ اب عموماً تمام بڑے بڑے سیاسی اور معاشی امور کسی دور دور دراز قومی مرکز میں طے پاتے ہیں اور مقامی معاشرے آنکھ بند کیئے ان فیصلوں پر کاربند ہو جاتے ہیں، عصر حاضر کے اس رجحان نے بعض ماہرین عمرانیات کو کافی فکرمند کیا ہے جب قومی زندگی میں عوام کو مؤثر حصّہ لینے کے مواقع نہ ملیں تو یہ امید کرنا بالکل عبث ہے کہ وہ بین الاقوامی زندگی میں کوئی قابل ذکر حصّہ لے سکیں گے، پس انسانوں کو موثر بین الاقوامی شہریت کے لیئے تیار کرنے کے لیئے ضروری ہے کہ مختلف حکومتیں اپنے شہریوں کو قوم کی سیاسی اور معاشی زندگی میں زیادہ سے زیادہ حصّہ لینے کے مواقع بہم پہونچائیں۔

اس سلسلہ میں ایک اہم احتیاط کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے میکانکی تہذیب نے جہاں وسیع پیمانہ پر مادی پیدائش کو ممکن بنا دیا ہے، وہاں حکومتوں کے ہاتھوں میں رائے عامہ کی تربیت کے لیئے انبوہ گیر ذرائع بھی دیدیئے ہیں، ریڈیو، سینما، اخبارات اور اس قسم کی دوسری چیزیں ایسے ذرائع ہیں جن کی مدد سے گھڑے گھڑائے نظریئے لوگوں پر تھوپے جا سکتے ہیں گویا سائنس کے یہ کرشمے عوام کو قوت فکر سے خالی کرنے کے درپے ہیں۔ اس صورت حال میں

جو خطرہ چھپا ہے اس کی طرف اوپر ذکر گذر چکا ہے، اس نکتے کی وضاحت کے لئے بعض امریکی عالموں نے دلچسپ واقعاتی شہادت جمع کی ہے۔ پچھلی عالمگیر جنگ کے موقع پر عوام سے جنگی تمسکات خریدنے کی اپیل کی گئی تھی، انہوں نے ذرائع نے صرف بارہ فیصدی لوگوں کو متاثر لیا، لیکن جب چھوٹے چھوٹے گروہوں کو بالشافہہ متاثر کرنے کی کوشش کی گئی تو گو رقبہ محدود رہا لیکن نتائج ۶۴ فیصدی تھے۔

مندرجہ بالا حقیقت کی توجیہات بالکل صاف ہیں، معاشری زندگی کی بنیادیں وہ ابتدائی ادارے ہیں جو گھر، کنبہ اور حلقہ، احباب کے نام سے پکارے جاتے ہیں ایک عام شہری کی فوری دلچسپی انہیں اداروں میں ہوتی ہے، اور جب کسی شخص کا اکثر وقت کسب معاش کی نذر ہو جائے تو اس سے یہ امید رکھنا فضول ہے کہ وہ ان ابتدائی معاشری اداروں سے باہر کسی چیز میں دلچسپی لے سکیگا، انگلستان کے مزدوروں کو حال ہی سوالات پوچھنے پر معلوم ہوا تھا کہ ان میں صرف بیس فیصدی ایسے ہیں جو اپنی نجی زندگی کے علاوہ کسی اور چیز میں دلچسپی لیتے ہیں، پس یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ایک اوسط درجے کا شہری اپنے نظریئے گردو پیش کے ماحول سے اخذ کرے گا، اگر اس کے گھر اور حلقہ، احباب میں بین الاقوامی معاملات زیر بحث آتے رہتے ہیں تو ان میں اس کی دلچسپی خود بخود جاگ اٹھے گی، اگر ایسا نہیں تو پھر اس مقصد کا حاصل کرنا مشکل ہے۔

امریکی رائے عامہ کے تحقیقاتی مرکز نے پچھلے دنوں بہت سے لوگوں سے یہ سوال پوچھا تھا کہ اگلی جنگ کو رد کنے کے لئے وہ کیا کر سکتے ہیں؟ اس کے جواب میں ۴۴ فیصدی لوگوں نے اقرار کیا کہ انہیں اس کا کچھ جواب نہیں سوجھتا، یہ اس ملک کا حال ہے جہاں ناخواندگی تقریباً ناپید ہے، اور جہاں نشر و اشاعت پر اسقدر کا غذ صرف کیا جاتا ہے جو باقی تمام دنیا کی کھپت سے زیادہ ہے، یہ صورت حال بے حد تشویشناک ہے، جب تک انسانوں کی اکثریت بین الاقوامی معاملات سے آگاہ ہو کر جنگ کو ختم کر لینے کا عزم نہیں کر لیتی اسوقت تک دنیا کا مستقبل محفوظ نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس بین الاقوامی تعلیم کے لئے مؤثر ترین ذریعہ مقامی زندگی ہے اگر بادی النظر میں مقامی زندگی کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنا مشکل معلوم دیتا ہے، لیکن آج ماہرین تعلیم کے سامنے وقت کا سب سے بڑا سوال یہی ہے اور اس کا تسلی بخش حل ان کے علم اور تجربہ کا کڑا امتحان لے گا۔

بین الاقوامی تعلیم کے ضمن میں ایک اور اہم ضرورت لگاتار چھان بین اور تحقیقات کی ہے۔ آج تک یہ تو ہوتا رہا ہے کہ بین الاقوامی حس کی ترقی کے لئے بے شمار لٹریچر تیار ہو۔ اور دنیا میں جگہ جگہ بانٹا جائے لیکن ان مہموں کے نتائج کو جانچنے کے لئے کبھی کچھ نہیں کیا گیا، یہ معلوم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی کہ اس طرح کتنے لوگوں کی آراء متاثر ہوئیں اور اس تاثر نے ان کے کردار میں کیا تبدیلی پیدا کی، جب تک یہ سائنسی طریق کار اختیار نہ ہوگا۔ اس وقت تک اس کام کی نوعیت صرف ہنگامی رہے گی لیکن جو تہذیب ہائیڈروجن بم کی تیاری پر اُن تھک کوششیں صرف کرسکتی ہے اس کے لئے مذکورہ بالا جائزے کا بندوبست کرنا چنداں مشکل نہیں ہے۔

طریق کار کے ذرائع اوپر کی سطور میں ان ضروری شرائط کا ذکر گذر چکا ہے جو بین الاقوامی شہریت کو ترقی دینے کے لئے لازمی ہیں، اب ان ذرائع پر غور کیا جائے گا جو اس مقصد کو حاصل کرنے میں کام دے سکتے ہیں، یہ ذرائع مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) ہمارا کالا والے اور ہر قسم کی قومی جماعتیں (۲) اقوام متحدہ کے تعلیمی تعافتی اور سائنسی ادارہ کی طرف سے قائم شدہ قومی کمیشن اور اس کے علاقائی مرکز (۳) نظام تعلیم جس میں سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی ادارے سب شامل ہوں گے۔ (۴) ابتدائی معاشرتی ادارے جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے (۵) انہوں ہی ذرائع۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ تمام ذرائع بین الاقوامی شہریت کی ترقی کے لئے مصروف کار ہیں تو پھر فوراً دو ضروری سوال پیدا ہوتے ہیں۔ (۱) ابتدائی معاشرتی اداروں کو عالمی معاملات پر بالمشافہ بحث و تمحیص سے جو آراء وجود میں آئیں انہیں آخری حکمت عملی کی تشکیل میں کس طرح استعمال کیا جائے؟ حال ہی میں جب کوریا میں جنگ چھڑی تو اضلاع متحدہ امریکہ نے یہ ضرورت محسوس کی

کہ امریکی عوام کو اسباب جنگ سے اچھی طرح آگاہ کیا جائے تاکہ وہ حکومت کے اقدام کا پورے طور پر ساتھ دیں اور ساتھ ہی انہیں یہ احساس بھی ہو کہ جارحانہ کارروائیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے ادارے کو ہر لحاظ سے اس قدر مضبوط بنا دیا جائے کہ کسی کو اس کے فیصلے سے سرتابی کی جرات نہ ہو۔ یونیسکو کے قومی کمیشن نے مجلس عمل سے درخواست کی کہ وہ ان ہر دو مقاصد کے حصول کے لئے ضروری لٹریچر کے بارے میں تجاویز پیش کرے۔ اسے ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی گئی کہ وہ تمام قومی رضاکار جماعتوں کا تعاون حاصل کرے۔ لیکن یہ سب کچھ کر لینے کے بعد بھی یہ یقین کرنا محال تھا کہ جو خطیر دولت اور بے اندازہ قومی توانائی اس مہم پر صرف ہوئی ہے وہ ساری کی ساری ٹھکانے لگی ہے یا نہیں۔ کیوں کہ لاکھوں امریکی ایسے بھی تھے جنہیں ان رضاکار جماعتوں میں سے کسی کے ساتھ بھی کچھ سروکار نہ تھا۔ ان حالات میں یہ یقین کرنا غلط نہیں کہ لاکھوں شہریوں نے اس لٹریچر کو بلا پڑھے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا ہوگا کیونکہ ہر چند یہ لٹریچر بڑی احتیاط اور پیش بینی کے ساتھ تیار کیا گیا تھا۔ یہ بات بالکل قدرتی تھی کہ عوام کے کئی بڑے بڑے حصوں کو اس میں اپنے ڈھب کی کوئی شے نظر نہ آئی۔ حالانکہ مسئلہ زیر بحث ایسا تھا جس کا انجام قوم کے تمام افراد کو بڑی حد تک متاثر کرنے والا تھا۔

عملی طریق کار

ان دشواریوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے مجلس عمل نے پہلی سفارش یہ کی کہ امریکی نیشنل کمیشن عوام کو ادارۂ اقوام متحدہ کے متعلق زیادہ سے زیادہ باخبر بنانے کے لئے تعلیمی کام کو ہاتھ میں لے۔ اور اسی تعلیمی کام کے لئے تمام رضاکار جماعتوں۔ مقامی اور ریاستی اداروں تمام چھوٹے اور بڑے تعلیمی اداروں اور انہی ذرائع سے کام لیا جائے طریق کار کی یہ صورت ہوگی۔ یہ ادارہ اپنا اور حکومت امریکہ کا تیار کردہ لٹریچر تقسیم کرے گا لیکن جہاں کہیں اسے معلوم ہوگا کہ عوامی زندگی میں خلا باقی رہ گئے ہیں تو انہیں پُر کرنے کے لئے ان لوگوں کے حسب حال مواد تیار کیا جائے گا۔ خواہ یہ مواد کتابچوں کی شکل میں ہو خواہ مضمون کی شکل میں اور خواہ نشریات کی شکل میں۔ ایسا کرنے سے یہ ہوگا کہ جمہور کے کوئی طبقے ایسے باقی نہ رہیں گے

جنہیں اپنے ابتدائی معاشری حلقوں میں بحث وتمحیص کے لئے بین الاقوامی موضوع ہاتھ نہ لگ جائیں، جن طبقوں کی نمائندگی رضاکارادارے کرتے ہیں ان کی دلچسپیوں تک ان اداروں کی راہ سے رسائی ہو جائے گی، باقی لوگوں کے ساتھ براہ راست رابطہ پیدا کرنے کے لئے ان کی دلچسپیوں کا مطالعہ کیا جائے گا اور اس مطالعہ کی روشنی میں ان تک پہونچنے کے ذرائع وضع کئے جائیں گے۔ ان ذرائع کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

نیشنل کمیشن کی مجلس منتظمہ نے مجلس عمل کو یہ اختیار دیدیا ہے کہ وہ دوسرے ذرائع سے مالی امداد قبول کرے اور اس طرح تعلیمی مہم کی گہری چھان بین کے لئے طریقے اختیار کرے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان تعلیمی کوششوں نے افراد کے طرز عمل پر کیا اثر ڈالا ہے، اس کے ساتھ ہی یہ تحقیقات بھی جاری رہے کہ جو لوگ کسی جماعت کے ساتھ منسلک نہیں ہیں۔ ان تک پہونچنے کی کیا صورت ہو، کسی قسم کا سمعی اور بصری مواد انہیں متاثر کرے گا؟ ان تمام ذرائع کا مقصد یہ ہوگا کہ حکومت کی خارجہ حکمت عملی اور عوامی رجحانات کے درمیان زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

اِن تمام تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قومی تربیتی عمل گاہ کی مدد سے ایک جامع منصوبہ تیار کیا گیا ہے، جسے معاشری علوم کے ماہرین پورا کریں گے، اس منصوبے کے ماتحت بہت سے مقامی مرکز کھولے گئے ہیں، یہ مرکز مقامی جماعتوں کی خدمات سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے لیکن اصل کام عمرانیات کے ماہروں کی راہنمائی میں ہوگا، منصوبے کے ماتحت یہ کام بھی کیا گیا ہے کہ ہر مرکز کی رائے عامہ کا جائزہ لینے اور اسے اوپر پہونچانے کا بھی پورا بندوبست ہو، گویا اس منصوبے نے ان تمام سوالوں کا عملی جواب دینے کی کوشش کی ہے، جو اوپر کی بحث میں اٹھائے گئے تھے، ابھی اس منصوبہ کے عملی نتائج منظر عام پر نہیں آئے ہیں لیکن یہ بات یقینی ہے کہ ان نتائج کو دنیا بھر میں دلچسپی سے دیکھا جائے گا۔

خاتمۂ کلام | اس ضمن میں ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس منصوبے پر جو اخراجات آرہے ہیں ان سب کا بوجھ یونیسکو کے لئے بڑا مشکل ہے، چنانچہ دوسرے ذرائع

سے مالی امداد حاصل کرنے کی کوشش جاری ہے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ یہ سارا خرچ اس خرچ کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں جو روزانہ جنگی تیاریوں پر کیا جا رہا ہے، یہ بات نہایت عجیب ہے کہ دُنیا کی سب سے بڑی حکومتیں جو امن اور سلامتی کے راگ الاپتے نہیں تھکتیں۔ قیام امن اور بین الاقوامی شہریت* کے جذبے کی ترقی ہی پائدار امن کی ضامن ہے۔ لیکن عملاً امن اور سلامتی کو ترقی دینے کے لئے ہتھیاروں کے ڈھیر پر ڈھیر لگائے جاتے ہیں، اور کوشش بہر کی جاتی ہے کہ یہ ڈھیر آسمان سے چھونے لگیں، تاکہ باقی ساری دُنیا کو خوف زدہ کر کے کرۂ ارض پر قبرستان کا امن وسکون مسلط کر دیا جائے۔ اور نوع انسانی کو نیم مردہ بنا کر اسے امن وسلامتی کے زمزمے گانے پر مجبور کیا جائے۔

دورِ حاضر کی بڑی حکومتوں کے ادارے خواہ کچھ بھی ہوں اس میں کلام نہیں کہ عالمی شہریت ایک پاکیزہ نصب العین ہے اور جو قدم اس کی طرف بڑھے وہ بہر صورت غنیمت ہے، اگر سب ملکوں میں عالمی شہریت کو تھوڑی بہت توجہ مل جائے تو اس سے یہ امید بندھنے لگے گی کہ گو حکومتیں آپس میں دست وگریباں ہوتی رہیں، مختلف ملکوں کے لوگ موجودہ دور کی طرح ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نہیں رہیں گے، موجودہ صدی کی ہمہ گیر جنگوں سے پہلے یہی ہوا کرتا تھا۔ کہ دو بادشاہوں میں جنگ جاری ہے مگر ان کی رعایا کو ایک دوسرے سے کوئی بیر نہیں، اگر عالمی شہریت کی تربیت سے معاشری ارتقا کی یہ پیچھے چھوڑی ہوئی منزل ہی لوٹ آئے تو نوع انسان کو بہت شکر گذار ہونا چاہیئے کیونکہ اس طرح کم از کم انسان کی سب سے قیمتی میراث یعنی تہذیب جدید کے تباہ ہوجانے کا خطرہ تو ٹل جائے گا۔ اسلام نے عالمی شہریت کی بنیاد توحید اور نفی شرک پر رکھنی چاہی تھی، موجودہ مذہبی اقدار کی کچھ زیادہ دلدادہ نہیں۔ اس لئے اس نے باہمی تفہیم کو عالمگیر خیر سگالی کی اساس قرار دیا ہے اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہ بنیاد بھی ہر طرح قابل قبول ہے، کیوں کہ جب دنیا بھر کے انسان غیر پسندیدہ جذبات سے خالی ہو کر دوسروں کے نقطۂ نگاہ کو دیکھنے کے عادی ہوجائیں گے تو پھر بہت اغلب ہے کہ اگلا قدم اسلام کے مجوزہ طریق کار کا اختیار کرنا ہوگا۔

* شہریت کے معاملے میں زبانی جمع خرچ کی ضرورت [illegible] بین الاقوامی شہریت

قسط ۳

یونان میں تعلیم کے ارتقائی مدارج

محمد عبدالعزیز

ایتھنز میں تعلیم پرانی یونانی تعلیم اپنی تنظیم اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے شہری ریاست کے تابع تھی۔ اس کی حدود کو متعین کرنے کے لئے ہمیں ماضی کے ان جھلملاتے ہوئے نقوش کو معلوم کرنا ہوگا، جو مستقبل کے تعلیمی ڈھانچے میں آب و رنگ بھرنے کے لئے ممد و معاون ثابت ہوئے۔ خاندانی ماحول، دیہاتی سماج قبیلے شہری ریاست کی تعمیر کے مختلف مدارج کی حیثیت رکھتے تھے۔ خاندان کو ایک سلسلے میں مربوط رکھنے کا انحصار زیادہ تر زمین رشتہ پر ہوتا تھا اور اقتصادی اور مالی ضروریات دیہاتی سماج کو ایک لڑی میں منسلک ہونے میں مددگار ثابت ہوتی تھیں۔ زمین کی طبقاتی تقسیم کے پیش نظر قبیلے ایک دوسرے سے متعلق اور وابستہ رہتے، اسی طرح شہری ریاست بھی اپنے ابتدائی ایام میں مختلف قبیلوں کی مالی اور اقتصادی ضروریات اور زمین کی اقتصادی تقسیم کے پیش نظر، اجتماعی حیثیت سے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ترقی کرتی رہی اور جب یونان کی بڑھتی ہوئی ترقی میں ایتھنز کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی تو دولت کی فراوانی سلطنت کی وسعت، طاقت و جبروت اور سیاسی طنطنے کی بدولت یونانی اپنے اس عہد ترقی میں قیادت کا علم لیکر منظر عام پر آگئے۔ بقول پریکلیز "ہمارے شہر کی عظمت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی شان و شوکت کی بدولت ہمارے لئے دنیا کی ہر نعمت فراواں ہے، چنانچہ دوسرے ممالک کی نعمتوں سے ہم اسی طرح متمتع ہوتے ہیں جس طرح اپنی نعمتوں سے ہم اپنے کام و دہن کو لذت اندوز کرتے ہیں"۔

اس آسودگی اور اطمینان نے ان کی ذہنی صلاحیتوں کو ابھارا، ان میں تلاش و جستجو کا مادہ پیدا

لیا۔ اور ایک ایسی قوم جس میں منطقی اور استدلالی صلاحیتیں پہلے سے ہی موجود تھیں ایک قدم اور آگے بڑھی، جادہ بہ جادہ، منزل بہ منزل، اس کا راہوار جستجو پہاڑوں پر چڑھتا ہوا، سینۂ دریا کو چیرتا ہوا، فضاؤں میں پیرتا ہوا کہیں سے کہیں پہونچ گیا، اس وقت شہری ریاست کے سیاسی اور سماجی تقاضے ایسے تھے کہ ہر شہری سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ ریاست کے جملہ کاروبار میں حصہ لے گا، دشمن کے مقابلے میں اس کی تلوار بے نیام ہوگی، میدان جنگ میں وہ اپنی استقامت اور مردانگی کا پھریرا لہراتا نظر آئے گا، مزید براں ایتھنز کا شہری اسمبلی میں بیٹھ کر مقامی بیرونی سیاسی اور مالی و اقتصادی مسائل پر ووٹ دینا اپنا حق سمجھتا تھا۔ اور یہ سچ ہے کہ شہری ریاست اور اس کے نظم و نسق میں اسے بولنے کا حق تھا وہ مجلس قضا کا ممبر بن سکتا تھا، ریاست کے بڑے سے بڑے عہدے کا آرزومند ہوتا تھا کیونکہ وہ سماج کا ایک عضو معطل نہیں ایک فعال رکن تھا اور اپنی استعداد اور صلاحیتوں کے مطابق سماجی خدمات کو بھی اپنا فرض تصور کرتا تھا، گھریلو فرائض سے قطع نظر اپنے خاندان اور اپنی حکومت سے وابستگی اور ان کی خدمات بھی اس پر ایک فرض عظیم کا درجہ رکھتی تھیں۔

فاتح قوم، مفتوح کے خون سے اپنے باغ کو لالہ زار بناتی ہے، یونانی بھی سیاسی اور سماجی ترقی کی اس رو میں وہی کچھ کرتے رہے۔ غلاموں اور محنت کشوں کی زندگی پایاں کار انہیں آقاؤں کے ہاتھوں میں ہوتی تھی اور ان سے ہر قسم کی جسمانی محنت لینا جائز تصور کیا جاتا تھا، لیکن باوجود غلاموں اور مفتوحہ ممالک کے مزدوروں کی کثرت کے یونانی کسی خاص پیشے سے ضرور متعلق ہوتے تھے۔ اور اپنی زندگی کو عیش امروز و تماشۂ فردا کا مامن نہیں بناتے تھے، بلکہ ان کے پیش نظر شخصیت کی تعمیر و تشکیل کا ایک اہم فرض تھا جس سے عہدہ برا ہونا ناممکن نہ سہی دشوار ضرور تھا، ان کا نظریۂ شخصیت بہت وسیع تھا، اس میں انسانی شخصیت کے ان تمام مظاہر کو اجاگر کرنا ضروری سمجھا گیا جو کسی شخص کو سماج کا ایک مفید رکن بنا سکیں، آج اس ترقی یافتہ دور میں شخصیت کے مفہوم کو زیادہ سے زیادہ وسعت دینے کی کوشش کی جا رہی ہے تعمیر کردار اور شخصیت کی ترقی کو تعلیم کا لازمی جزو قرار دے کر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ تعلیمی نظریات میں دور جدید ایک عظیم انقلاب لانے میں کامیاب ہوا، لیکن یونانیوں کا نظریۂ شخصیت آج بھی اپنے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے ان سب پر

بھاری ہے۔ جب تک کسی فرد کی جسمانی، اخلاقی، وجدانی اور ذہنی صلاحیتوں میں باہم توازن اور ہم آہنگی پیدا نہ ہو تو یہ کہنا کہ اس نے اپنی شخصیت کی تکمیل کر لی ہو بے وزن ہوگا۔ شخصیت کی تکمیل ان کی مطابقت اور ہم آہنگی سے وابستہ ہوتی ہے، اگر ان میں کسی ایک صلاحیت کی تربیت بطریق احسن نہ ہو سکی تو یہ توازن اور یہ ہم آہنگی قائم نہیں رہ سکتی، یہی نہیں کہ یہ جملہ خوبیاں کسی ایک شخص میں مجتمع ہو کر اس کی شخصیت میں مدغم ہو جائیں، بلکہ ان میں سے ہر ایک کو اپنی مابہ الامتیاز خصوصیتوں کو قائم رکھنا بھی اتنا ہی ضروری ہوتا ہے، تاکہ وہ الگ الگ پہچانی بھی جا سکیں اور مجموعی طور پر وہ کسی فرد کے کردار کا مظہر بن سکیں۔ چنانچہ پریکلیز لکھتا ہے کہ اہل ایتھنز کو حسن پرستی کے ساتھ ساتھ سادگی سے بھی محبت تھی، اور ان کی ذہنی شائستگی اور بہادری میں ایک لابدی جوڑ تھا، یہی وجہ ہے کہ ایتھنز میں ذہنی اور جسمانی خوبیوں کو پہلو بہ پہلو پنپنے کا موقع ملا، بہادری سے یہ مفہوم ہرگز مراد نہیں تھا کہ اپنی جسمانی توانائی کے بل بوتے پر کمزوروں پر ظلم و جبر کیا جائے یا ان کی تادیب کی جائے، بلکہ جب اس قوت و توانائی کے ساتھ ساتھ ذہنی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع ملے گا تو ایک ایسا توازن اور ایک ایسی ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی کہ دونوں کے ارتباط سے سماج میں کسی ناخوشگوار صورت حال کے پیدا ہونے کا امکان نہیں ہوگا، اسی طرح ذہنی صلاحیتوں کی تہذیب و تربیت سے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ اس کی نگاہیں صرف عقلی اور ذہنی دلچسپیوں پر ہی مرکوز رہیں اور ماحول اور سماج کے تقاضوں سے بالکل آنکھیں موند لی جائیں، ذہنی صلاحیتوں کی تادیب کے ساتھ اس میں ذوق و شوق، عمدہ مذاق، وسعت خیال، بالغ نظری موزونیت کے احساس کا پیدا ہونا ضروری ہوتا ہے، ان دونوں نظریات کی تشریح سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ متوازن جسم میں متوازن ذہن کا ہونا کتنا ضروری ہے، اور اگر ان دونوں کے احاطۂ کار میں تصادم نہ ہو تو زندگی کی الجھنوں میں بہت کچھ کمی ہو جاتی ہے۔

اسکول بالکل نجی ادارے ہوتے تھے اور علمائے عصر ان اداروں کے چلانے کے ذمہ دار حکومت صرف جسمانی تربیت کی تعلیم کا بندوبست کرتی تھی، اور یہ زمانہ جس میں نوجوانوں کی جسمانی تربیت کی طرف بالخصوص توجہ دی جاتی تھی، عام طور پر سولہ اور بیس سال کی عمر کا درمیانی زمانہ ہوتا

ہوتا تھا۔ آزاد یونانی خاندان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مدرسی زندگی کا آغاز سات سال کی عمر سے ہوتا تھا اور وہ کم و بیش آٹھ یا نو سال تک مدرسہ میں مختلف علوم و فنون جسمانی تربیت اور اخلاق کی تعلیم پاتے رہتے، ایتھنز کے بچے بیک وقت دو قسم کے مدارس میں تعلیم پاتے تھے، ایک مدرسۂ ورزش (جسمانی تربیت) دوسرا مدرسۂ موسیقی، موسیقی سے مراد صرف گانا بجانا نہیں تھا، اس میں قراءت، تحریر اور دیگر ادبی مشاغل بھی شامل ہوتے تھے، اس زمانے میں طلبا، ایک معلم کی زیر نگرانی تعلیم پاتے تھے، مدارس نجی ہوتے تھے اور اساتذہ فن کسی پبلک عمارت میں بیٹھ کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیتے تھے سولہ سال کی عمر میں طلبا ورزش گاہ اور موسیقی کے اداروں کو خیرباد کہہ کر تربیت جسمانی پر اپنی تمام تر توجہات کو مرکوز کر دیتے تھے، اور پھر پبلک ورزش گاہوں میں حکومت کا متعین افسر انہیں مختلف ورزشوں کی مشق کراتا تھا، اور حالانکہ اس عہد میں نوجوان طلبا، کو کافی آزادی نصیب ہوتی تھی، لیکن پھر بھی ان کے اخلاق کی طرف خاص توجہ رکھی جاتی تھی، تاکہ آزادی کے ساتھ ساتھ ان میں ایسے اخلاقی عیوب نہ پیدا ہو جائیں کہ ان کی تعلیم ان کی زندگی کو سنوارنے کی بجائے ان کے لئے ایک مصیبت بن جائے۔

ورزش گاہ | اسپارٹا کی طرح ایتھنز میں بھی تربیت جسمانی اور تادیب اخلاق تعلیم کا سب سے بڑا مقصد اور یونانی زندگی کا حقیقی نصب العین متصور ہوتے تھے، جذبات پر قابو پانا، عقل و خرد کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا، قول و فعل کا ہم آہنگ ہونا، کردار اور گفتار میں یکسانیت کا ہونا، افکار و اعمال کا ایک دوسرے سے مطابقت کرنا یونانی تعلیم کا حقیقی مطمح نظر تھا اور ان بلند مقاصد کے حصول کا ذریعہ ورزش (جسمانی تربیت گاہیں) تھی، جہاں نوجوانوں کو جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت کا بھی درس ملتا تھا، ان ورزش گاہوں میں بچوں کے لئے کھیل کود اور جسمانی تربیت کے ضروری لوازمات کا مناسب انتظام ہوتا تھا، کھیلوں میں اگر بے سلیقگی ہو تو کھیل کا لطف جاتا رہتا تھا۔ اس سے اخلاقی درس لینا تو ایک دور از کار خیال ہوتا ہے۔ ایتھنز میں چونکہ ان کھیلوں کا ایک مقصد اخلاقی اور سماجی آداب کی تربیت بھی تھا، اس لئے اس میں بے سلیقگی یا بے قرینگی کا شائبہ بھی موجود نہیں، دوڑنا

کشتی لڑنا، تیراکی میں حصہ لینا، تنکار کھیلنا۔ یہ سب تربیتِ جسمانی کے مختلف مدارج تھے۔ اور اسپارٹا سے کہیں زیادہ متناسب اور متوازن انداز میں یہ ماحول اور یہ ادارے ان اوصاف کی تربیت میں حصہ لیتے تھے۔ آجکل ہمارے اپنے اداروں میں بچوں کی تربیت جسمانی کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے، اور اگر کسی ادارے میں اس کی طرف توجہ بھی دی جاتی ہے تو وہ محض نام و نمود اور نمائش کے لئے۔ اس کی تہ میں بچوں کی جسمانی نشو و نما کا جذبہ کار فرما نہیں ہوتا، بلکہ جلسوں میں اور کسی بڑے آدمی کی تشریف آوری کے موقع پر ان کی جا و بے جا نمائش اس کا سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے، اس کے برعکس ایتھنز میں چند منتخب کھلاڑی یا چند توانا و تندرست بچوں کو دوسروں کی تفریح طبع کا سامان نہیں بنایا جاتا تھا اور ان کی کامیابی کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ مختلف کھیلوں میں محض بازی جیتنے کے لئے حصہ لیں۔ بلکہ ان کی سب سے بڑی کامیابی ان کے لچیلے جسم اور ان کے طریقہائے کار کی تمکنت میں ہے، اگر ان میں نظم و ضبط ہو۔ ان کے کردار متنوع اور ان کے ذہن متوازن ہوں تو یہی ان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

اسکولوں میں جن کھیلوں کا بچوں کے لئے اہتمام ہوتا ہے ان میں ایک مخصوص نصاب ہوتا تھا جسے (PENTATHLON) کہتے تھے۔ اور یہ نصاب کودنے دوڑنے، نیزہ بازی قرص اندازی اور کشتی لڑنے پر مشتمل تھا، کشتی کے ساتھ ساتھ مکہ بازی بھی ہوتی تھی، لیکن دونوں ہاتھ کھلے ہوتے تھے۔ یہ اور اس قسم کی دوسری ورزشوں کے ذریعہ نوجوانوں کو تندرست اور مضبوط و توانا بنایا جاتا تھا۔ اور جب وہ ان دشوار گذار مراحل کو بخیر و خوبی طے کر لیتے تھے تو انہیں ایتھنز کی شہری زندگی میں حصہ لینے کا حق ہوتا تھا۔

مدرسۂ موسیقی | موسیقی یونانی تعلیم کا دوسرا جزو ہے، لیکن یہاں اس کا مفہوم محدود نہیں، بلکہ وسیع اور غیر محدود ہے، موسیقی میں شعر، ڈراما، تاریخ، خطابت، موسیقی (اپنے لغوی معنی میں) اور دوسرے علوم شامل سمجھے جاتے تھے۔ ورزش اور موسیقی دونوں کو انسانی جسم کی تربیت اور تہذیب نفس کے لئے بہت ضروری سمجھا جاتا تھا، ورزش جسم کی تربیت کے لئے اور موسیقی

روح کی بالیدگی کے لئے ضروری ہوتی تھی۔

تعلیم میں قرأت، تحریر اور ادبی پہلو کو اجاگر کرنے کا کام بھی مدرسۂ موسیقی کے سپرد ہوتا تھا ان مدارس میں لکھنا پڑھنا کم و بیش ۵۰۰ ق م میں شروع ہوگیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی ہومر کی رزمیہ نظمیں بچوں کو زبانی یاد کرائی جاتی تھیں اور ایلیڈ اور اوڈیسی (ILIAD AND ODYSSEY) یونانی زندگی کی تہذیب و تادیب ان کے اخلاقی بناؤ اور ان کی ذہنی تراش خراش میں برابر اثر انداز ہوتی رہیں، یہ نظمیں یونانیوں کے جذبات کو مرتعش کرتی تھیں، ان میں جوش و خروش عزم و ہمت اور ولولہ پیدا کرتی تھیں اور جب ان ادب پاروں کو نصاب کا جزو بنا دیا گیا تو مختلف علوم و فنون کی ترقی و توسیع میں بھی انہوں نے نمایاں حصہ لیا، ان کتابوں میں بعض ایسے اجزا بھی شامل تھے جنہیں اخلاقی اعتبار سے درس و تدریس سے خارج کر دینا ہی مفید تھا، یہی وجہ ہے کہ غالباً آگے چل کر بعض فلسفیوں نے شعراء کے کلام کو نصاب میں داخل کرنے کی کھلی مخالفت کی۔ فی الحقیقت یہ ایک شدت پسند نظریہ ہے، شعراء کے کلام زندگی کی دھڑکنوں سے یکسر خالی نہیں ہوتے ان میں سوز و ساز بھی ہوتا ہے اور اخلاقی پابندی بھی، وہ بعض اوقات ثریا سے پرے جا کر اپنی استقامت کا جھنڈا لہراتے ہیں، اور یہ کہنا کہ ان کے کلام میں وقت اور سماج کے تقاضوں کا احترام نہیں کیا جاتا، غلط فہمی پر مبنی ہے، چنانچہ ان سے اس طرح احتراز کرنا کچھ غیر مناسب سی بات معلوم ہوتی ہے، ایتھنز میں قرأت پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا تھا اور چونکہ اس زمانے میں الفاظ مسلسل لکھے جاتے تھے اس لئے تلفظ اور الفاظ کے ہجا کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی۔

اسپارٹا اور ایتھنز کے نظامہائے تعلیم کا موازنہ اسپارٹا اور ایتھنز کے تعلیمی نظام میں بہت سی باتیں مشترک سی معلوم ہوں گی۔ لیکن دونوں نظامہائے تعلیم میں بنیادی اختلاف موجود ہے بظاہر دونوں کا ڈھانچہ ایک سا معلوم ہوتا ہے لیکن دونوں کی روح ایک نہیں ہے۔ اسپارٹا میں بچوں کی اخلاقی اور جسمانی تربیت کو ہی تعلیم کا سب سے اہم مقصد سمجھا جاتا تھا۔ توانا اور تندرست جسم اور سپاہیانہ اوصاف پیدا کرنا نظری نہیں عملی تھا، ان دنوں بچوں کی جسمانی اور روحانی صحت کو

تعلیم کا مقصد قرار دیا گیا ہے۔ مگر ان دل خوش کن نظریات کی عملی توضیح کی جھلک ابھی ہمارے اداروں میں بہت کم نظر آتی ہے۔ اور اگر کہیں اس کی جلوہ گری کا اہتمام کیا جاتا ہے تو مقصد صرف ظاہری رنگ و روغن کی نمائش ہوتی ہے، اسپارٹا میں تعلیم کی تنظیم و تربیت حکومت کے زیر اثر اور حکومت کے مخصوص نظریات کے پیش نظر کی جاتی تھی، ایتھنز میں جہاں حکومت کے اثر و اقتدار کا پرتو جھلکتا ہے تو اس میں انفرادی آزادی کا بھی سامان ملتا ہے۔ ایتھنز میں ہر شہری اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے بعد اپنے تفریحی اوقات میں اپنے مخصوص مشاغل میں حصہ لے سکتا تھا، مضبوط اور توانا جنگ و جدل میں عزم و ہمت رکھنے والا۔ سماجی تعلقات کو قائم رکھنے والا، انفرادی اور اجتماعی فرائض کو پورا کرنے والا، احساسات اور وجدانی تاثرات کا حامل انسان صرف ایتھنز کے ماحول میں ہی تربیت پا سکتا تھا، اسپارٹا کا ماحول اور اس کی فضا تعلیم کے اس اونچے معیار کے قائم کرنے کے لئے سازگار نہیں تھی، زندگی کی الجھنیں اور سیاسی انقلابات نے ان میں احساس و وجدان کے پنپنے کا موقع ہی نہیں دیا اور یہی وہ مقام ہے جہاں دونوں نظریات کے دھارے الگ الگ بہتے نظر آتے ہیں۔ اسپارٹا میں جسمانی اور اخلاقی تعلیم کے بعد دوسرے جبلی میلانات کی طرف مطلق توجہ نہیں دی جاتی تھی، ایتھنز میں بچے کی تربیت میں نفسیاتی عوامل کو بھی نگاہ میں رکھا جاتا تھا، اسپارٹا کا آمرانہ ماحول اس جمہوری اور سماجی فضا سے بالکل مختلف تھا، ایتھنز میں گھریلو ماحول اور خاندان کو بچے کی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار قرار دیا جاتا تھا کیونکہ اس کی تعلیم کی سب سے نمایاں خوبی شخصیت کی تربیت بلکہ شخصیت کی تکمیل تھی۔

موسیقی کی تعلیم کے اخلاقی مقاصد کے لئے پرٹا گورث نے لکھا ہے۔ "اساتذۂ فن موسیقی کے زیر و بم اور اس کی ہموار اور متوازن دھن کو بچوں کی روح سے روشناس کر دیتے ہیں، تاکہ ان کی شخصیتیں زیادہ ہمہ گیر متنوع اور متوازن ہو سکیں اور اس طرح اپنے قول و فعل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے کام آ سکیں، انسان کو اپنی پوری زندگی میں تنوع اور توازن کی ضرورت ہوتی ہے۔" اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حسن سیرت یونانی تعلیم کا سب سے بڑا طرۂ امتیاز تھا۔

یونانی تعلیم کا مقصد یونانی بچے کے پیشِ نظر زندگی کا ایک مخصوص نمونہ تھا، وہ اسی کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کرتا۔ اس طرح تعلیم کا ایک جانا بوجھا مقصد اور ایک متعین نصب العین تھا، انہیں اصولوں کے مطابق بچہ اپنی سیرت اور اپنے کردار کی تربیت میں معروف رہتا۔ ان دنوں تعلیم میں جو طریق کار ہمارے یہاں رائج ہے کچھ رسمی اور بے روح سا ہے، نہ اس میں زندگی کی حرارت ہے اور نہ آگے بڑھنے کا ولولہ۔ یونانیوں کی تعلیم رسمی اور مُردہ مُردہ سی نہیں تھی، بلکہ اس میں زندگی کی ایک ایسی روح کارفرما تھی جو سوز و گداز اور مسرت و ابتہاج سے بھرپور تھی۔ اس میں بچے کو اظہارِ نفس اور اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے کا موقع بھی ملتا تھا اور وہ اپنے معلم کے کردار، اس کے طور طریقے اور معاشرتی چلن کو بھی اپنانے میں کامیاب ہوتا تھا۔ ابتدائی مدارج میں بچوں کے کردار کو ایک سانچے میں ڈھالنے کے لئے معلمین مقتدرانہ انداز میں اور حتمی طور پر انہیں ایک مخصوص راہ پر چلنے کے لئے مجبور کرتے تھے۔ کیونکہ یونانی مدارس کا اہم مقصد تربیتِ کردار تھا، اسکول میں بچہ کو دوڑنا، کشتی لڑنا، اشعار یاد رکھنا، پڑھنا، خطابت کے جوہر دکھانا۔ مباحثوں اور مناظروں میں شرکت کرنا اور اس قسم کے دوسرے خواص کی تربیت میں مشغول رہنا پڑتا تھا۔ اس طریق کار کو ہم تعلم بالعمل کہہ سکتے ہیں، تعلیم و تربیت کے جملہ مدارج کی ترقی کا انحصار کچھ نہ کچھ کرتے رہنے پر ہوتا ہے، عادات و اطوار اور افکار و خیالات میں پختگی پیدا کرنے کی یہی ایک صورت ہے، اور جب مسلسل مدت مدید تک بچہ زندگی کی ایک ڈگر پر چلنا اپنا شعار بنالے گا تو اس ماحول کے اثرات کا اس کی عادات میں نفوذ کر جانا یقینی ہو جاتا ہے، اور جب ان تربیتی مشاغل کے ذریعے بچے میں ایک مخصوص اور متوقع عادت پیدا ہو جاتی ہے، تو پھر اُسے درس و تدریس اور ہدایات سے استفادہ کرنے کا موقع دیا جاتا ہے، تاکہ وہ تربیت جو عصائے بزرگی کا کرشمہ سمجھی جاتی ہے، اس میں عقل و دانش کی صیقل بھی ہو سکے، لیکن یونانیوں کا نظریہ اس سے کچھ مختلف تھا، عمل کو علم پر مقدم سمجھا جاتا تھا۔ "عمل سے علم اور بسیط ہوتا ہے، اور تعلیم اس عملی عادت کی تخلیق و تربیت کا نام ہے" ۔

ارسطو نے اس کی توضیح حسب ذیل الفاظ میں کی ہے :—

"اول تو یہ کہ ہر شخص ایک انسان پیدا ہوا حیوان نہیں، دوم یہ کہ اس کی سرشت

میں کچھ جسمانی اور روحانی خصوصیات بھی ہوں، لیکن بعض خصوصیات
کا پیدائش کے وقت ہونا ضروری نہیں، کیونکہ عادت انہیں آگے چل کر
تبدیل کر دیتی ہے، اور کچھ فطری خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جو اپنی افتادِ
طبع اور عادت کے ذریعہ اچھائی یا برائی کی طرف مائل ہو جاتی ہیں، بہت سے
جانور ایک فطری زندگی بسر کرتے ہیں، حالانکہ ان میں سے بعض عادات
سے بھی متاثر ہوتے ہیں، لیکن ان سب کے علاوہ انسان کے پاس عقل
ہوتی ہے اور یہ صرف انسان ہی کا حصّہ ہے، اس لئے فطرت، عادت
اور عقل کا ایک دوسرے سے متوازن اور ہم آہنگ ہونا ضروری ہے (کیونکہ
ان میں ہمیشہ ہم آہنگی نہیں ہوتی) اگر عقل اسے کام کرنے پر آمادہ کر لیتی
ہے تو انسان عادت اور نیچر کے خلاف بہت سی باتیں کرتا ہے، ہم اس
سے پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ کونسی عادات ایسی ہیں جنہیں واضعینِ
قانون بآسانی اپنے انداز میں ڈھال سکتے ہیں، اس کے علاوہ باقی سب
تعلیم کا کام ہے، ہم کچھ چیزیں عادتاً سیکھتے ہیں اور کچھ بذریعہ درس و تدریس۔

عہدِ پریکلیز پرانی یونانی تعلیم پانچویں صدی مسیحی میں ایک انقلاب لانے میں کامیاب
ہوئی، اس زمانے میں یونان میں انفرادی اور اجتماعی ذہنی اور اخلاقی ترقی کے نادر نمونے
ملتے ہیں، سیاست میں ان کی فراست، میدانِ جنگ میں ان کی شجاعت، علم و حکمت میں ان کی
ذہانت، غرض ہر شعبۂ زندگی میں کامرانی ان کے قدم چومتی نظر آتی ہے، اس عہد کو عہدِ پریکلیز
کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس زمانے میں اور اس کے ماقبل و بعد کے زمانوں میں یونانی
تہذیب اپنی ترقی کے نصف النہار پر تھی اور دنیا میں ان کے علم و ہنر، شان و شوکت، سیاست و
تدبر اور ہمت و شجاعت کا سکّہ رواں تھا، گویا ایتھنز دنیا کے لئے ایک نقطۂ جاذب اثر تھا۔
جہاں فہم و فراست اور تمدن و معاشرت کی ندیاں بہتی تھیں، یہی وہ عہد ہے جب ایک نئے

ماحول اور ایک نئے معاشرے کی بنیاد پڑی۔ پرانی تعلیم نے حالانکہ ان کے عزائم اور انکے کارناموں
کی بنیادوں کو استوار کیا لیکن اب یہ تعلیم وقت اور زمانے کے رجحانات کا ساتھ دینے کے لئے ناکافی
تھی، اس ترقی یافتہ دور میں زندگی کے تقاضے اور اس کی ضروریات اس قدر بڑھ گئیں کہ پرانی تعلیم
انہیں پورا کرتی نظر نہیں آتی، چنانچہ نظریات میں ایک عظیم تغیر واقع ہوا، اس سے پہلے تعلیم کا
سب سے اہم مقصد حکومت اور ملک کی خدمت کے لئے افراد کو تیار کرنا تھا، اور اسی مقصد کے پیش نظر
طلباء کو تربیت دی جاتی تھی، اب اس مرکزی اور اجتماعی نقطہ نگاہ کے ساتھ ساتھ طلباء کی انفرادیت
اور ان کی شخصیتوں کی تربیت کو تعلیم کا مقصد بنالیا گیا، اس نظری اور فکری بلکہ عملی تبدیلی کی سب سے
بڑی وجہ، سیاسی، ادبی، سماجی اور اقتصادی تقاضے تھے، یعنی جب ہر شعبہ زندگی میں ایک انقلاب
آیا اور نظام کہنہ کی بندشیں ایک ایک کرکے ٹوٹنے لگیں تو ان تقاضوں کے پیش نظر ایک نئے نظام
تعلیم اور نئے نظام حیات کی طرح ڈالی گئی۔ اسوقت جو رجحانات منظر عام پر آرہے تھے اور جو باتیں
یونانیوں کے ذہن ودماغ میں ایک جوش اور ولولہ پیدا کررہی تھیں ان کے سامنے دو اہم
مقاصد تھے۔ افکار ونظریات اور افعال وکردار میں انفرادیت کو قائم رکھنے کے لئے اجتماعی بندشوں
سے نجات حاصل کرنا، تاکہ سیاسی میدان میں وہ اپنی جودتِ طبع کے جوہر دکھا سکیں، اس کے علاوہ
ایسی تعلیم وتربیت کا تقاضا ہونے لگا کہ اُس ترقی یافتہ ماحول میں ہر فرد اپنی صلاحیتوں کے
مطابق آگے بڑھنے کا گر سیکھ سکے، اور خود زیادہ سے زیادہ ترقی کرکے اپنی زندگی میں ایک نئی
راہ پیدا کرسکے، گویا اب مطالبہ صلاحیت اور لیاقت کا تھا۔ تاکہ مختلف سماجی۔ سیاسی، معاشی، علمی
اور مابعد الطبیعاتی مسائل کو سلجھانے کے لئے مباحثے کئے جائیں اور بازاروں میں یا دوسرے
عوامی اجتماعات میں یا قانونی عدالتوں میں ان مسائل پر بحث وتمحیص کے بعد ایک راستہ متعین
کیا جا سکے، اور وہ مختلف سفارت خانوں اور دوسرے سیاسی مشنوں میں کام کرسکیں۔

سوفسطائی:- | لیکن ایتھنز میں اونچی ذہنی اقدار کی تربیت کا کوئی باقاعدہ انتظام نہیں تھا اور
شہری زندگی سے قطعِ نظر انفرادی عزائم کی طرف کم توجہ دی جاتی تھی۔ ان تقاضوں اور ان ضروریات

کے پیش نظر اساتذہ کا ایک نیا گروہ منظرِ عام پر آیا، جسے بعد میں سوفسطائی (SOPHISTS) گروہ سے تعبیر کیا گیا، سوفسطائیوں کے متعلق کبھی کوئی عمدہ رائے قائم نہیں کی گئی، بلکہ انہیں یونانی افکار و خیالات کے مربوط اور متوازن طریق کار میں روڑا اٹکانے والا متصور کیا گیا۔ "سوفسطائی مکار اور علم و ادب کا جھوٹا مدعی ہوتا تھا، ایک ایسا شخص جو حصولِ زر کی خاطر اپنے مبلغ علم کو فریب کاری اور جُل دینے کے لئے استعمال کرتا تھا۔"

تعلیمی اعتبار سے سوفسطائی یونانی معلم تھے، لیکن ان کے لئے ایتھنز کا باشندہ ہونا ضروری نہیں تھا، ان لوگوں نے یونان کی موجودہ تعلیم کے نقائص کو دیکھا اور اس کا تجزیہ کیا اور چونکہ یہ خود ملک کے طول و عرض میں سیر و سیاحت اور تعلیمی دورے پر جاتے رہتے تھے اور اس طرح علم و عرفان کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ ان کے دل و دماغ میں محفوظ ہوتا تھا۔ زبان و ادب میں بھی انہیں کافی مہارت ہوتی تھی، وقت کے سیاسی سماجی اور عمرانی تقاضوں سے انہیں کماحقہٗ واقفیت ہوتی تھی، اور اس کو اپنے علم کی اساس بنا کر وہ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھتے تھے، اپنی اس ذہانت اور طباعی اور اپنی اس اہلیت کی وجہ سے کہ وہ علوم و فنون کو بطریق احسن پڑھا سکتے تھے، ایتھنز کے سماج میں ان کی قدر و منزلت بڑھتی گئی، ان میں سے بعض نے ٹھوس علمی کام کیا اور ایسا تعلیمی نظام پیش کیا جس کی بدولت لوگوں کے تنگ و تاریک گوشوں میں علم و حکمت کے چراغ روشن کئے جا سکے لیکن ان میں بعض ایسے بھی تھے جو محض جلبِ منفعت کی خاطر علم کو سطحی اور غیر متنوع بناتے رہے محض چھوٹی موٹی باتوں پر اپنے اسباق کو ختم کر دیتے، چند مخصوص تعریفیں اور وہ بھی چند موضوعات پر ان کا کل سرمایہ ہوتی تھیں اور وہ اسی پر اپنی تدریس کی عالی شان عمارت تعمیر کرتے تھے۔

بہرصورت سوفسطائی معلموں کی قدامت پرستی نے انہیں بہت جلد لوگوں کی نگاہوں میں متنفر بنا دیا، بالخصوص ان کا علم کا ٹھیکے دار بن کر اپنے آپ کو عقل و دانش کا آفتاب تصور کرنا اور دوسرے درس و تدریس کا معاوضہ لینا، پھر بھی سوفسطائیوں نے علم و فن کو ترقی دی، خطابت اور مناظرہ تو ان کا

اوڑھنا بچھونا تھا، چنانچہ بعض داعیانِ فن کا تو یہ دعویٰ تھا کہ وہ طلبا میں ایسی خصوصیات پیدا کر سکتے ہیں کہ وہ موضوع کی موافقت اور مخالفت میں اسی جوش و خروش اور اسی گھما گھمی سے بول سکتے ہیں، انہوں نے مظاہر قدرت، علوم و فنون، سماج اور ہر چھوٹے بڑے موضوع کے متعلق ضروری اطلاعات بہم پہونچا لیں، ان کا طریق کار استدلالی تھا یعنی عقل و خرد کی روشنی میں وہ ایک مسئلے کو زیر بحث لاتے، اسی کی اچھائیوں اور برائیوں کا تجزیہ کرتے اور اس کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچتے، قدیم یونانی مذاق اور بالعموم عوام کے عقائد و رجحانات اس سے کچھ مختلف تھے، اپنی پرانی روش کو چھوڑ کر نئے راستے کو اختیار کرنا عمومی حیثیت سے مشکل ہوتا ہے اور جب ان میں سے بعض غیر ذمہ دار حضرات نے قدیم ادارہ ہائے خیال پرانے رسم و رواج اور پرانے یونانی معتقدات کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا تو اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ اس پورے گروہ کے خلاف کچھ نفرت کا جذبہ پیدا ہونے لگا، لیکن اگر غور کیا جائے اور سوفسطائی طریق تعلیم کا جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ ان کی تعلیمات کا یہی مقصد نہ تھا کہ وہ پرانے عقائد کے خلاف صف آرا ہو جائیں، بلکہ انہوں نے تو تمام اخلاقی اور سماجی تقاضوں پر سیر حاصل بحث کی اور اس سے کچھ نتائج مرتب کئے، البتہ یہ ضرور تھا کہ ان نتائج کے استدلال میں انہوں نے مذہبی اور سماجی نقطۂ نگاہ سے بحث نہیں کی، بلکہ خالص عقلی اعتبار سے ان کا تجزیہ کیا۔ اس طریق کار کو یونانیوں نے اخلاق کے منافی جانا اور انہیں اس لئے اس قدر مطعون کیا گیا۔ ان کی اخلاقی تعلیمات بھی زیادہ تر شخصیت کی تکمیل اور اس کی انفرادیت پر زور دیتی تھیں، معلمین کے ایک گروہ کی حیثیت سے انہوں نے کبھی مجرد اخلاقی باتوں کی تعلیم نہیں دی، بلکہ اخلاق و کردار کو سنوارنے کی کوشش کی اور پھر ان سب کا کوئی ایک بنیادی نقطۂ خیال بھی نہیں تھا کہ اس کی ترویج و اشاعت میں مجموعی حیثیت سے وہ اس قدر آگے نکل جاتے۔ بقول سقراط "سوفسطائی معلم نوجوانوں کو سوچنے، بولنے اور عمل کرنے کا درس دیتے تھے"۔

مدرسین کی ڈائری

—— نذیر احمد آثم

مسلسل ۲

مدرسین کی ڈائری کی یہ دوسری قسط ہے، پہلی قسط میں روزانہ اور ہفتہ وار مروجہ ڈائری کے نمونے پیش کرنے کے بعد اس کے تحریر کرنے کے اوقات اس کی ضرورت اور مُدعا وغیرہ پر بحث کی گئی تھی، نیز ان امور کو بے نقاب کیا گیا تھا جن کی وجہ سے ہیڈ ماسٹر صاحبان مروجہ ڈائریاں لکھنے اور لکھنے پر مدرسین کو مجبور کرتے ہیں۔

اس کے بعد بنیادی اسباق کی نوٹ بک پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا جن کا راقم الحروف حامی ہے، اس کے لکھنے کے اوقات، طرز تحریر، قابل تحریر ضروری باتیں اور تاریخ لکھنے کے مسئلے پر سیر حاصل تبصرہ کرنے کے بعد اُن سطحی اور غیر سطحی اعتراضات کے جوابات بھی دیئے گئے تھے، جو اکثر حضرات بغیر کسی غور و فکر کے ایک نئی چیز پر کیا کرتے ہیں، اسی ضمن میں ان مشکلات کے حل بھی پیش کئے گئے تھے جو اس سلسلے میں پیش آنی ضروری ہیں۔

ان تمام مسائل پر پوری طرح روشنی ڈالنے کے بعد جماعت دہم کے جغرافیے کے ایک سبق کی ڈائری بطور نمونہ پیش کی گئی تھی جس کا عنوان پنجاب کی نہریں تھا، یہ سبق چار درسوں میں تقسیم تھا۔ اور چوتھا سبق نذر ناظرین ہوا تھا۔

اس قسط میں جماعت ہشتم کو اُردو پڑھانے کے متعلق دو درس، جماعت ششم کو حساب کا نیا قاعدہ سمجھانے کے متعلق ایک درس اور جماعت اول کو (ا) کا طریق الصوت سکھانے کے متعلق ایک درس پیش کیا جاتا ہے۔

جماعت ہشتم — مضمون، اردو پڑھانا — سُرخی پودے کی پیدائش

پہلا درس - عملی کام

تاریخ	نفسِ مضمون و طریقۂ تعلیم	[illegible]
١٥ ٤/٥١	پودا اُگنے کا مشاہدہ (مطالعہ قدرت) سبق سے چند روز پیشتر طلبا کی مدد سے مٹر یا چنے کے دانے چند پیالوں میں گیلی مٹی اور ریت میں دبا کر رکھے جائیں۔ ان پر روزانہ پانی چھڑکا جائے تاکہ بیجوں سے ننھے پودے پھوٹ پڑیں۔ (۱) بیج کا مشاہدہ بھیگے ہوئے مٹر کو رومال سے صاف کر کے آہستہ آہستہ دبایا جائے تو ایک باریک سوراخ میں سے ذرا سا پانی نکلتا دکھائی دے گا۔ کیوں؟ مٹر کے بیج پر جھلی جیسے چھلکے کا کیا فائدہ ہے؟ چھلکا اتار کر ذیل کی باتوں کا مشاہدہ کراؤ۔ بیج کے دو حصے یعنی دال دالوں کے درمیان ننھا سا پودا (پودے کا بچہ) پیالوں کے دانے بچوں کو مشاہدے کے لئے دیئے جائیں اور ذیل کی باتیں بذریعہ مشاہدہ اخذ کرائی جائیں۔ بیج کا پھول جانا۔ ننھے پودے کے ایک حصے کا لمبا ہو جانا۔ نچلی طرف سے چھلکے کا سوراخ میں سے گذر کر زمین میں چلا جانا اور جڑ بننا۔ دوسری طرف اس پھانس کا چھلکے کو توڑ کر باہر نکلنا۔ زمین کے اندر ہی اندر بڑھنا۔ زمین سے سر نکالنا اور پتوں کا پھوٹنا شروع۔ شروع میں خوراک حاصل کرنے کا طریقہ (دالیں ننھے پودے کی خوراک کا ذخیرہ ہیں) دالوں میں خوراک کے ذخیرے کا ختم ہونا۔ جڑوں کا	

تاریخ	نفسِ مضمون وطریقۂ تعلیم	حاشیہ برائے مزید معلومات
	مضبوط ہوکر زمین سے خوراک چوسنا۔ جڑوں کے بالوں کا مشاہدہ اور ان کا فائدہ۔ پتوں کا ہوا سے خوراک حاصل کرنا۔ **عملی کام** (۱) بچوں کو گملوں یا کیاریوں میں پودے بونے کی ترغیب دینا۔ (ب) ننھے پودے کے بچپن کی ڈرائنگ کرنا۔ یا ننھے پودے کو البم میں چسپاں کرنا۔ **انشاپردازی** (۱) بذریعہ سوالات پودے کی زندگی کے متعلق تقریری جوابات حاصل کرنا۔ مثلاً بیج کے کس کس حصے سے کون کونسا حصہ بنتا ہے چھلکے اور دال کا کیا فائدہ ہے۔ جڑ پہلے نکلتی ہے یا پتے، زمین کے اندر پتوں کا کیا رنگ ہوتا ہے، ننھا پودا اپنی خوراک کس طرح حاصل کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ (ب) انشاپردازی تحریری۔ مٹر کا بیج کھول کر دیکھا جائے اس میں جو جو نظر آتا ہے اسے چند سطروں میں لکھو۔ اپنی عبارت میں یہ الفاظ استعمال کرو۔ مٹر کا دانہ، ننھا سا سوراخ، نہایت باریک جھلّی سا چھلکا۔ بیج کی حفاظت۔ بیج کے دو حصے۔ دال ننھی سی چیز۔ پھانس۔ پودے کا بچہ۔ نشوونما۔ نوٹ:- اس ایک درس میں درحقیقت ایک یا دو دن میں کرائے جانے والے کاموں کا خاکہ دکھایا گیا ہے۔ ادنےٰ جماعتوں میں	

حاشیہ برائے مزید معلومات	نفس مضمون و طریقہ تعلیم	تاریخ
	نصاب تعلیم کے مختلف مضامین حتی الوسع مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گفتگو میں چند ایسے الفاظ بھی مربوط کرائے جا سکتے ہیں جو آئندہ درسوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔	

دوسرا درس - پیرا نمبر ۱ تا نمبر ۴

حاشیہ برائے مزید معلومات	نفس مضمون و طریقہ تعلیم	تاریخ
	مشکلات بلحاظ تلفظ - خوشبودار (بروزن، خود۔ خوش) تقریباً (تنوین کا مطلب سمجھانا) شمالاً، جنوباً، شرقاً، غرباً، فوراً - (شمالن۔ جنوبن۔ شرقن۔ غربن۔ فورن) مشکلات بلحاظ معانی - سرسبز (ہرا بھرا)، فرحت (خوشی) نشو نما پانا (بڑھنا)، نمودار ہونا (ظاہر ہونا) بھینی بھینی خوشبو ہلکی ہلکی خوشبو۔ کلی کی خوشبو سے گندی شے کی خوشبو کا مقابلہ محاورات - (۱) آنکھوں میں ٹھنڈک آنا، ہرے بھرے پودوں کو دیکھ کر آنکھوں میں ٹھنڈک آتی ہے اور جی خوش ہوتا ہے (۲) دل باغ باغ ہونا - دل خوش ہونا، جھوٹے پھول کر چھوٹے بچوں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ (۳) جوں کا توں پڑے رہنا ویسے کا ویسا ہی پڑے رہنا، پتھر کو زمین میں دبا کر پانی ڈالا مگر وہ جوں کا توں پڑا رہا۔ بالکل نہیں بڑھا۔	۱۸ ۵۱

تاریخ	نفسِ مضمون و طریقۂ تعلیم	حاشیہ برائے مزید معلومات
	اعادہ کے سوالات (۱) پودا بے جان ہے یا جاندار کیوں؟ (۲) پودے کے کتنے حصے ہوتے ہیں؟ (۳) فقروں میں استعمال کرو۔ سرسبز۔ تروتازہ۔ دل باغ باغ ہونا (۴) فقروں کو مکمل کرو۔ ہرے ہرے پتوں کو دیکھ کر آنکھوں میں ٹھنڈک آتی ہے ..... جی چاہتا ہے کہ باغ میں ٹھہر کر پھولوں کے ..... رنگ اور ..... خوشبو سے ..... اٹھایا جائے۔	

جماعت ششم	مضمون۔ حساب کا قاعدہ سمجھانا	سرخی۔ رقبہ معلوم کرنا۔
تاریخ	**نفسِ مضمون و طریقۂ تعلیم**	**حاشیہ برائے مزید معلومات**
۱۲ جنوری	نوٹ:۔ حساب کے درس دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) نیا قاعدہ سکھانا (۲) سکھائے ہوئے قاعدے کی پختگی کے لئے متفرق سوالات حل کرانا، ہر دو قسم کے درسوں کے لئے نوٹس بھی علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔ اول الذکر میں کسی قاعدے کو سکھانے کے مختلف مراحل بیان کئے جاتے ہیں۔ اور موخر الذکر میں حساب کی مختلف کتابوں کی مدد سے متفرق سوالات تیار کئے جاتے ہیں، جہاں تک ہو۔ ابتدائی جماعتوں میں حساب کو بچوں کی روزمرہ کی زندگی کے مشاغل، ماحول اور پریکٹس سے مربوط کرنے کی کوشش کی جائے، حساب کی تعلیم میں	

تاریخ	نفس مضمون و طریقہ تعلیم	حاشیہ برائے مزید معلومات
	اس لئے دلچسپی پیدا نہیں ہوتی کہ اسے عملی زندگی سے ربط نہیں دیا جاتا۔ روزمرہ کی زندگی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کسی ہنر یا حقیقت کی مشق اس ہنر یا حقیقت کے سیکھنے کیلئے رغبت پیدا کرنیکا موجب بن سکتی ہے، یہ وہ تعلیمی اصول ہے جسے اکثر سکولوں کے مدرسین نظر انداز کرتے ہیں، ضروری ہے کہ کسی قاعدے کو سکھانے کے لئے اس کے مدارج مقرر کئے جائیں، ان مدارج کا فیصلہ کرنے کے لئے طلبہ کی سابقہ واقفیت اور آسان سے مشکل کی طرف چلنے کا اصول نظر انداز نہ کیا جائے، رقبہ کے سبق سے واقفیت دلانے کے لئے ہم مندرجہ ذیل مدارج مقرر کریں گے۔ (۱) سابقہ واقفیت:۔ اس میں طولانی پیمانے، کونے یا زاویہ کا تصور۔ زاویہ قائمہ۔ زاویہ حادہ۔ زاویہ منفرجہ اور مختلف اشکال کی پہچان جیسے، تکون، مربع مستطیل کی پڑتال کی جائے۔ (۲) نئے مدارج:۔ اس ضمن میں رقبہ کا تصور۔ مربع انچ۔ مربع فٹ۔ مربع گز۔ مربع کرم۔ مرلہ۔ کنال۔ گھماؤں۔ مربع جریب مربع ایکڑ بسوانسی۔ بیگھہ وغیرہ استعمال ہوں (رقبہ کے مختلف پیمانے) (۳) متفرق سوالات:۔ گھیرے اور رقبہ میں فرق، رقبہ اور ایک ضلع معلوم ہے دوسرا ضلع معلوم کرنے کے متعلق سوالات۔ (۴) کھیت کے اردگرد کی سڑک کا رقبہ۔ چوپڑ کی سڑک کا رقبہ وغیرہ	

تاریخ	نفسِ مضمون و طریقۂ تعلیم	حاشیہ برائے مزید معلومات
	(۵) قدمی پیمائش (۶) متفرق مشقیہ سوالات۔	
	درس نمبر (۱)	
۱۲ تا ۵۰	(۱) تختہ سیاہ یا زمین پر مربع مستطیل اور تکون کی اشکال کھینچ کر ان کا فرق نکلوانا (سابقہ واقفیت) (ب) ایک مربع کھینچو جس کا ایک ضلع ایک گز ہو (۲) ایک فٹ ہو (۳) ایک گرہ ہو (۴) ایک انچ ہو (شکل نمبر ا کتنی جگہ گھیرتی ہے (ایک مربع گز) شکل نمبر ۲ کتنی جگہ گھیرتی ہے (ایک مربع فٹ) شکل نمبر ۳ کتنی جگہ گھیرتی ہے (ایک مربع گرہ) شکل نمبر ۴ کتنی جگہ گھیرلی ہے (ایک مربع انچ) رقبہ:۔ جتنی جگہ کوئی شکل گھیرتی ہے وہ اس کا رقبہ کہلاتا ہے۔ سوالات برائے پختگی۔ ہاتھ پھیر کر بتاؤ کہ سلیٹ۔ تختہ سیاہ تختی۔ کاپی۔ کتاب کتنی جگہ گھیرتی ہیں۔ شکل نمبر ا کا رقبہ بتاؤ (ایک مربع گز) (مدرس اس ایک مربع گز کا مطلب بخوبی ذہن نشین کرائے گا) شکل نمبر ۲، ۳، ۴ کا رقبہ بھی اسی طرح۔ ایک ایسا مربع بناؤ جس کا ہر ایک ضلع ۳، ۲ فٹ ہو۔ ایک ایک فٹ کے فاصلے پر نشان لگاؤ اور مقابل کے ضلعوں کے آمنے سامنے کے نشانات ملاؤ۔ اب کتنی شکلیں بن گئیں؟ (۶) ہر ایک کا رقبہ کتنا ہے؟ (۱ مربع فٹ) بڑے مربع نے کل کتنی	

تاریخ	نفسِ مضمون و طریقۂ تعلیم	حاشیہ برائے امر مزید معلومات
	جگہ گھیری (۹ مربع فٹ) مربع کا ایک ضلع = تین فٹ۔ دوسرا ضلع = تین فٹ پس رقبہ = ۳ × ۳ = ۹ مربع فٹ مربع کا ایک ضلع = ۱۲" دوسرا ضلع = ۱۲" پس رقبہ = ۱۲" × ۱۲" = ۱۴۴ مربع انچ۔ اسی قسم کی مختلف مشقیں حل کرا کر ذیل کا قاعدہ طلبہ کے بخوبی ذہن نشین کرایا جائے۔ قاعدہ:۔ مربع کا رقبہ = ضلع کی لمبائی × ضلع کی لمبائی۔ مشقیہ سوالات:۔ سوالات ذیل کے رقبے معلوم کرو۔ (۱) ضلع ۱۵ فٹ (۲) ضلع ۱۸ گز (۳) ضلع ۱×۹ انچ۔ (۲) کمرے کی مربع شکل والی چیزوں کو پیش کر کے ان کے رقبے نکلوانا۔ مربع کیاریوں کے رقبے نکلوانا وغیرہ۔	

جماعت اوّل مضمون اردو سرخی (لا) کا طریق الصوت

تاریخ	نفسِ مضمون و طریقۂ تعلیم	حاشیہ برائے مزید معلومات
	جماعت اوّل کے مدرّس کی نوٹ بک کا ایک صفحہ نوٹ نمبر ۱۔ اس جماعت کے مدرس کے نوٹ متقابلتاً مشرّح ہونگے ان میں طریقۂ تعلیم پر بھی زیادہ زور رہوگا۔ نوٹ نمبر ۲۔ ہم نے یہ فرض کیا ہے کہ مدرس نئے طریقہ تعلیم سے (جو موگا میتھڈ یا جامعہ میتھڈ یا مخلوط طریقۂ تعلیم سے موسوم ہے) ابتدائی ن کو پڑھاتا ہے۔	

تاریخ	نفسِ مضمون و طریقۂ تعلیم	حاشیہ برائے مزید معلومات
	سابقہ واقفیت رہنمائے مدرسین برائے جماعت اول کے مطابق مدرس ۳۰ سبق پڑھا چکا ہے، بہت سے الفاظ بچے سیکھ چکے ہیں، مثلاً باپ۔ ماں، لڑکا گائے۔ لال۔ کالا۔ کھاتا وغیرہ جن میں ب، پ، ت، ٹ، ج چ وغیرہ حروف استعمال ہوتے ہیں، اس کے علاوہ د، ر، س ک، گ، ل، م وغیرہ کی اصوات بھی پڑھ چکے ہیں۔ **نئے مدارج** اردو کی ابتدائی تعلیم میں اصل چیز حروفِ علت یعنی (ا۔ و۔ ی ے) کی آوازوں کا سمجھنا اور ان کا استعمال ہے، جو بچہ ان حروف کی عام آوازوں کا استعمال اچھی طرح سمجھ لے گا وہ پڑھنے میں مہارت پیدا کر سکتا ہے، اس لئے حروفِ علت کے اسباق کو فہمیدہ طریقے سے پڑھانا نہایت ضروری ہے۔ **نیا سبق** **(ا) کا طریق الصوت** مدرس تختۂ سیاہ پر لفظ "باپ" لکھے گا۔ اور لڑکوں سے پڑھوائیگا اب صرف حرف "پ" کو مٹا کر اس کی جگہ "ت" لکھ کر لفظ "بات" پڑھوائے گا۔ اسی طرح باگ اور بال وغیرہ لکھکر پڑھوائے گا۔ باپ بات باگ بال اس کے بعد بچوں کی توجہ "ا" کی طرف مبذول کرائی جائیگی	

تاریخ	نفسِ مضمون و طریقۂ تعلیم	حاشیہ برائے مزید معلومات
	اس مرکب کو توڑ کر اس کی تجزی کی جائے گی۔ "با" کی صورت واضح کرنے کے لئے اس کے حروف علیحدہ علیحدہ رنگین چاک سے لکھے جائیں گے اور بتایا جائے گا کہ جس آواز کے ساتھ یہ نشانی (ا) لگائی جاتی ہے۔ اس کی آواز لمبی ہو جاتی ہے۔ طلبہ اپنے ہونٹوں کے سامنے انگلی کھڑی کر کے مختلف اصوات کو لمبا کر کے بولیں مثلاً ب، با ۔ پ ، پا ۔ ک ، کا ۔ ل ، لا ۔ گ ، گا ۔ م ، ما ۔ ع ، عا ۔ و ، وا ر ، را وغیرہ ۔ اس کے بعد مدرس ذیل کے مرکبات کی مشق کرائے بابا ۔ باجا ۔ باباکا ۔ کاکاکا ۔ با ۔ با ۔ پا ۔ پا ۔ لا ۔ لا ۔ تالا ۔ جا ۔ لا ۔ جالا ۔ پالا ۔ کا ۔ لا ۔ کالا کالا وغیرہ ۔ اب مدرس طلبہ سے ذیل کے فقرات تختہ سیاہ پر سے پڑھوائے اور خود اُن کی بالکل معمولی مدد کرے ۔ (۱) بابا ۔ باجا ۔ لا ؛ بابا ۔ لال ۔ کالا ۔ باجا ۔ لا ۔ (۲) رازق کا تالا کالا ہے ۔ (۳) رازق کا باپ دال کھاتا ہے ۔ (۴) عارف کا دادا کالا باجا لایا ہے ۔ نوٹ :۔ لکھنے کے سبق میں بھی (الف) والے آسان الفاظ کی مشق کرائی جائے جیسے (۱) رات ۔ باپ ۔ بات ۔ ساگ ۔ آگ ۔ ٹاٹ ، پاٹ ، سات نام ۔ کام ۔ شام ۔ نان ۔ کان ۔ جان ۔ پان ۔ ران وغیرہ (۲) وارث کا باپ نان ساگ کھاتا ہے ۔ (۳) وارث کا نانا شام سات پان لایا ہے ۔	ختم شد

ہمارے مدارس میں تدریس ریاضی

محمد مظفرالدین

ریاضی ایک ایسا علم ہے جس کا انسانی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اتنا گہرا کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ بچہ ابھی پیدا ہوتا بھی نہیں کہ اس کے متعلق حساب شروع ہو جاتا ہے، اس کے پیدا ہونے کا وقت، گھنٹہ، منٹ، سیکنڈ حساب کے محتاج ہیں اسکی تاریخ پیدائش معلوم کرنے کے لئے حساب کی ضرورت ہے، اپنی مادری زبان سمجھنے کے فوراً بعد وہ ریاضی کا استعمال ایک دو کہہ کر شروع کر دیتا ہے، اور یہ استعمال اس کی عمر کے ساتھ بڑھتا ہی جاتا ہے حتیٰ کہ موت کے بعد بھی حساب ہوتا ہے، الغرض انسان اور حساب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

دنیا میں کوئی سائنس ریاضی کے بغیر مکمل نہیں، سب اس کے خوشہ چین ہیں، تمام کاروبار اور علوم و فنون کی بنیاد حساب ہے۔

اسکولوں میں ریاضی کی تعلیم کے مقاصد

(۱) عملی فوائد۔
(۲) دماغی اور ذہنی تربیت۔

اس سے ایسا مفید علم حاصل ہوتا ہے جس کی ہمیں اپنے کاروبار زندگی میں روزانہ ضرورت ہوتی ہے، اس کی بدولت پڑھنے والے میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے، اس کی قوتِ فکر حرکت میں آتی ہے، اس میں مشکلات کا مقابلہ کرنا اور ان پر قابو پانے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

موقع شناسی اور صبر و تحمل کی خوابیدہ جبلتیں بیدار ہوتی ہیں، یہاں تک کہ استقلال اور یقین پیدا ہوجاتا ہے۔ انسانی زندگی میں یقین کی بہت بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ ؎

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ریاضی سے بچے کی ذہانت، اس کی قوتِ متخیلہ، قوتِ فیصلہ اور استدلال کی نشوونما ہوتی ہے صحیح طریقہ، باقاعدگی اور سلیقہ سے کام کرنے کی عادت پڑتی ہے حساب سچائی ہے اور ایک عالمگیر سچائی جو بچے کے ایمان کو مضبوط کرتی ہے۔ اس کے کردار اور اخلاق کی تربیت کرتی ہے مدارس میں ریاضی کی تدریس کا حقیقی مقصد بچوں کی ذہنی اور دماغی تربیت ہے علمیت میں اضافہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے۔

"THE TRUE END OF MATHEMATICAL TEACHING IS POWER AND NOT KNOWLEDGE."

اسکولوں میں ریاضی کی تعلیم کا جائزہ

اگر ہم اپنے مدارس میں ریاضی کی تعلیم کا جائزہ لیں تو اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ ان مقاصد کی کما حقہٗ تکمیل نہیں ہو رہی ہے، اس کی وجہ اس کا ناقص طریق تدریس ہے جس کی بدولت یہ مضمون ہی لڑکوں کے لئے ہوّا بن گیا ہے، اور ان کے دلوں میں یہ خیال جاگزین ہو گیا ہے کہ ریاضی مشکل مضمون ہے، اور مسلمانوں کے دماغوں سے بالاتر ہے۔ ورنہ لڑکوں کے دماغ درست ہیں اور ان میں کوئی نقص نہیں کہ وہ ریاضی کے مسائل کو نہ سمجھ سکیں۔ ہمارے اسکولوں میں اس مضمون کی تعلیم و تدریس میں حسب ذیل اہم نقائص پائے جاتے ہیں۔

(۱) لڑکوں کو مبادیات کا مکمل اور صحیح تصور نہیں دیا جاتا، وہ عاد اعظم اور ذو اضعاف اقل پانچویں جماعت میں سیکھتے ہیں، پھر مڈل میں کرتے ہیں، پھر میٹرک میں، لیکن میٹرک پاس کرنے کے بعد بھی نہیں بتا سکتے کہ عاد اعظم کو عاد اعظم کیوں کہا جاتا ہے، اور ذو اضعاف اقل کو ذو اضعاف اقل کیوں کہتے ہیں۔

(۲) قاعدہ کی اہمیت اور ضرورت طلبہ پر واضح نہیں کی جاتی۔ بچہ بلکہ انسان کو وہ چیز یاد رہتی ہے جس کی افادیت کا اسے علم ہو۔

(۳) عملی زندگی سے جس کے ساتھ اس مضمون کا چولی دامن کا ساتھ ہے تعلق پیدا نہیں کیا جاتا اس لئے اس مضمون کو زندگی سے بے تعلق سمجھا جانے لگا ہے۔

(۴) جو قاعدہ پڑھایا جاتا ہے وہ اور اس کا مفہوم طلبہ کو اچھی طرح ذہن نشین نہیں کرایا جاتا، پھر مثالیں لیکر قاعدہ یا فارمولا اخذ نہیں کرایا جاتا یوں ہی بتا دیا جاتا ہے، اس وجہ سے لڑکے اسے حقیقی معنوں میں نہیں سمجھتے اور اس کے سوالات میں ذرا سی پیچیدگی ہونے پر اسے حل نہیں کر سکتے۔ مثلاً یہ سوال کہ ایک کرہ ۲۰ فٹ لمبا اور ۱۵ فٹ چوڑا ہے۔ بتاؤ اس کے فرش پر بڑی سے بڑی کتنی مربع سلیں لگیں گی۔ اکثر طلبا اسے نہیں کر سکتے۔

(۵) خاطر خواہ زبانی سوالات نہیں کرائے جاتے۔ زبانی سوالات سے عام قاعدے بہتر ذہن نشین ہوتے ہیں اور حساب کو روزمرہ زندگی کے کاموں میں استعمال کرنا آتا ہے، ذہنی قوت بھی نشوونما پاتی ہے۔

(۶) عبارتی سوالات نہیں کرائے جاتے جس سے مضمون کی دلچسپی مفقود ہو جاتی ہے اور بچوں کو عبارت سمجھنے کی مشق نہیں ہوتی، اسوجہ سے ریاضی پڑھانے کے مقاصد کی پورے طور پر تکمیل نہیں ہوتی۔

(۷) مدرسین میں سے بیشتر صرف چند مشہور مشہور قاعدے کرا دیتے ہیں، جو امتحان میں پوچھے جاتے ہیں، تجربہ سے اندازہ لگا کر کہ یہ امتحان میں آنے والے ہیں ان کی اتنی مشق کرا دیتے ہیں کہ طلبا کامیاب ہونے بھر کے نمبر حاصل کر لیتے ہیں۔ اس وجہ سے لڑکوں میں حسابی ذوق پیدا نہیں ہوتا اور وہ مشین کی طرح کچھ سوالات حل کر کے کامیاب ہو جاتے ہیں۔

ہمارے مدارس میں اسوقت ریاضی کی تین شاخیں پڑھائی جاتی ہیں۔

(۱) حساب (۲) الجبرا (۳) جیومیٹری۔

اب اس مقام پر ان تینوں کے متعلق علیحدہ علیحدہ بحث کی جائے گی ۔

حساب

(۱) پرائمری جماعتوں میں مقرون اشیاء کا استعمال نہیں ہو رہا، گنتی سکھانے کے لئے لڑکوں کو قطاروں میں کھڑا کر کے کسی اوپر والی جماعت کے یا اسی جماعت کے ہوشیار لڑکے کو انہیں زبانی ایک سے لیکر سو تک روزانہ گنتی گنوانے پر مامور کر دیا جاتا ہے، یہ طریقہ طوطوں کو پڑھانے کا ہے۔ انسان زادوں کے لئے موزوں نہیں، مدرسین کو چاہیے کہ وہ کنکریاں۔ ٹھیکریاں، گولیاں تیلیاں گٹھلیاں، کوڑیاں، منکے وغیرہ فراہم کر کے اپنے پاس محفوظ رکھیں، اور ان کی مدد سے لڑکوں کو گنتی سکھائیں اور پھر انہیں تعلیمی کھیلوں کے ذریعہ یاد کرائیں ۔

(۲) پہاڑے بھی اسی طرح رٹائے جاتے ہیں، سکھائے نہیں جاتے، جو پہاڑہ سیکھنا ہو وہ ہر لڑکا مقرون اشیاء کی مدد سے خود بنائے، اور اپنی تختی یا سلیٹ پر لکھ کر اسے یاد کرے، یاد کرانے کے لئے بھی تعلیمی کھیل کھلائے جائیں، استاد ان کے چارٹس بنا کر جماعت کے کمرہ میں آویزاں کر دے۔

(۳) جوڑ توڑ (جن کو جمع اور تفریق کے پہاڑے بھی کہا جاتا ہے)

یہ بھی ہر لڑکا مقرون اشیاء کی مدد سے خود عملی طور پر بنائے اور اپنی تختی پر لکھ کر یاد کرے ۔ استاد ان کے بھی چارٹس بنا کر کمرہ میں آویزاں کر دے اور یاد کرا دے تاکہ انگلیوں پر گننے کی عادت ترک ہو جائے ۔

۲ = ۱ + ۱	۳ = ۲ + ۱	۴ = ۳ + ۱	۵ = ۴ + ۱ وغیرہ
۳ = ۱ + ۲	۴ = ۲ + ۲	۵ = ۳ + ۲	۶ = ۴ + ۲ ،
۴ = ۱ + ۳	۵ = ۲ + ۳	۶ = ۳ + ۳	۷ = ۴ + ۳ ،
۵ = ۱ + ۴	۶ = ۲ + ۴	۷ = ۳ + ۴	۸ = ۴ + ۴ ،
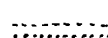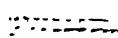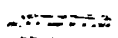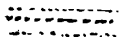
(۴) دہائی سیکڑے کا تصور۔ بچوں کو دہائی سیکڑہ سکھاتے وقت ان کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ ایک ہی ہندسہ مختلف جگہوں پر مختلف قیمت کیوں رکھتا ہے۔ اس غرض کے لئے تیلیاں، دس دس تیلیوں کے بنڈل اور گنتی کا بکس یا ڈبہ بنا کر استعمال میں لانا چاہیئے۔

اکائی کے خانہ میں ۹ گولیاں رکھ کر ایک اور گولی ڈالنے سے دہائی بن جائے گی۔ اسے گنتی کے صندوق میں دہائی کے خانہ میں رکھ دیا جائے اور تختہ سیاہ پر اس طرح لکھ دیا جائے۔

اکائی	دہائی
۰	۱

جس طرح دہائی کا تصور دلایا جاتا ہے، اسی طرح آئندہ سبق میں سیکڑے کا تصور دلایا جائے اور یہ بات ذہن نشین کی جائے کہ جب ایک عدد بائیں طرف ہٹتا جاتا ہے تو اس کی قیمت میں دس گنا اضافہ ہوتا جاتا ہے، اس تصور کو پختہ اور راسخ کرنے کے لئے مختلف اشیا سے مشق کرائی جائے۔ مثلاً کبھی بالفریم۔ کبھی تیلیوں کے گٹھوں، بیجوں، گٹھلیوں، کنکروں، دانوں وغیرہ کی ڈھیریوں سے مشق کرائی جائے۔

(۵) دوسری جماعت میں جمع متواتر سے ضرب اور تفریق متواتر سے تقسیم کا تصور دلایا جائے۔

تقسیم سکھاتے وقت پہلے لمبی تقسیم اور پھر چھوٹی تقسیم سکھانا آسان سے مشکل کی طرف جانا ہے

(۶) تیسری جماعت میں تحویل نزولی اور صعودی۔ جمع اور تفریق مرکب مصنوعی دوکان کے ذریعہ آسانی سے سکھائی جا سکتی ہے، مختلف پیمانوں سکوں کی واقفیت اس کے ذریعہ دلائی جا سکتی ہے، اس غرض کے لئے مصنوعی گتے کے بنے ہوئے سکے (TOKEN COINS) استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

(۷) عاد اعظم اور ذو اضعاف اقل سکھاتے وقت ان کے معانی بھی بتائے جائیں اور ذہن نشین کرائے جائیں۔ بتایا جائے کہ کسی عدد کا جزوِ ضربی اس کا عاد بھی کہلاتا ہے اور اعظم = بڑا۔ پھر اعداد کی اجزائے ضربی کر کے عاد اعظم اخذ کرایا جائے۔ مثلاً۔

جغرافیہ کا نظری علم

جب تک کہ ان علامتوں سے اس شے کا تصور پیدا ہو جس کی وہ تشبیہ ہوتی ہیں۔ ان کا کسی قسم کا بھی مطالعہ کارآمد نہیں ہو سکتا ہے لیکن بچہ کی تعلیم بھر بھی ان ہی تشبیہات میں محدود رہتی ہے، حالانکہ ان اشیا کی تشبیہات ان کو سمجھانے میں آج تک کوئی شخص کامیاب نہیں ہوا، آپ کا خیال ہے کہ آپ بچے کو یہ یاد دیتے ہیں کہ دنیا کس چیز کی مانند ہے، جناب وہ تو محض نقشہ ہی کا علم حاصل کر رہا ہے جس کو تو محض ان شہروں۔ ملکوں اور دریاؤں کے نام یاد کرا دیئے گئے ہیں، جن کا کاغذ پر لکھے ہونے سے زیادہ اس کے نزدیک اور کوئی وجود ہی نہیں ہے، میں نے کہیں جغرافیہ کی ایک کتاب دیکھی ہے جس کا پہلا فقرہ یہ تھا۔ "دنیا کیا ہے"؟

گتے کا ایک کرہ ہی بچے کا جغرافیہ ہوتا ہے، میں دعویٰ کرتا ہوں کہ کرۂ ارض اور ترکیب کائنات کا مسلسل اور سالم علم سیکھنے کے بعد بھی کوئی دس سالہ بچہ اپنے اس علم کے ذریعہ پیرس سے وینس تک کا راستہ نہیں معلوم کر سکتا، بلکہ میرا تو یہ دعویٰ ہے کہ ان میں سے ایک بچہ بھی نقشہ دیکھکر بلا بھٹکے اپنے باپ کی جاگیر تک کا راستہ نہیں معلوم کر سکتا۔ یہ علامہ الدہر وہ نو عمر ہوتے ہیں جو پیکن۔ اصفہان۔ میکسیکو اور دنیا کے ہر ملک اور شہر کا محل و قوع نقشہ پر بتا سکتے ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے کہ بچے کو ایسے علوم کے مطالعہ میں مشغول رکھنا چاہئے جس میں نگاہ کے استعمال کی ضرورت پڑتی رہتی ہو، ممکن ہے آپ درست فرماتے ہوں، لیکن ایسے علوم اگر واقعتاً موجود ہیں بھی تو کم از کم میرے علم میں تو نہیں ہیں۔

تاریخ کا سبق

بچوں کو تاریخ پڑھانا اور بھی مضحکہ انگیز غلطی ہے، تاریخ محض واقعات ماضیہ کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے بچوں کے لئے سہل اور مناسب خیال کی جاتی ہے لیکن لفظ "واقعات" کے کیا معنی ہیں، کیا آپ کے خیال میں تاریخی واقعات کو ثابت کرنے والے تعلقات اتنے سہل الفہم ہوتے ہیں کہ متوازی تخیلات بچے کے ذہن میں بآسانی پرورش پا سکیں؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ اسباب کا حقیقی علم ان کے علل کے علم

سے جدا کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہ تاریخ کا الفاظ سے اسقدر خفیف تعلق ہوتا ہے کہ ایک کو بلا امداد دیگرے منفرداً سیکھا جا سکتا ہے؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ تاریخ کا مطالعہ غیر دلچسپی کے باعث نہ تو آپ کو کوئی لطف بخشتا ہے اور نہ بچوں کی معلومات میں ہی اس سے کوئی اضافہ ہوتا ہے۔ اگر آپ اقوال کی جانچ اخلاقی روش کے ذریعہ کرنا چاہتے ہیں تو اس اخلاقی روش کو بچے کے واسطے قابل فہم بنانے کی سعی فرمائیے، پھر آپ جلد ہی یہ معلوم کر سکیں گے کہ بچہ تاریخ پڑھنے کی عمر کو پہونچ چکا ہے۔ یا نہیں۔

اے میرے ناظرین آپ اس بات کو خوب یاد رکھیں کہ جو شخص آپ کو مخاطب کر رہا ہے۔ وہ نہ تو وسیع المطالعہ ہے نہ فیلسوف بلکہ وہ تو ایک سیدھا سادھا آدمی صداقت کا دلدادہ اور شیدا ہے، جو کسی جماعت کا تابع یا طریقہ کا پابند نہیں ہے۔ بلکہ ایسا درویش خلوت نشین ہے کہ جس کو لوگوں سے متاثر ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ لوگوں کی گفتگو میں جو قابل توجہ امور اس کو معلوم ہوتے ہیں اس پر غور و خوض کرنے کے لئے اس کو کافی وقت ملتا ہے۔ میرے دلائل کا واقعات کی نسبت کلیوں اور نظریوں پر بہت ہی تھوڑا مدار ہے، اور میرا خیال ہے کہ واقعات کو بین طور پر سمجھانے کے لئے میرے پاس اس سے بہتر طریقہ نہیں ہے کہ میں بالتواتر ان مثالوں کو بیان کرتا جاؤں جن پر میرے دلائل کا انحصار ہے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میں چند دن کے لئے ایک دیہات میں ایک ایسی لائق ماں کے ساتھ گیا جس نے اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم میں بڑی بڑی مشقتوں سے کام لیا تھا، ایک روز صبح کے وقت جبکہ اس کے بڑے لڑکے کو استاد صاحب سبق دے رہے تھے میں بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا، اس استاد نے بچے کو تاریخ قدیم بڑی محنت اور دلسوزی سے پڑھائی تھی۔ اس نے اس روز بچے کا سبق سکندر اعظم کے قصہ سے شروع کر کے ڈاکٹر قلب کی مشہور کہانی پر ختم کیا۔ اس میں اس کی ایک تصویر بھی تھی اور قصہ بھی مطالعہ کے لائق تھا۔ قابل استاد نے سکندر اعظم کی شجاعت اور دلیری کے متعلق چند اپنے خیالات کا اظہار کیا جن کو

میں قطعاً ناپسند کرتا تھا لیکن میں نے محض اِس خوف کے باعث ان کے متعلق بحث نہ کی کہ کہیں شاگرد کے دِل میں استاد کی وقعت نہ گر جائے، رات کے کھانے کے وقت فرانسیسی چلن کے مطابق لوگوں نے بچے سے بحث چھیڑ دی، بچے کی چلبلی عمر، زندہ دلی اور داد خواہی کی یقینی توقع نے اُس سے متعدد حماقتیں سرزد کرادیں، ان حماقتوں میں کبھی کبھی عقل اور پتے کی بات بھی وہ کہہ جاتا تھا، پس لوگ اس کے ساتھ ہی بچے کی حماقتوں کو تو نظر انداز کر دیتے تھے اور عقلمندی کی داد دینے لگتے تھے، سب سے آخر میں اس بچے نے ڈاکٹر فلپ کا قصہ نہایت واضح اور عمدہ الفاظ میں بیان کیا۔ ماں کی مطلوبہ اور خود بچے کی متوقع تعریف و توصیف کی داد حاصل کرنے کے بعد لوگوں نے اس واقعہ کی بابت بحث شروع کر دی، اکثر نے سکندر کی سریع المزاجی کو موردِ الزام ٹھہرایا، بعض نے بتائید اتالیق اس کی قوت ارادہ کی تعریف و توصیف کی، جس سے میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ حاضرین میں سے ایک نے بھی اس کہانی کی خوبی کو نہ سمجھا تھا، خود میں نے یہ بیان کیا کہ سکندر کے چلن میں اگر کوئی شجاعت یا مستقل مزاجی تھی بھی تو وہ محض ایک پُرغرور دھمکی تھی، سب کے سب اسی پر متفق ہو گئے کہ واقعی یہ پُرغرور دھمکی تھی، مجھے تھوڑا غصہ بھی آگیا اور میں جواب دینے والا ہی تھا کہ سماۃ صاحبہ جو میرے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھیں جھک کر میرے کان میں بولیں "شیخ خاموش ہی ہو رہو وہ تمہاری بات نہیں سمجھ سکیں گے۔" میں نے لوگوں کی طرف دیکھا اور اس عورت کے مشورہ کی معقولیت کا خیال کر کے خاموش ہو گیا ۔

تجدیدی کورس

تربیتی اداروں سے نکلنے کے بعد بالعموم اصول تعلیم اور طریق تعلیم کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ اساتذہ منزل نا آشنا ہو جاتے ہیں۔ اور دھیرے دھیرے وہ ایک ایسی ڈگر پر چلنا شروع کر دیتے ہیں جو انہیں اپنے مقام سے بہت دور لے جاتی ہے۔ اسلئے جو لوگ تعلیم و تعلم سے متعلق ہوتے ہیں ان کے لئے تجدیدی کورس نہایت ضروری ہوتا ہے، معلم کی تعلیم مابعد، تربیت معلمی سے کم ضروری نہیں ہوتی۔ جدید تعلیمی رجحانات اور جدید تعلیمی تجربات سے روشناس ہوئے بغیر بچوں کی ذہنی نشو و نما ناممکن ہوتی ہے، لیکن کچھ عجیب بات ہے کہ اس ضرورت کو محسوس کرنے کے بعد بھی اساتذہ کی تعلیم مابعد کے لئے ابھی تک کوئی معقول انتظام نہیں ہو سکا۔ حتیٰ کہ تجدیدی کورسوں کے اہتمام کا بھی کوئی مناسب انتظام نہیں کیا جا سکا۔ بہرصورت اگر زمانہ کی تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی تیزی سے آگے بڑھنا ہے اور بچوں میں ذوقِ عمل اور شوق جستجو پیدا کرنا ہے تو ہمیں بھی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ "جدید" بنانا ہو گا۔

سطور ذیل میں ایک تجدیدی کورس کی تفصیلات مندرج ہیں۔ اس قسم کے تجدیدی پروگرام ذہنوں پر چھائے ہوئے زنگ کو صاف کرنے میں مدد معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ (ادارہ)

اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز کو نئی معلومات اور نئے طریقہائے کار سے روشناس کرنے کے لئے گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ میں جناب قاضی کریم بخش صاحب

ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز حلقہ ملتان، چودھری عبداللطیف صاحب افسر انچارج سائنس ایجوکیشن پنجاب، شیخ ایم اے رشید صاحب شریر اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز حلقہ ملتان، چودھری رشید احمد صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ اور خان غفور اللہ لودھی صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول کمالیہ کی زیر نگرانی دس روزہ تجدیدی (ریفریشر) کورس کا اہتمام ہوا۔ دینیات۔ روزمرہ سائنس اور عملی آرٹس جیسے مضامین کی تدریس کے لئے جو نصاب میں نئے نئے داخل کئے گئے ہیں ماہرین فن کو متعین کیا گیا تاکہ اس کورس میں شامل ہونے والے اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز کی معلومات کو تازہ کیا جائے۔ ان کی کل تعداد ۴۶ تھی، تجدیدی کورس میں جو مضامین شامل کئے گئے - ان کے عملی اور نظری دونوں پہلوؤں کو اور پرائمری کی پانچوں جماعتوں کے لئے ان مضامین کے مقررہ نصاب کو دہرا لیا گیا اور پھر اس پر تفصیلی بحث کی گئی۔

دینیات کے سلسلے میں پہلی جماعت سے لے کر آٹھویں جماعت تک کے سارے نصاب کو مولوی حبیب اللہ صاحب فاروقی اور مولوی محمد حسن صاحب گورنمنٹ نارمل اسکول کمالیہ نے پڑھایا۔ انہوں نے سامعین کے سامنے شیعہ اور سنی جیسے دو بڑے طبقوں کے اختلاف کو بھی نہایت عمدگی سے واضح کیا۔

عملی فنون (پریکٹیکل آرٹس) محمد شفیع صاحب، دل محمد صاحب اور اللہ دتا صاحب نے مضمون کے عملی پہلو پر خاص زور دیا اور ان کی اثر آفرین اور لائق رہنمائی میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز نے ابری بنانا، مٹی کے ماڈل تیار کرنا، کاغذ کاٹنا۔ کاغذ مروڑنا۔ اور فری ہینڈ ڈرائنگ اور رنگ بھرنا وغیرہ سیکھا۔

روزمرہ سائنس نجی صفائی اور علم اعمال و افعال اعضا۔ زراعت، حیاتیات اور ابتدائی سائنس پر مشتمل تھی، چودھری رشید احمد صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ، چودھری عبداللطیف صاحب افسر انچارج سائنس ایجوکیشن پنجاب۔ شیخ ایم۔ اے رشید صاحب شرر

اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز حلقہ ملتان اور تنویر احمد صاحب گورنمنٹ نارمل اسکول گمکھڑ نے اس موضوع پر تقریریں کیں، ان سب نے مجموعی طور پر اور بہت سی مفید اور قیمتی معلومات بہم پہونچائیں ۔

پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار لکس نے تقریباً بیس فلمیں دکھائیں اور یہ صرف تجدیدی کورس میں شامل ہونیوالوں کے لئے اسباق کے سمجھنے میں ہی ممد ثابت نہیں ہوئیں، بلکہ انہوں نے تا خوشگوار موسم کی جلستی ہوئی گرمی کی حدت کو بھی دور کر دیا ۔

اس تجدیدی کورس کے اختتام کے قریب چودھری عبدالرشید صاحب اسسٹنٹ ہارٹ ری کلچرسٹ (HOTRICULTURIST) پنجاب ایگریکلچرل کالج لائل پور نے اسکویش بنانے اور پھل اور سبزی کو محفوظ رکھنے کے طریقوں پر تقریر کی، انہوں نے سرکہ چٹنی اور دوسرے گھریلو مشاغل کے متعلق اچھی خاصی معلومات بہم پہونچائیں ۔

یہاں درخت کاری کا ہفتہ بھی منایا گیا اور ہر ایک ڈی. آئی نے کم سے کم ایک درخت گورنمنٹ نارمل اسکول کمالیہ یا گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ میں ضرور لگایا اور اس فارسی شعر کے مصداق ۔ تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

اس کا اہتمام ضروری ہے ۔

تجدیدی کورسوں کا اہتمام ان تمام حضرات کے لئے ہونا چاہئے جنہیں ماہرین تعلیم ہونے کا دعویٰ ہے، اس سے علم کے فرسودہ ہونے کا خطرہ کم ہو جاتا ہے ۔ باہمی تعلقات بڑھانے کا ایک نادر موقع ہاتھ آتا ہے، غیر محدود بحث وتمحیص کے مواقع، ترقی پذیر طریقہائے کار کو استوار کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ تجدیدی کورس نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوا ۔ اور اس کورس میں شریک ہونے والے جب رخصت ہوئے تو ان کا دامن علم کے موتیوں سے بھرا ہوا تھا ان میں زیادہ ذوق و شوق اور جوش وخروش تھا۔ اور وہ بہت زیادہ شاداں و فرحاں نظر

آتے تھے۔ اگر مقامی گورنمنٹ ہائی اور نارمل اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان اور اے۔ ڈی آئی صاحبان اس کورس میں شامل ہونے والوں کی ضروریات اور ان کے آرام کے لئے کوشاں نہ رہتے تو یہ کامیابی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

تجدیدی کورس میں شریک ہونے والوں نے چودھری عبدالرشید صاحب اسسٹنٹ ہاٹ ری کلچرسٹ لائل پور اور ان کے نائب قاضی کریم بخش صاحب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز حلقہ ملتان، ڈاکٹر غلام یسین خان نیازی صاحب ڈی۔ آئی۔ ایس۔ لائل پور، چودھری عبداللطیف صاحب افسر انچارج سائنس ایجوکیشن پنجاب، چودھری عبدالرشید صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ، خان غفور اللہ خان صاحب لودھی ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ شیخ ایم اے رشید صاحب شرما اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز حلقہ ملتان اور تنویر احمد صاحب سائنس ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے کمال شفقت اور محنت سے یہ سہولتیں بہم پہونچائیں، مزید براں ان تمام اساتذہ اور ماہر دینیات، ماہرین فنون (آرٹ اینڈ ڈرائنگ) کا بھی شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے بڑی محنت، صبر وتحمل اور نہایت عمدگی سے اپنے کام کو سرانجام دیا۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

نمبر و تاریخ	نام اور عہدہ	کس عہدہ پر تقرر یا تبادلہ ہوا	کیفیت
ای/۲۷۷۳۵ ۸ ستمبر ۱۹۵۲ء	م۔ مہرالدین بی اے۔ ایس اے وی۔ اے۔ ڈی۔ آئی۔ ایس ملتان	ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول چک نمبر ۷۷، ۴ ای۔ بی۔ ضلع ملتان	یکم دسمبر ۱۹۵۲ء سے ایک نئی آسامی پر جو حکومت پنجاب نے بحوالہ چٹھی نمبر ۲۵۹۲۹ مورخہ ۳۰ اگست ۱۹۵۲ء منظور کی۔
ای/۳۰۷۸۱ ۹ اکتوبر ۱۹۵۲ء	م۔ محمد ابوالفتح بی اے بی ٹی معلم انگریزی (رخصتی) سنٹرل ماڈل ہائی اسکول لاہور	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ننکانہ صاحب (رخصتی)	مرزا عبدالمجید کی جگہ جو گورنمنٹ سنٹرل ماڈل اسکول لاہور منتقل ہو گئے
	مرزا عبدالمجید بی اے۔ بی ٹی۔ (جن کے تبادلے کے احکام گورنمنٹ ہائی اسکول ننکانہ صاحب کے لئے جاری ہو چکے تھے)	معلم انگریزی گورنمنٹ سنٹرل ماڈل ہائی اسکول لاہور۔	م۔ ابوالفتح کی جگہ جو تبدیل ہو گئے ہیں
ای/۳۱۱۱۰ ۱۱ اکتوبر ۱۹۵۲ء	م۔ محمد اختر بی اے۔ بی۔ ٹی ایک امیدوار	عارضی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول۔ کیمبل پور	م۔ محمد صادق کی جگہ جو گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو تبدیل ہو گئے ہیں
ای/۳۲۴۹۹ ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۲ء	م۔ ممتاز احمد قریشی ایم اے بی ٹی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں ضلع لاہور	معلم انگریزی گورنمنٹ نارمل اسکول۔ لالہ موسیٰ۔	ایک خالی اسامی پر

۲۸ = ۷ × ۲ × ۲

۳۲ = ۲ × ۲ × ۲ × ۲ × ۲

پوچھا جائے سب سے بڑا کون سا عاد ہے جو دونوں میں مشترک ہے۔ جواب ۲×۲ = ۴

لہذا عاد اعظم مشترک ۲ × ۲ = ۴ ہوا۔

پھر بتایا جائے کہ اختصار کے لئے عاد اعظم مشترک کو صرف عاد اعظم بھی کہتے ہیں۔

(ب) ذو اضعاف اقل :- عاد جس عدد کو پورا پورا تقسیم کرتا ہے وہ اس کا ضعف کہلاتا ہے ضعف معنی گنا مثلاً ۳۵ کے عاد ۵، ۷ ہیں اور ۳۵ ان میں سے ہر ایک کا ضعف یا گنا ہے۔ ضعف کی جمع اضعاف ہے، پھر یہ اس طرح اخذ کرایا جا سکتا ہے ۸ اور ۶ کے اضعاف ۲۴، ۴۸، ۹۶ ..... ہیں، ان میں سے چھوٹے سے چھوٹا ضعف کونسا ہے جواب ۲۴۔ اس لئے اس کو یعنی ۲۴ کو ذو اضعاف اقل کہتے ہیں، کیونکہ اقل کے معنی سب سے چھوٹا ہے اور ذو اضعاف اقل کا مطلب سب سے چھوٹے ضعف والا ہے۔

اس کے بعد دوسرا طریقہ چھوٹی تقسیم والا بتایا جائے۔

(۸) کسور کا تصور دلانے کے لئے گول یا مستطیل گتے۔ آلو۔ ماٹا، سیب۔ نارنگی۔ روٹی وغیرہ کے حصے کر کے لڑکوں کو کسور کا تصور دلایا جائے۔

(ب) پھر پڑھنا بتایا جائے کہ ایک بٹا چار یعنی ۱ چار پر بٹا یا تقسیم ہوا۔ اور ۱ سے لکھتے وقت اس طرح لکھا جاتا ہے ۱ ÷ ۴ = $\frac{۱}{۴}$ اختصار کے لئے لکیر کے اوپر اور نیچے والے نقطے حذف کر دیئے جاتے ہیں۔

(ج) کسور کا مقابلہ :- اگر ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ طلبا میں سے کون سب سے بڑا ہے اور کون سب سے چھوٹا۔ تو جب تک انہیں کسی ہموار جگہ پر کھڑا نہ کیا جائے پتہ نہیں لگ سکتا کہ بڑا کون ہے

اسی طرح اگر چھوٹی اور بڑی کسر معلوم کرنی ہو تو ہمیں انہیں ہم مخرج کرنا ضروری ہے۔ یعنی ۱ کی نیچے والی سطح ایک ہی کی جائے۔

(۹) اکائی (جماعت پنجم)

ذرا غور کیا جائے تو واضح ہوگا کہ تقسیم مرکب اور ضرب مرکب کے ضمن میں اکائی کی بنیاد رکھی گئی ہے مثلاً چار سلیٹوں کی قیمت ۸؍ ہو تو ایک سلیٹ کی قیمت تھوڑی ہو گی۔ ۱ سلیٹ کی قیمت ۲؍ ہو تو ۱۰ کی زیادہ ہو گی۔ اِن ہر دو کو اکٹھا کیا جائے تو منکشف ہوا کہ زیادہ اشیاء کی قیمت معلوم ہو تو اکی معلوم کرنے کے لئے تقسیم اور اکی معلوم ہو تو زیادہ کی معلوم کرنے کے لئے ضرب دی جاتی ہے

(۱۰) فیصدی کی ضرورت طلبہ پر واضح کی جائے اور مختلف مثالیں لیکر انہیں محسوس کرایا جائے کہ جانچنے اور موازنہ کرنے کے لئے کوئی معیار مقرر ہونا چاہیئے، یہ معیار عام طور پر دنیا کے تمام ممالک میں فیصدی رکھا گیا ہے، کیونکہ اس میں آسانی رہتی ہے اور فوراً پتہ لگ جاتا ہے کہ کونسی مقدار بہتر ہے اور کونسی کم۔

طلبہ کو بتایا جائے کہ فی = میں صدی = ۱۰۰ فیصدی کا مطلب فی سو ہے، یعنی جانچنے کے لئے۔۔ اکی نسبت معیار مقرر کی گئی ہے، اور آج کل تمام اقوام میں مشترک طور پر مستعمل ہے۔

فیصدی کے متعلق پہلے صحیح تصور دلایا جائے اور بعد میں اس کے سوالات حل کرائے جائیں۔ اس کے سوالوں میں کوئی خاص نیا قاعدہ نہیں ہوتا بہ نسبت تناسب کی ہے۔ ایک طرح سے وسعت ہے۔

نوٹ:۔ فیصدی کے سوالات کراتے وقت زکوٰۃ کے سوالات بھی کرانے چاہئیں۔

(۱۱) سود (جماعت پنجم)

سود کے سوالات فارمولا سے کرنے سکھائے جاتے ہیں جس سے یہ ایک میکانکی عمل ہو جاتا ہے، اور جونہی لڑکے فارمولا بھول جائیں وہ سوال کرنے سے عاری ہو جاتے ہیں اس قاعدہ کو ذہن نشین کرانے کے لئے سوالات اکائی کے قاعدے سے کرائے جائیں۔

اور جب کافی سوالات کرا لیے جائیں تو فارمولا بتایا جائے اس طرح اگر لڑکے فارمولا بھول جائیں تو پھر خود ہی اس کو اخذ بھی کر سکیں گے۔

(۱۲) منی کا ماکا تصور اور مفہوم لڑکوں کو اچھی طرح واضح نہیں ہوتا۔ اور بیشتر اس بات کو نہیں سمجھتے کہ کٹوتی واجب الادا رقم میں سے کاٹی جاتی ہے اور اس کو کاٹنے سے نقد قیمت آجاتی ہے۔ اگر یہ ابتدائی باتیں طلبہ پر شروع شروع میں ہفتہ بھر بار بار ذہن نشین کر کے راسخ کر دی جائیں تو پھر اس قاعدہ کے سوالات ان کے لئے صرف سود کے سوالات ہو تے ہیں۔

(۱۳) اسی طرح اسٹاک یا راس المال کے قاعدہ کو اسکولوں میں اکثر مشکل کیا جاتا ہے لیکن میرا اپنا ذاتی تجربہ ہے کہ اگر اس کی اصطلاحات طلبہ کو بار بار لکھوا کر خوب واضح کر دی جائیں تو اس کے سوالات بڑی آسانی سے حل ہو جاتے ہیں۔ اور یہ صرف اکائی۔ دلالی یا نفع نقصان کی آسان صورت بن کر رہ جاتا ہے۔

(۱۴) کسور اعشاریہ کا سائنس کی دنیا میں بڑا استعمال ہوتا ہے لیکن یہ ایسے طریقہ سے پڑھایا جاتا ہے کہ دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد بھی کئی لڑکے اس کی رقم کو صحیح طور پر نہیں پڑھ سکتے۔ مثلاً ۵٫۷۵ (5.75) کو ۵ اعشاریہ ۷۵ پڑھتے ہیں جو بالکل غلط ہے، اگر طلبہ کو یہ صحیح طور پر ذہن نشین کرایا جائے تو وہ اسے بالکل صحیح پڑھیں گے اور پانچ اعشاریہ سات پانچ کہیں گے۔

اس صورت میں طلبہ کو بتایا جائے کہ اعشاریہ عام رقم ہی کی توسیع ہے اور در اصل اعداد صحیح لکھنے کا جو طریقہ ہے اسے بڑھا کر اعشاریہ کا قاعدہ بنایا گیا ہے۔ اکائی سے بائیں طرف چلتے جاؤ تو ہندسوں کی قیمت بڑھتی جاتی ہے اور اگر دائیں طرف چلتے جاؤ تو ہندسوں کی مقامی قیمت کم ہوتی جاتی ہے، اور کمی بیشی بھی ایک ہی مقررہ ترتیب سے ہوتی ہے جیسے ۴ کو اکائی کے مقام پر رکھو تو اس کی قیمت ۴ اکائی یعنی ۴ ہوگی، دہائی پر رکھو تو ۴۰ اور سیکڑے پر رکھو تو ۴۰۰ ہوگی۔ اب اسی ۴ کو اکائی سے دائیں طرف رکھو تو یہاں اس کی قیمت اس کا دسواں حصہ یعنی ۴/۱۰ ہوگی جو اکائی کے مقام پر تھی، اور ایک درجہ اور دائیں طرف کرنے سے قیمت سوواں حصہ یعنی ۴/۱۰۰ ہوگی یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اکائی تک پہنچ گئے ہیں اکائی کے بعد ایک نقطہ لکھ دینا ضروری ہے جسے

ایمیل یا رُوسو کی تعلیم

توقیر مرزا رزقی ——— مسلسل ۱۵

حافظہ اور ادراک کا فرق | جس ظاہری سہولت سے بچے باتیں کرنا سیکھتے ہیں وہی ان کی تباہی کا باعث ہوتی ہے۔ آپ اس کا مشاہدہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں کہ یہی سہولت اس امر کا ثبوت ہوتی ہے کہ وہ کوئی علم حاصل نہیں کرتے۔ اُن کا صاف شفاف چکنا دماغ آئینے کی مانند ہر اس چیز کے عکس کو قبول کر لیتا ہے جو آپ اس کو دکھاتے ہیں لیکن اس چیز کا کوئی گہرا نقش قائم نہیں ہونے دیتا، بچہ اُن الفاظ کو یاد رکھتا ہے جن سے خیالات معکوس ہوتے ہیں اور سامعین ان خیالات کو سمجھ جاتے ہیں لیکن خود بچے کے لئے وہ خیالات لایعنی ہوتے ہیں، حافظہ اور ادراک دونوں مختلف خاصیتیں ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک بھی جداگانہ بالیدگی حاصل نہیں کرتی۔ قبل حصول شعور بچہ عکس تو قبول کر لیتا ہے۔ لیکن خیالات قبول نہیں کرتا۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ عکس تو بیرونی اشیاء کی محض تصویر ہوتے ہیں اور خیالات ان اشیا کے تصورات ہوتے ہیں جو ایک دوسری شے کے تعلقات کے ذریعہ معین ہو جاتے ہیں۔ ایک عکس جب یاد کیا جائے وہ دل میں بالذات موجود رہتا ہے۔ لیکن ایک خیال دوسرے خیالات کی رہنمائی کرتا ہے، جب کبھی ہم کسی شے کا

تصور کرتے ہیں تو گویا ہم اپنے حواس خمسہ کے ذریعہ اس کو محسوس کرتے ہیں، اور جب ہم عقل سے کام لیتے ہیں تو گویا ہم اشیاء کا توازن اور مقابلہ کرتے ہیں۔ ہمارے احساسات محض بچپن ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے تخیلات جانچنے والے عملی اصول کی مخلوق ہوتے ہیں۔ جس کا ثبوت مابعد پیش کیا جائے گا۔

لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ قوت فیصلہ بچوں میں معدوم ہوتی ہے۔ اور ان میں حقیقی حافظہ بھی نہیں ہوتا۔ وہ آواز شکل اور احساس کو تو یاد رکھتے ہیں لیکن خیالات اور ان سے بھی زیادہ ان کے تعلقات کو تو بالکل ہی یاد نہیں رکھ سکتے۔ آپ فرماتے ہیں کہ بچہ اقلیدس کے ابتدائی اصولوں کو حفظ کر لیتا ہے۔ کیا آپ اس دعویٰ کو ثابت کر سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو میرا ادعا ثابت قرار پاتا ہے۔ آپ مظہر ہیں کہ بچہ بذات خود دلیل کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس لئے دوسروں کے دلائل بھی یاد نہیں رکھ سکتا۔ کیوں کہ آپ اگر ان ننھے ننھے جیامیٹری کے طلبا کے طریق کار کو بغور ملاحظہ فرمائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ صرف اشکال کے صحیح نقشوں اور ان کے ثبوت کی اصطلاحوں ہی سے واقف ہوتے ہیں۔ ادنیٰ خفیف ترین جدید اعتراض کا جواب نہیں دے سکتے ہیں۔ اور اگر شکل میں تغیر کر دیا جائے تو وہ بالکل ہی گول ہو جاتے ہیں۔ ان کا کل علم سطحی حسیات تک محدود ہوتا ہے۔ حسیات کے ادراک تک نہیں پہونچتا۔ اُن کا حافظہ دیگر قوتوں سے ذرا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ بڑے ہوکر ان کو وہی دوبارہ سیکھنا ہوتا ہے جو کم سنی میں وہ سیکھ چکتے ہیں۔

بہر حال میرا ہرگز یہ خیال نہیں ہے کہ بچوں میں عقل اور سمجھ[1] ہوتی ہی نہیں ہے۔ بلکہ برعکس

---

[1] میں نے بار بار اس امر پر غور کیا ہے کہ ایک ضخیم کتاب میں اس لفظ کو انہی معنی میں استعمال کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ کوئی زبان بھی ایسی مالدار نہیں ہے کہ ہمارے خیالی تغیرات کے لئے کافی اصطلاحات اور اشارات مہیا کر سکے، ہر اصطلاح کی تعریف بیان کر کے اس کی جگہ اس کی تعریف استعمال کرنے کا طریقہ اچھا تو معلوم ہوتا ہے، لیکن ممکن العمل ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہم (باقی حاشیہ صفحہ ۲۰۵ پر ملاحظہ ہو)

میرا خیال یہ ہے کہ ان اشیاء کے متعلق جو ان کی ذاتی حیات کو متاثر کرتی ہیں، بچے بڑی بہتر تمیز اور سمجھ رکھتے ہیں۔ لیکن لوگوں کو ان کی معلومات کی وسعت کی بابت بڑا مغالطہ ہو جاتا ہے کیونکہ یہ لوگ بچوں سے ان علوم کو متعلق کرتے ہیں جن سے کہ بچے واقف ہی نہیں ہوتے، اور ان امور کی بابت بحث کرتے ہیں جن کو وہ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ دوسری غلطی یہ ہوتی ہے کہ بچوں کی توجہ ایسے معاملات کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے جن کا ان سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا ہے مثلاً بچوں کے آئندہ کے فائدوں یا بڑے ہونے کے بعد ان کی راحت و آرام کے متعلق یا یہ کہ مکمل آدمی بننے کے بعد لوگوں کا اُن کی بابت کیا خیال ہوگا۔ یہ وہ امور ہیں جو ایک بالکل ناعاقبت اندیش مخاطب کے لئے لایعنی اور قطعاً غیر متعلق ہوتے ہیں، لیکن اس پر بھی ان ننھے ننھے معصوموں سے ان معاملات کا مطالعہ جبراً کرایا جاتا ہے، جو ان کی عقل سے بالکل باہر ہوتے ہیں، یہ آپ خود تصفیہ فرمائیے کہ آخر وہ ان معاملات کی جانب اپنی کس قدر توجہ مبذول کر سکتے ہیں۔

جو مدرسین اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت کی بڑی نمائش کرتے اور اس کو بڑی شہرت دیتے ہیں، وہ میرے اس طریقہ کی مخالفت کرنے کے لئے ہی تنخواہ پاتے ہیں، لیکن عملاً وہ بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳) اپنی خرابی کس طرح دور کر سکتے ہیں ؟ اگر تعریفات بنانے میں ہم نفاظی سے کام نہ لیتے تو وہ سب ٹھیک اور درست ہوتیں۔ اس کے باوجود بھی بالکل مطمئن ہوں کہ ہم مفلس زبان میں بھی قابل فہم معنی اور مطالب بیان کر سکتے ہیں۔ یہ کہ ہم الفاظ کو ہمیشہ ایک ہی معنی میں استعمال کرنے سے نہیں، بلکہ اس امر کا لحاظ رکھنے سے بیان کر سکتے ہیں کہ جن معنوں میں ہم کسی لفظ کو استعمال کرتے ہوں سیاق عبارت سے کافی طور پر ان ہی معنوں کا اظہار ہوتا ہو۔ اس طرح کہ ہر فقرہ جس میں وہ لفظ استعمال کیا گیا ہو خود ایسی لفظ کی تشریح ہو۔ پس بعض وقت میں بچوں کو ناسمجھ کہتا ہوں اور بعض وقت ان کو سمجھدار اور بے شک میرے یہ الفاظ اکثر متضاد ضرور ہوتے ہیں لیکن میرے تخیلات میں مجھے کسی قسم کا تضاد نہیں معلوم ہوتا۔

بڑے ہی خیال کی تائید کرتے ہیں، اس لئے کہ بجلا وہ بڑا صاف ہی کیا ہیں۔ الفاظ الفاظ!
الفاظ! اور فخر یہ کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے شاگردوں کو مختلف علوم سکھا دیئے ہیں، ان مختلف
علوم میں وہ اس امر کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں کہ بچوں کو وہ کبھی ایسا علم نہ سکھائیں جو فی الواقع ان کے لئے
مفید ہو سکے کیونکہ ایسی حالت میں یقیناً بچوں کو اشیاء سے سابقہ پڑے گا۔ تو وہاں وہ بالکل ناکامیاب
ہوں گے، ان کے منتخبہ علوم ایسے ہوتے ہیں کہ جب ہم ان کی اصطلاحوں کو جاننے لگتے ہیں
تو وہ ہم کو حاصل شدہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً خاندانی حسب و نسب کا علم۔ جغرافیہ کا علم، تاریخ
کا علم اور زباندانی کا علم وغیرہ وغیرہ کا مطالعہ آدمی سے اور وہ بھی بچے سے اسقدر زیادہ غیر متعلق
ہے کہ اگر وہ ان کے کسی جزو سے بھی کوئی فائدہ حاصل کرلیں تو حیرت انگیز بات ہوگی۔

بچہ ایک ہی زبان سیکھ سکتا ہے

آپ کو یہ معلوم کرکے بڑا تعجب ہوگا کہ زبان دانی کے
مطالعہ کو میں ایک بیکار بوجھ سے تعبیر کرتا ہوں۔ لیکن آپ
یہ یاد رکھیں کہ یہ ذکر میں ابتدائی سنین کی تعلیم کا کر رہا ہوں اور آپ جو چاہیں کہیں میں یہ باور کرنے
کے لئے تو ہرگز تیار نہیں ہوں کہ ایک بارہ یا پندرہ سالہ بچہ دو زبانیں حقیقتاً سیکھ سکتا ہے۔
اگر زبان دانی کا مطالعہ محض الفاظ کے یاد کرنے تک محدود ہے۔ یعنی ان علامات اور تشبیہات
تک جن کے ذریعہ زبان خود اپنا اظہار کرتی ہے تو ممکن ہے کہ ان کا مطالعہ بچوں کے لئے موزوں
اور مناسب خیال کیا جا سکے۔ لیکن زبانیں جس طرح علامات کو بدلتی ہیں۔ اسی طرح ان تخیلات
کی بھی تصحیح کرتی ہیں جو ان علامات سے ظاہر ہوتے ہیں، دلوں کی تشکیل زبان کے ذریعہ
ہوتی ہے اور خیالات اس کے تخیل میں رنگے ہوتے ہیں محض عقل ہی سب میں مشترک ہوتی ہے
ہر زبان کی ایک ذاتی خصوصیت ہوتی ہے اور زبانوں کا فرق قومی امتیازات کا جزو و سبب ہوتا
ہے۔ اس قیاس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ سورج کی روشنی میں بسنے والوں کی بول
چال ان کی طرز روش کے تغیرات کی تابع ہوتی اور اسی کے ساتھ محفوظ رہتی یا تبدیل ہو جاتی
ہے۔ ان مختلف صورتوں سے ایک صورت بچہ عادتاً اختیار کرلیتا ہے، اور وہ بھی ایک زبان

ہوتی ہے جس کو وہ سن شعور تک استعمال کرتا ہے، دو زبانیں سیکھنے کے لئے اس میں ان دونوں زبانوں کے تخیلات کا موازنہ کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیئے، پھر بھلا جبکہ وہ ان کو سمجھ بھی نہ سکتا ہو تو ان تخیلات کا موازنہ ہی کس طرح کر سکتا ہے؟ اس کے نزدیک ہر چیز کے ہزاروں ہی معنی ہو سکتے ہیں، لیکن ہر تخیل تو صرف ایک ہی معینہ شکل رکھتا ہے لہذا بچہ بیک وقت صرف ایک ہی زبان سیکھ سکتا ہے، آپ مجھے باور کراتے ہیں کہ بچہ بیک وقت کئی زبانیں سیکھ لیتا ہے، لیکن میں اس کو نہیں مانتا، میں نے ایسے چھوٹے معجزہ نما بچوں کو دیکھا ہے، جن کی بابت خیال کیا جاتا ہے کہ چھ چھ زبانیں بیک وقت بول سکتے ہیں، ابتداً میں نے ان کو جرمن زبان بولتے سنا، پھر فرانسیسی یا لاطینی، یہ صحیح ہے کہ وہ نصف درجن مختلف زبانوں کے الفاظ استعمال کر سکتے ہیں، لیکن بولتے وہ ہمیشہ جرمن زبان ہی ہیں، قصہ مختصر یہ کہ اپنے بچوں کو ہم معنی الفاظ جتنے جی چاہے سکھا دیجئے۔ وہ ان کی زبان نہیں کہلا سکتے، بلکہ وہ محض الفاظ ہی ہوں گے، جن کو آپ بدل دیتے ہیں۔ ایک زبان کے سوا وہ کبھی بھی دوسری زبان نہیں استعمال کر سکیں گے۔

ان کمزوریوں کو چھپانے کے لئے مدرسین عموماً ان مردہ زبانوں کا انتخاب کرتے ہیں جن کا مستند جانچنے والا اہم میں کوئی موجود نہ ہو، ان زبانوں کا ربط و استعمال تو عرصہ دراز سے مفقود و معدوم ہو چکا ہے۔ اس لئے بچے کتابوں میں جو لکھا دیکھتے ہیں اس کی نقل کر دیتے ہیں۔ اور اسی کو وہ لوگ گفتگو کرنا کہتے ہیں، جبکہ استاد کی ہی یونانی یا لاطینی استعداد سطحی اور بے مایہ ہو تو پھر بھلا بچوں کا کیا ٹھکانا؟ ایک لفظ بھی سمجھے بغیر بمشکل تمام وہ پرائمری کتاب ہی رٹتے پاتے ہیں کہ ان کو ایک فرانسیسی تقریر لاطینی میں ترجمہ کرنے کو دیدی جاتی ہے۔ اور جب وہ ذرا بڑے ہو جاتے ہیں تو نثر میں سیسارو (CICARO) کے دو جملوں اور نظم میں ورجل (VERGIL) کی چند سطروں کو ایک جگہ جمع کرنے لگتے ہیں اور اس پر ان کو یہ مغالطہ ہو جاتا ہے کہ وہ لاطینی بول سکتے ہیں۔ پھر بھلا کس کی مجال کہ ان کو جھٹلا سکے؟

آموزش

[دسمبر ۱۹۵۲ء] لاہور [جلد ۵ شمارہ ۹]

اس شمارہ میں

مدیر : بشیر ہاشمی

معاونین : عبدالغفور چودھری
ایم - اے - عزیز

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

دسمبر ۱۹۵۲ء

جلد ۵

شمارہ ۹

سالانہ چندہ

پاکستان کیلئے ۶ روپے

غیر ممالک کیلئے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

ایچ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کر۔
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

پست معیار

ابھی حال ہی میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی ہے اس رپورٹ میں سنٹرل سپیریر سروس کے امتحان میں شامل ہونے والے امیدواروں کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ امیدواروں کی جسمانی حالت کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ جامعی طلبہ کو کھیل کود، اسکاوٹنگ اور دوسرے ایسے مشاغل میں حصہ لینا چاہئے جس سے ان کی جسمانی حالت بہتر ہو سکے، ان کی شخصیت میں رچاؤ پیدا ہو سکے، احساس نظم و ضبط بیدار ہو سکے اور وہ آنے والی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے اہل ثابت ہو سکیں۔

فیڈرل پبلک سروس کمیشن نے طلبہ کی ناکامی کے حسب ذیل اسباب بیان کئے ہیں۔

(۱) طلبہ کی غیر موثر شخصیتیں اور ان کا ناقابلِ اطمینان ذہنی اور علمی معیار۔

(۲) جسمانی ساخت اور موزونیت کا پست معیار۔

(۳) یونی ورسٹی میں سماجی مشاغل کا عدم اہتمام اور طلبہ کے نجی مشاغل اور ان کی دل چسپیوں کی حوصلہ افزائی نہ کرنا۔

(۴) بالعموم امیدواروں کی اکثریت ہلکے پھلکے مضامین کا انتخاب کرتی ہے، یہ انتخاب بلند ذہنی اقدار، قوتِ برداشت اور مستعدی کا حامل نہیں ہوتا۔

کیشن کا خیال ہے کہ یونی ورسٹی میں طلبہ کی ذہنی، اخلاقی اور جسمانی نشو و نما کی طرف یا تو توجہ ہی نہیں دی جاتی، یا اگر تھوڑی بہت توجہ دی جاتی ہے تو وہ ان کی ہمہ گیر نشو و نما کے لئے ناکافی ہوتی ہے۔

یہ حالات فی الواقع افسوسناک ہیں، ہم یہ نہیں چاہتے کہ خوش فہمی میں مبتلا رہیں، معیار کی اس عام پستی کا تجزیہ کرنا بھی ضروری ہے، ذرا یہ تو دیکھیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں ہم اتنے کج رو کیوں ہوتے جاتے ہیں، صرف یہی کافی نہیں ہے کہ نوجوانوں کی خامیوں اور کوتاہیوں کا ذمہ دار مدرسین اور تعلیم گاہوں کو ٹھہرا کر دور سے تماشہ دیکھتے رہیں، نوجوانوں کے بگاڑنے یا بنانے میں تو ہم سبھی شریک ہیں۔ اس میں مدرسین، تعلیم گاہوں یا نظام تعلیم کا کیا قصور، لیکن ان تینوں کی تنقیص کا تو کچھ رواج سا ہو گیا ہے، کبھی مدرس ہدف ملامت بنتا ہے، کبھی تعلیم گاہوں کو مطعون کیا جاتا ہے اور کبھی نظام تعلیم کے نقائص کا ماتم کیا جاتا ہے، مگر کیا اس سے دوسروں کی ذمہ داریاں کم ہو جاتی ہیں؟

کچھ دن ہوئے لاہور کے اخبارات میں ایک سولہ سالہ نوجوان کی خودکشی کی خبر شائع ہوئی۔ وجہ محض یہ تھی کہ میٹرکولیشن امتحان ۱۹۵۲ء میں شریک ہونے والے امیدواروں میں اس کا نام شامل نہیں کیا گیا تھا۔ وہ گھر پہونچا اور انتہائی مایوسی کے عالم میں خودکشی کر لی۔ اگر ہمارے معاشرے میں کوئی ایک طالب علم اپنی دماغی الجھنوں کا شکار ہو جائے حتیٰ کہ اسے اپنی زندگی کی بھی پرواہ نہ رہے تو اس کی ذمہ داری تعلیمی اداروں پر عائد نہیں ہوتی۔ اور کیا یہ واقعہ بچوں کی سالانہ ترقیوں کے طریق کار پر روشنی نہیں ڈالتا، اکثر طلبہ ایک جماعت سے دوسری جماعت میں ترقی پانے کے اہل نہیں ہوتے، لیکن مختلف اثرات کے ماتحت انہیں ترقی مل جاتی، یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ بچہ دسویں جماعت میں پہونچ جاتا ہے، اس امتحان میں طلبہ کی کامیابی اور ناکامیابی مدرسین کے کارناموں کی آئینہ دار سمجھی جاتی ہے، اور ہیڈ ماسٹر اپنے بچاؤ کے لئے طلبہ کے انتخاب میں سختی سے کام لیتا ہے، امتحانوں میں فی صدی کامیابی کو

اِس طریقِ کار کا ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے۔ اِس صورتِ حال کی اِصلاح کا ایک ہی طریقہ ہے، ہمیں اپنے نظامِ کار کی ترمیم و تنسیخ میں بے دردی سے کام لینا ہوگا، ہماری تعلیم گاہوں میں موجودہ بدسلیقگی اور نااہلیت کے بہت سے اسباب ہیں کیا یہ مدرسین کا فرض نہیں ہے کہ وہ خود غور و خوض کریں، معاملات کو سمجھنے کی کوشش کریں اور طلبہ کو اس تباہ کاری سے بچانے کا کوئی راستہ تلاش کریں۔

یونیسکو

یونیسکو (UNESCO) کا سالانہ اجلاس پیرس میں منعقد ہو رہا ہے۔ یہ اس کا بجٹ سشن ہے۔ بہت سے مندوبین نے بجٹ پر شدید حملے کیے، ہمیں اس پر متعجب بھی نہیں ہونا چاہیے بالعموم اعتراضات کی نوعیت یہ تھی کہ یونیسکو نے اُن تمام فنڈوں کے حصول کی کوشش نہیں کی جو اسے اقوامِ متحدہ کے تکنیکی امداد (TECHNICAL AID) کے سلسلے میں مل سکتے تھے۔ امریکی مندوبین کے قائد مسٹر ہاؤلینڈ سارجنٹ، سابق صدر یونیسکو نے فرمایا۔ "سال رواں کے اختتام تک تکنیکی امداد کا میزان ماسبق کافی ہوگا اور ۱۹۵۳ء میں مستقل فنڈ حاصل ہوسکیں گے، یعنی آج جب یونیسکو کے مستقل میزانیہ کے چند ہزار ڈالر پر ہمارا متفق ہونا کچھ مشکل سا معلوم ہوتا ہے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، ابھی اور ایسے وسائل و ذرائع موجود ہیں جنہیں کام میں لایا جاسکتا ہے، یہ تمنا قضانہ صورتِ حال ہے، اگر یہ مسئلہ حل ہوگیا تو بجٹ کے مباحثے میں اس سے بہت مدد ملے گی اور یونیسکو اپنے مجوزہ ۵ ۲ لاکھ ڈالر کے پروگرام کو مالی اعتبار سے کامیاب بنانے کے لئے اپنے مستقل بجٹ کے علاوہ حسبِ ضرورت رقم برآمد کرنے کی مجاز ہوگی۔" اس کے ساتھ ہی ساتھ مسٹر سارجنٹ نے یہ بھی کہا کہ "ریکارڈ سے تو یہی اندازا ہوتا ہے کہ یونیسکو نے اس پروگرام کے تمام مواقع سے فائدہ اٹھایا۔"

اس وقت ہمارا مقصد اپنی حکومت کی دلچسپیوں اور یونیسکو میں اپنے کام کی نوعیت

زیر بحث لانا نہیں ہے، مگر حق یہ ہے کہ یونیسکو میں پاکستان کا معاملہ ہماری غفلت شعاری کی نذر ہو رہا ہے یونیسکو کے سکریٹریٹ میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے اور یہی سیکریٹریٹ ہے، جو مختلف ممالک کے لئے تجویزیں بناتا ہے، ہم نے ایک وفد ضرور بھیجا جو محض ہماری خیرسگالی کا پیام بر تھا وہ اتنا مضبوط و مستحکم نہیں تھا کہ دوسروں پر اثر انداز ہو سکتا، اس ملک میں یونیسکو کے متعلق لوگوں کو بہت کم معلومات ہیں یہاں کوئی ایسا ادارہ بھی نہیں جو یونیسکو کے متعلق ضروری اطلاعات کی نشر و اشاعت کر سکے، ہم کبھی اپنے وفد کے کارناموں اور ان کے مشاغل کی اشاعت نہیں کرتے۔ ہمارا خیال ہے کہ یونیسکو کے لئے وفد کا انتخاب نہایت احتیاط سے کرنا چاہیئے اور وفد کو ضروری ہدایات دینے کے لئے مرکزی تعلیمی مشاورتی بورڈ کا خاص اجلاس منعقد ہونا چاہیئے۔

ڈاکٹر شانڈ

فل برائٹ فیلوشپ اسکیم کے ماتحت تیسرے امریکی پروفیسر ڈاکٹر پال شانڈ (PAUL SHRID) بھی لاہور پہونچ چکے ہیں، اور سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں کام کر رہے ہیں۔ ہم انہیں ان کی آمد پر مبارکباد دیتے ہیں۔

ڈاکٹر پال شانڈ نے میامی یونیورسٹی اوہیو (MIAMI UNIVERSITY OHIO) میں تعلیم پائی اور اوہیو اسٹیٹ یونیورسٹی (OHIO STATE UNIVERSITY) سے پی ایچ ڈی کیا۔ وہ کچھ دنوں باؤلنگ گرین اسٹیٹ کالج اوہیو کی فیکلٹی کے ممبر رہے، آجکل وہ شعبۂ تعلیم اوبرلن کالج (OBERLIN COLLEGE) اوبرلن (اوہیو) کے صدر ہیں، اوبرلن کالج پوری ریاست میں پہلا کالج ہے جس میں طالبات کو بھی علم لینے کی اجازت دی گئی، سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں موصوف لسانیات پر لکچر دے رہے ہیں۔

سوڈان میں تعلیم

فضل احمد

پس منظر مصر اور برطانیہ کے جھگڑے نے آج ایک نہایت خطرناک صورت اختیار کر رکھی ہے، اس نزاع کی ایک وجہ مصری سوڈان بھی ہے، برطانیہ اس ملک پر سے اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کو تیار نہیں اور مصر کو اصرار ہے کہ سوڈان پر شاہ مصر کی سیادت تسلیم کئے بغیر مصر اور برطانیہ کے درمیان مصالحت ناممکن ہے، مصر کو سوڈان کے بارے میں یہ دعویٰ محض اس بنا پر نہیں کہ اس ملک کے باشندوں کی اکثریت مسلمان ہے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ سوڈان اور مصر دونوں مل کر وادی نیل بناتے ہیں، اور اگر اس وادی کی وحدت قائم نہ رہی تو مصر کو اپنے معاشی مستقبل کے متعلق کبھی اطمینان نہ ہوگا، دریائے نیل مصری زندگی کے شاہ رگ کا درجہ رکھتا ہے، اور مصر اس بات کا یقین چاہتا ہے کہ یہ شاہ رگ کبھی مخالف ہاتھوں کی زد میں نہیں جائے گی، گویا سوڈان مصر کے لئے کم و بیش وہی حیثیت رکھتا ہے جو پاکستان کے لئے کشمیر۔

تاریخی شواہد سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ کوئی ساڑھے تین ہزار سال قبل از مسیح میں مصر اور سوڈان کے درمیان آمد و رفت اور تجارت موجود تھی، پندرہ سو سال قبل از مسیح میں نپاٹا مقام پر مصری پروہتوں کے زیر اہتمام سوڈانی دارالسلطنت میں ایک نوآبادی قائم ہوئی جس کا مصری مذہب و ثقافت نے بڑی تیزی سے پھیلنا شروع کیا چھٹی صدی عیسوی میں عیسا

کی اشاعت شروع ہوئی، اس سے پہلے حبشہ کے پڑوسی ملک میں عیسائیت کافی پھیل چکی تھی [illegible] میں عربوں نے سوڈان کا رخ کیا اور ان کی کئی نوآبادیاں موجودہ ضلع سنار کے نواح میں قائم ہو گئیں جن کے اثر سے حبشی اسلام قبول کرنے لگے، بیرونی دنیا کو سوڈان کے ساتھ اچھی طرح تعارف سنہ ۱۸۲۰ء میں ہوا جب حاکم مصر محمد علی پاشا نے سوڈان پر اس غرض سے حملہ کیا کہ تجارتی راستے کھولے جائیں اور ایک سوڈانی فوج تیار کی جائے، معاہدہ سنہ ۱۸۹۹ء کی رو سے برطانیہ اور مصر مشترکہ طور پر سوڈانی نظم ونسق کے ذمہ دار ٹھہرے، لیکن عملاً یہ سیاسی سیادت برطانوی ہاتھوں میں ہی رہی کیونکہ مصر بیچارہ خود برطانیہ کے دامن کے ساتھ بندھا رہا۔

انگریزی اصطلاح میں اگرچہ سوڈان سے مراد صرف مصری سوڈان ہی ہے، تاہم اس کا اصل ماخذ عربی اصطلاح بلاد السودان ہے جس کا مطلب ہے "کالے لوگوں کا ملک"۔ یہ وسیع خطہ شرقاً غرباً بحرِ اوقیانوس سے بحرۂ قلزم تک پھیلا ہوا ہے، اور شمالاً جنوباً صحرائے اعظم سے لیکر کوئی دس درجے شمالی عرض بلد تک۔ گویا یہ خالص حبشیوں کا وطن نہیں، بلکہ نیم حبشی نسلوں کا ہے، اس مضمون میں اس وسیع وعریض خطے سے بحث نہیں کی گئی، بلکہ صرف مصری سوڈان سے جس کا رقبہ کوئی دس لاکھ مربع میل ہے اور جس کے شمال میں مصر واقع ہے، مشرق میں بحیرہ قلزم، حبشہ اور اریٹیریا، جنوب میں یوگنڈا اور بلجین کانگو اور مغرب میں فرانسیسی استوائی افریقہ، حبشہ کے پہاڑوں اور دریائے کانگو کے سوا جو علی الترتیب اس ملک کے مشرق اور مغرب میں واقع ہیں، اس کی اور کوئی قدرتی حدود نہیں۔

اسلام کا اثر اگرچہ دریائے نیل اور اس کے معادن اس ملک کی معاشی زندگی میں بڑا حصہ لیتے ہیں، تاہم اس کی عمومی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی قوت اسلام ہے، فتح مصر کے بعد جو عرب نوآبادیاں یہاں قائم ہوئیں، انہوں نے اشاعت اسلام کے مرکزوں کے طور پر کام دیا، اسلامی ثقافت اور معاشرتی نظام ایسی پر تاثیر قوتیں تھیں، جن کے سامنے پرانے اوضاع واطوار کا باقی رہنا محال تھا، لیکن قرون وسطیٰ میں سوڈان کے دور افتادہ

اور دشوارگذار علاقے اسلام سے بالکل بے خبر اور اپنی آبائی قوم پرستی پر قائم رہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ غلامی کے رواج کے باعث اس ملک کے بہت سے باشندے پکڑ کر فروخت کر دیئے جاتے تھے، اس لئے قدرتاً دور افتادہ علاقوں کے لوگ خارجی اثرات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، عصر حاضر میں غلامی کی تنسیخ اور عالمی تجارت کی غیر معمولی ترقی نے یہ رکاوٹیں دور کر دیں اور اسلام کے تیزی کے ساتھ پھیلنے کے لئے راستہ از سر نو تیار ہو گیا۔

بادی النظر میں یہ بات غالباً عجیب دکھائی دے گی کہ افریقہ میں تجارت کو فروغ دینے والی اور ذرائع آمدورفت کو ترقی دینے والی تو یورپ کی مسیحی قومیں ہوں اور اس سے فائدہ اسلام کو پہونچے اس میں شک نہیں کہ مغرب کے مسیحی مبلغین نے اپنے مذہب کو پھیلانے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، حبشیوں کا اپنا آبائی مذہب چند فرسودہ رسوم اور اوہام کے علاوہ کچھ نہیں، اس لئے عیسائیت کے لئے اس کی جگہ لے لینا چنداں مشکل کام نہیں، پھر یورپی حکومتوں کے بے پناہ مادی ذرائع بھی مسیحی مبلغوں کی خدمت کے لئے ہر طرح حاضر ہیں، نئی دنیا کے اصلی باشندوں کو انہیں سہاروں کے بل بوتے پر عیسائی بنایا گیا تھا، مگر افریقہ میں یہ بات ممکن نہ ہو سکی، کیونکہ یہاں ایک بہت سخت جان اور بے پناہ قوت کا مالک حریف موجود تھا اور یہ حریف تھا اسلام، ہر چند کہ اسلام حکومت کی حیثیت بنا ہی اور مادی ذرائع سے بہت کچھ محروم رہا، مگر یہ چیزیں اس کے ذاتی حسن کو کم نہیں کر سکتیں، حیرت یہ ہے کہ افریقہ کے جو علاقے مسیحی حکمرانوں کے براہ راست مطیع ہیں، وہاں بھی مسیحیت اور اسلام کی باہمی دوڑ میں آخر الذکر ہی ہمیشہ کامیاب رہا، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اسلام ایسی مذہبی، معاشی اور معاشری اقدار پیش کرتا ہے، جو بالکل بیّن اور واضح ہیں، جبکہ عیسائیت کے پاس مبہم وعدوں کے سوا کچھ نہیں جو حبشی اپنا آبائی دین چھوڑ کر اسلام قبول کرتا ہے، وہ فوراً ایک ممتاز معاشری نظام کا رکن بن جاتا ہے، جس میں اسے سب کے ساتھ برابر کا درجہ مل جاتا ہے، اس کے برعکس عیسائیت قبول کر لینے سے مذہبی برابری تو شاید مل جاتی ہو معاشری آزادی نہیں ملتی، اس ضمن میں ہٹلر کا یہ قول نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک حبشی اسلام قبول کر کے فوراً انسانیت کے ایک بلند مقام پر پہونچ جاتا ہے

جبکہ عیسائیت اس کے سامنے ایک ایسی پیچیدہ تہذیب پیش کرتی ہے جس کو وہ سمجھ نہیں پاتا۔ اور جس کو اختیار کر کے وہ دوسروں کے لیے ہنسی کا سامان بن جاتا ہے۔

غرض سوڈان کے ہر حصے میں اسلام روز بروز آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور یہ ایک ایسی انقلاب آفرین تعلیمی قوت کا کام انجام دے رہا ہے جو عوام کی زندگیوں میں ایک فرحت بخش ... پیدا کر دیتی ہے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ تبلیغی کام علماء یا مبلغین ... جماعت کے ہاتھوں انجام نہیں پا رہا، بلکہ تاریک براعظم کے اندھیرے گوشوں میں اسلام کی ... شنی پہونچانے کا ذریعہ تاجر لوگ ہیں۔ مسلمان تاجر اپنے کاروبار کے سلسلے میں جہاں جہاں پہونچتے ہیں اسلام کو ساتھ لیے جاتے ہیں۔ جو حبشی مقامی منڈیوں میں ان کے ہاتھ اپنی اجناس فروخت ... نے آتے ہیں وہ غیر محسوس طور پر اسلامی ثقافت کی بلندی اور پاکیزگی سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور جونہی کسی حبشی بستی میں کچھ لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں وہاں ایک چھوٹی سی مسجد بن جاتی ہے جو مزید تبلیغ کے لیے مرکز کا کام دیتی ہے۔ گویا تجارت اور اسلام میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جوں جوں تجارت بڑھتی ہے نئے نئے تجارتی راستے کھلتے ہیں۔ اور نئی منڈیاں قائم ہوتی ہیں اور اسلام کی روشنی آگے آگے پھیلتی جاتی ہے۔

انگریزی تعلیم | اسلام کے جاں پرور تعلیمی کام پر ایک نگاہ ڈال لینے کے بعد اب ہم سوڈان کی ملکی تعلیم پر ایک نظر ڈالیں گے۔

سوڈان کے انگریزی حاکموں کے متعلق اور خواہ کچھ بھی کہا جائے یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ انہوں نے اس وسیع و عریض ملک کو پہلی بار سیاسی وحدت عطا کی اور اندرونی بدنظمی اور بیرونی خطرے کا خاتمہ کر کے پُرامن معاشری ترقی کے لیے راستہ صاف کر دیا۔ عربوں نے سوڈانی زندگی کو دو تحفے عطا کیے تھے یعنی اسلامی اخوّت اور عرب کا قبائلی نظام۔ مغرب کی مادی تہذیب کی ٹکر سے سوڈانی زندگی کی ان دونوں بنیادوں میں کمزوری نہیں آنے پائی۔ مغربی طور طریقوں کے عام ہو جانے سے بعض فرنگی یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ شاید سوڈانیوں نے اپنی ثقافت کو چھوڑ کر ان کی مادی

ثقافت کو اختیار کر لیا ہے، مگر یہ یقین دراصل خود فریبی سے زیادہ نہیں، مغربی تہذیب سے متاثر ہونے کے باوجود سوڈانی زندگی آج بھی بالکل اس طرح اپنی قومی روح کی حامل ہے جس طرح انگریزوں کی آمد سے پہلے۔ سوڈان میں جدید نظامِ تعلیم مصر کی راہ سے آیا تھا۔ اور گو اس کی اصل دینی اقدار سے بیگانہ تھی، مصری پیوند نے اسے اسلامی رنگ کی جھلک دے رکھی تھی، پس سوڈانیوں کی نگاہ میں یہ نئی تعلیم کوئی ایسی شے نہیں تھی جو ان کے پرانے نظامِ حیات میں ہل چل ڈالنے والی ہو، گویا انہوں نے روحانی اقدار کو ہاتھ سے دیئے بغیر مغرب کی مادی اقدار کو بھی اپنا لینا چاہا۔ ابتدائی تعلیم تک تو ان دونوں اقدار کا باہمی نباہ ممکن رہا لیکن اعلیٰ تعلیم کے بارے میں یہ خوش فہمی قائم نہ رہ سکی، چنانچہ آج سوڈان کا اعلیٰ تعلیمیافتہ طبقہ عام طور پر ذہنی اور روحانی خلجان کا شکار ہے۔

غلط آغاز سوڈان میں تعلیمی ترقی کے بارے میں سب سے قابلِ لحاظ بات اس کا غلط آغاز ہے۔ لارڈ کچنر کا سب سے پہلا کام گارڈن کالج کے قیام کے لئے روپیہ فراہم کرنے کی مہم کو جاری کرنا تھا، چنانچہ یہ کالج ۱۹۰۲ء میں قائم ہو گیا، گویا تعلیم کو نچلے درجوں سے شروع کرنے کی بجائے اسے اعلیٰ ترین درجہ سے شروع کیا گیا، وجہ بالکل ظاہر ہے، لارڈ کچنر کا منشا سوڈانی عوام کو علم کی روشنی سے بہرہ ور کرنا نہیں تھا بلکہ برطانیہ کی استعماری اغراض کو پورا کرنا، برطانوی حکام کو کچھ ایسے مقامی پرزے درکار تھے جو ان کی بولی سمجھ کر ان کے احکام کو بجا لایا کریں، اس مطلب کیلئے مٹھی بھر اعلیٰ تعلیمیافتہ لوگ کافی تھے، ملک کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ کو مکمل کرنے کے لئے اندرون اور دور و دراز حصوں کی معاشی ترقی ضروری نظر آئی، بالخصوص جزیرہ کی اقتصادی ترقی نے مقامی کارندوں کی ضرورت بہت بڑھا دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گارڈن کالج کے فارغ التحصیل لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ ملازمت میں لیا گیا اور تعلیم کا مقصد سرکاری ملازمت کا حصول قرار پایا، خود محکمہ تعلیم پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کی ہی ایک شاخ تھی اور انتظامی افسر ہی اس محکمہ کے منتظم بنے رہے، مگر ۱۹۳۰ء کی کساد بازاری نے یہ بات ناممکن بنا دی کہ ہر گریجوایٹ کو ملازمت مل جائے، چنانچہ اب اس مسئلہ

سنجیدگی سے غور شروع ہوا کہ سرکاری محکموں کی مانگ اور گارڈن کالج کے فارغ التحصیل طلبہ کی بہم رسانی کے درمیان کس طرح توازن پیدا کیا جائے، سوڈان کے فرنگی حاکموں نے پہلے دن سے تعلیم کو اپنی خالص استعماری ضرورتوں کے ماتحت رکھا تھا، چنانچہ ابتدائی تعلیم شروع سے نظر انداز رہی، ابتدائی تعلیم کا کام صرف اسی قدر طلبہ کی بہم رسانی کا سامان کرنا تھا، جو گارڈن کالج کو چلانے کے لئے ضروری تھے اور اس کالج کا منشا صرف یہ تھا کہ ترکی اور مصری ادنیٰ کارندوں کی بجائے سوڈانی کارندے پیدا کئے جائیں، تاکہ تھوڑی اجرت پر وہی کام ان سے لیا جائے جو اول الذکر کے ذمے تھا، ابتدائی تعلیم کی یہ کس مپرسی دوسری عالمگیر جنگ کے آغاز تک باقی رہی۔

یہ بہت عجیب بات ہے کہ انگریزی استعمار نے خود ہی پہلے دن سے سوڈانی تعلیم کی خشت اول ٹیڑھی رکھی اور جب اس پر ایک ٹیڑھی دیوار کھڑی ہو گئی تو خود ہی اس کج فہمی کا ماتم شروع کر دیا چنانچہ ۱۹۲۰ء میں ملنر کمیشن نے اپنی رپورٹ میں کہا، سوڈان میں وہ غلطی نہ دہرائی جانی چاہئے جو مصر میں کی گئی ہے، وہ غلطی یہ ہے کہ ایسا نظام تعلیم مروج نہ کرنا چاہئے جو طالب علموں کو کلرک کی یا دوسرے چھوٹے انتظامی عہدوں کے علاوہ اور کسی چیز کا اہل نہ بنائے اور اس طرح سرکاری ملازمت کے خواہشمندوں کی ایک اتنی بڑی جماعت پیدا ہو جائے جس کے لئے کوئی مانگ موجود نہ ہو" یہ رپورٹ بھی زبانی جمع خرچ کی حد سے آگے نہ بڑھی، تا آنکہ ۱۹۳۰ء کی عالمگیر کساد بازاری نے حالات کو زیادہ نازک بنا دیا، اس پر ۱۹۳۳ء میں ایک نیا کمیشن مقرر ہوا جس نے سفارش کی کہ تعلیمی عمارت کی بنیاد زیادہ وسیع ہونی چاہئے۔ اس کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ ۱۹۳۴ء میں ابتدائی مدرسین کی تربیت کے لئے ایک درس گاہ قائم ہو گئی، ۱۹۳۷ء میں سوڈان کی تعلیمی ضروریات کا پھر سے جائزہ لیا گیا اور ایک نیا لائحہ عمل مرتب کیا گیا۔

موجودہ حالت

دوسری عالمگیر جنگ نے قومی رجحانات کو خوب ابھرنے کا موقع دیا، چنانچہ تعلیمی سہولتوں کے عام کئے جانے کا مطالبہ ہونے لگا۔ آخر ۱۹۴۶ء میں ڈائرکٹر تعلیمات کو ایک تعلیمی منصوبہ پیش کرتے ہی بنی، جس کا منشا اگلے دس سالوں میں ملک کی تعلیمی ضرورتو

کو پورا کرنا تھا۔ ابتدائی مدرسین کی تربیت گاہ اب ایک تعلیمی انسٹی ٹیوٹ میں تبدیل ہو چکی ہے اسی طرح اعلیٰ تعلیمی اداروں کو باہم ملا کر ایک جامعہ کے قیام کی داغ بیل بھی ڈالی جا رہی ہے ابتدائی مدرسین کی تیاری کے لئے ایک اور تربیت گاہ کھولنے کی تجویز ہے۔ خیال ہے کہ دس سالہ تعلیمی منصوبہ کے پورا ہو جانے پر شہری آبادی کے ۷۵ فیصدی بچوں اور دیہاتی آبادی کے ۲۹ فی صدی بچوں کو تعلیمی سہولتیں حاصل ہو جائیں گی گو یہ تعلیم بالکل ابتدائی درجہ کی ہو گی۔ تاہم منصوبہ میں اس بات کا بندوبست کیا گیا ہے کہ ابتدائی مدارس سے فارغ ہو جانے والے طلبا کے لئے مراکز بالغاں کھولے جائیں تاکہ ان کے دوبارہ ناخواندگی میں لوٹ جانے کے امکانات پیدا نہ ہوں اسی طرح دیہات میں بھی اسی قسم کے مرکز کھولے جائیں گے۔ اور ایک دار الاشاعت بھی کھولا جائے گا جو آسان مگر عمدہ عربی لٹریچر کی بہم رسانی کا بندوبست کرے۔

مصری سوڈان کے تعلیمی نظام کو دو واضح حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے یعنی شمالی سوڈان کا نظام تعلیم اور جنوبی سوڈان کا نظام تعلیم شمالی حصے میں تعلیم بیشتر سرکاری ہاتھوں میں ہے سرکاری ابتدائی مدارس چار سال تک پڑھاتے ہیں، اس کے بعد طلبہ انٹرمیڈیٹ مدرسوں میں جاتے ہیں، جہاں چار سال مزید پڑھائی ہوتی ہے، اس کے بعد ثانوی مدارس آتے ہیں جو اسکول سرٹیفکیٹ کے امتحان کے لئے تیاری کراتے ہیں۔ اس وقت دو سرکاری ثانوی مدارس موجود ہیں اور تیسرا عنقریب کھلنے والا ہے، ان کے علاوہ کچھ غیر سرکاری مدرسے بھی موجود ہیں ان ابتدائی وسطی اور ثانوی مدرسوں کے علاوہ، دو ادنیٰ ثانوی مدرسے بھی موجود ہیں، جو تجارت اور زراعت کی دو سالہ عملی تربیت دیتے ہیں، ٹیکنیکل تعلیم کو از سر نو منظم کیا گیا ہے، اس وقت تین ٹیکنیکل مدرسے چل رہے ہیں اور کچھ اعلیٰ ٹیکنیکل مدرسوں کا قیام زیر غور ہے۔

"معاہد علمی" ایک اسلامی تعلیمی ادارہ ہے جو سنہ ۱۹۰۱ء میں قائم ہوا تھا۔ اور جو عوام کی مدد اور سرکاری اعانت سے چل رہا ہے، اس میں ۵۰۰ طالب علموں کے لئے گنجائش موجود ہے۔ اور اس کا نصاب بیس سالہ ہے، یہاں اسلامی علوم کی پوری تعلیم دی جاتی ہے۔

استادوں کی تربیت گاہ سے ہر سال ۹۰ ابتدائی اور ۴۰ وسطی درجہ کے مدرس تربیت پاکر نکلتے ہیں، اس کے علاوہ یہاں ہر سال ریفریشر کورس بھی منعقد کئے جاتے ہیں۔

جنوبی سوڈان میں تعلیم زیادہ تر عیسائی پادریوں کے ہاتھوں میں ہے۔ جنہیں سرکاری مدد مل رہی ہے، یہ مسیحی تعلیمی ادارے سرکاری نگرانی کے ماتحت ہیں، حال ہی میں کچھ سرکاری ابتدائی اور وسطی مدرسے بھی کھلے ہیں، اور ابتدائی مدرسین کی تیاری کے لئے ایک تربیت گاہ بھی کھولی گئی ہے، اسی طرح زراعتی تعلیم کے لئے دو مدرسے جاری کئے گئے ہیں،

سوڈان میں زنانہ تعلیم کی رفتار غیر معمولی طور پر سست رہی ہے، اس کی بہت سی وجوہ ہیں بڑی وجہ تو ایک اجنبی قوم کی استعماری گرفت ہے جو کسی صورت میں ڈھیلا ہونا نہیں چاہتی، پس جب موجودہ دس سالہ منصوبہ کے بعد بھی صرف پچاس فی صدی شہری بچوں کو ابتدائی تعلیم کی سہولتیں میسّر ہونے کی امید ہو اور دیہاتی بچوں کے لئے یہ تناسب صرف پچیس فی صدی رہ جائے تو بیچاری عورتیں کس شمار وقطار میں ہیں، دوسری بڑی وجہ پرانی روایات جہالت ہیں، لڑکیوں کو مدرسوں میں بھیجنا معیوب خیال کیا جاتا تھا، تاہم بعض مسیحی اداروں اور کچھ روشن خیال عورتوں کی لگاتار کوششوں سے اس میدان میں بھی کچھ کامیابی حاصل ہو چکی ہے، سب سے پہلا زنانہ ابتدائی مدرسہ ۱۹۱۱ء میں کھولا گیا تھا۔ ۱۹۲۴ء تک زنانہ ابتدائی مدرسوں کی تعداد صرف ۵ تک پہونچی، مگر استانیوں کی تربیت گاہ کے قائم ہونے کی دیر تھی کہ ان مدرسوں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی حتّٰی کہ ۱۹۴۶ء میں یہ تعداد ۷۷ تک جا پہونچی، سرکاری زنانہ مدرسوں کے علاوہ بڑے شہروں میں پرائیویٹ مدرسے بھی ہیں، ۱۹۴۷ء میں پہلی مرتبہ ایک لڑکی گارڈن کالج میں داخل ہوئی۔

سوڈانی تعلیم کی ترقی میں تربیت یافتہ استادوں کی نایابی بری طرح حائل رہی ہے، گو مرد استادوں کی بہم رسانی اب اس قدر دشوار نہیں جتنی پہلے ہوا کرتی تھی، تاہم استانیوں کے بارے میں ابھی یہ دقت رفع نہیں ہوئی، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سوڈان میں چھوٹی عمر کی شادی کا رواج بہت عام ہے، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی بننے والی استانیاں گھریلو زندگی میں داخل

ہو جاتی ہیں۔ باوجود کوششوں کے اس بات کا تدارک اب تک ممکن نہیں ہو سکا، یہی وجہ ہے کہ سوڈانی زنانہ مدارس میں غیر ملکی استانیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

مغربی تعلیم کے اثرات

مغربی تعلیم نے سوڈانی زندگی پر کیا اثر ڈالا ہے؟ یہ وہ اہم سوال ہے جس کا آخر میں جواب دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ انگریز حکمرانوں نے مغربی تعلیم کو صرف اس لئے جاری کیا تھا کہ دفتری ضرورتوں کے لئے کلرک پیدا ہو جائیں، یہ ضرورت تو پوری ہو گئی، مگر اب اس بات کا کیا علاج کہ یہ بہم رسانی روز بروز ضرورتوں سے تجاوز کرنے لگی، تا آنکہ پڑھے لکھے بیکاروں کی ایک مستقل جماعت قائم ہو گئی، حکومت نے ہر چند کوشش کی کہ تعلیم بالکل محدود رہے، لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا، اور حکومت کو اس خطرہ کے سدباب کی کوئی راہ نہ سوجھی، آخر اسے محسوس ہونے لگا کہ جو راستہ صرف اس لئے کھولا گیا تھا کہ حکومتی نظام کو زندہ رکھنے کے لئے تازہ ہوا کے آنے کا سامان کرے، وہ اب ایک تیز و تند آندھی کی گذرگاہ بنتا نظر آتا ہے، جو شاید اس نظام کی جڑوں کو ہی ہلا دے۔

سوڈان کے مغربی تعلیم پانے والے لوگوں کو آفندی کے نام سے پکارا جاتا ہے، اس گروہ کی حیثیت کم و بیش وہی سمجھنی چاہیئے جو ہمارے ہاں بابو طبقہ کو حاصل ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کلرکی حاصل کرنے کے لئے انگریزی تعلیم پائی، کچھ تو اس مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اور بہت سے اس خواہ تمنا کے صدقے نظام حکومت کے نکتہ چیں بن گئے، یہ آخری گروہ اگرچہ تعداد میں بہت زیادہ نہیں پھر بھی کیونکہ یہ لوگ مغربی طور طریقوں اور مغربی طرز حکومت سے تھوڑی بہت آگاہی حاصل کر چکے ہیں، اس لئے وہ غیر ملکی اقتدار اور استعماری لوٹ کھسوٹ پر لے دے کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے رہتے ہیں، بڑے شہروں کے قہوہ خانے اور ریستوران ان لوگوں کے عام اڈے ہیں، جہاں مصری اخبار و رسائل پر تبصرے اور گرما گرم بحثیں ہوتی رہتی ہیں، غیر ملکی حکومت کو سب سے زیادہ کھٹکا اسی جماعت سے ہے، مصر ان سوڈانی آفندیوں کا ذہنی راہنما ہے، سیاسی شعور اور ذہنی بیداری کے تمام اثرات ان تک مصر ہی کے راستے سے پہونچتے ہیں۔

سوڈان میں قومیت کا احساس اس آفندی طبقہ نے پیدا کیا ہے، ان لوگوں نے ۱۹۳۷ء میں جدید تعلیم یافتہ افراد کی ایک مؤتمر قائم کی تھی، ۱۹۴۰ء میں جب عالمگیر جنگ دنیا کی سوئی ہوئی قوموں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگا رہی تھی اس تحریک نے اور زور پکڑا، اس میں کلام نہیں کہ یہ تحریک صرف پڑھے لکھے لوگوں تک محدود رہی ہے، عوام چونکہ ان پڑھ اور جمہوری نظام حکومت سے بے خبر ہیں اس لئے یہ انہیں متاثر نہیں کر سکی۔ تاہم اس کی سیاسی اہمیت سے انکار نہیں ۱۹۳۷ء میں مؤتمر میں انتخاب صدر کے مسئلہ پر اختلاف پیدا ہوگیا، اور مہدوی اور مرغانی کے نام سے دو جماعتیں بن گئیں، یہ دونوں جماعتیں اب دو متقابل سیاسی جماعتوں کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ مہدوی جماعت کو اُمّا بھی کہتے ہیں، یہ لوگ ہمارے یونینسٹوں کی طرح انگریز کے وفادار اور مصری الحاق کے خلاف ہیں، مرغانی جماعت کا دوسرا نام اتحاد ہے، یہ ترقی پسند قوم پرستوں کی جماعت ہے جو انگریزی اقتدار کی دشمن ہے اور مصر کے ساتھ اتحاد چاہتی ہے۔

آفندیوں کے سیاسی رجحانات کو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد اب ان کی ذہنی کیفیتوں کو معلوم کرنا بھی دلچسپ ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ مغربی تعلیم سوڈانی آفندی کی روح کو متاثر نہیں کر سکی، یہ درست ہے کہ اس نے مغربی لباس اور بعض دوسرے طور طریقے اپنا لئے ہیں، مگر اس کے باوجود سوڈان کے روایتی نظام حیات کے ساتھ اس کی وفاداری کم ہونے نہیں پائی، گو کچھ آفندی ایسے بھی ہیں جو مروجہ معاشری نظام کو دل سے اچھا نہیں سمجھتے، مگر ان میں اتنی جرأت نہیں کہ اس ناپسندیدگی کو برملا ظاہر کریں، وہ چاروناچار پرانی معاشری روایات کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہیں۔ زیادہ آفندی ایسے ہیں جو مغربی رجحانات اور اپنی معاشری زندگی کو دو الگ الگ عدیدیوں میں مقید رکھتے ہیں، مثلاً اکثر دیکھنے میں آئے گا کہ ایک آفندی کا کمرۂ ملاقات جدید مغربی طرز پر آراستہ ہے۔ مگر گھر کا ماحول ٹھیٹھ پرانی وضع کا ہے، گویا ظاہری رکھ رکھاؤ اور دورنگی آفندیوں کے دو نمایاں خواص ہیں، اس کا قدرتی نتیجہ ذہنی خلفشار کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؛ وہ ذہنی ہم آہنگی جو شخصیت کو متاثر اور نگاہ کو حقیقت شناس بنایا کرتی ہے سرے سے معدوم ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سوڈانی قوم پرستی ابھی تخریبی نکتہ چینی سے آگے قدم نہیں بڑھا سکی، ابھی اس میں اعتمادِ نفس اور جراءت کی کمی ہے، جب تک اسے ذہنی ہم آہنگی اور فکری سالمیت نصیب نہیں ہو جاتی اس وقت تک اس کا جوشِ عمل زیادہ تر سلبی رہے گا ۔

کج راہ بچے

محمد عبدالعزیز

مدرس کو اپنی روزمرہ زندگی میں بعض ایسے بچوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے جو جماعتی نظام
سے باغی ہوتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو تنگ کرنے میں لذت محسوس کرتے ہیں، اگر بچے کی
ذہنی صلاحیتوں اور اس کے معمول کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ
یہ عدم مطابقت زیادہ تر بچے کی فطرت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے واقع ہوتی ہے، بچہ ایک چیز کو محسوس
کرتا ہے اور شدت سے محسوس کرتا۔ اور جو کچھ محسوس کرتا ہے اس کے عواقب کا اندازہ لگائے بغیر اس
پر عمل بھی کرتا ہے، اس پر اسے سزا ملتی ہے یا اس کی سخت تادیب کی جاتی ہے، یہ سزا یا تادیب
اس کے جذبات کو مجروح کر دیتی ہے اور مسلسل تکرار کے بعد اسے سزاؤں میں بھی لذت محسوس ہونے
لگتی ہے، وہ جب تک کچھ عجیب و غریب حرکتیں نہیں کرتا، اسے اطمینان خاطر نصیب نہیں ہوتا۔
اسے اس کی دوں فطرتی پر محمول کرنا ہماری سب سے بڑی بھول ہے، مدرس اور والدین کا یہ
فرض ہے کہ وہ بچے کا نفسیاتی مطالعہ کریں اس کی بری عادتوں سے ملول نہ ہوں، بلکہ اس کے لئے کوئی
ایسا مناسب اور موزوں ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں کہ وہ اپنی بری عادتوں کو ترک کرنے
پر آمادہ ہو جائے۔ یا غیر شعوری طور پر وہ اس نئے ماحول کا اثر قبول کرنا شروع کر دے، بچے کی
جبلی تعدیل ناممکن نہیں مشکل ضرور ہے اور اس مشکل سے گھبرانا خود تعلیم و تربیت کا منہ چڑھانا
ہے۔ دراصل تعلیم کا مقصد ہی بچے میں عمدہ خواص پیدا کرنا ہوتا ہے، ہم میں سے کتنے ہیں جو

اس فرض کو محسوس کرتے ہیں اور بچے کی زندگی میں نیا سوز و گداز اور نیا جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اگر ہمارے مدارس میں ایسے بچوں کے اعداد و شمار مرتب کئے جائیں تو ایسے کج راہ بچوں کی تعداد سیکڑوں تک پہونچ جائے گی، لیکن اس نقطۂ نگاہ سے بچے کو سمجھنے کی اس کی پوشیدہ خرابیوں کو بروئے کار لانے کی اور انہیں سدھارنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی اگر کسی بچے کی طبیعت میں شوخی و شرارت ہوتی ہے تو ماحول کی قہرمانیت اسے بدشعار بنا دیتی ہے اور بگڑی ہوئی طبیعت میں ایسے متضاد خیالات جمع ہو جاتے ہیں جو آگے چل کر اس کی تباہی کا موجب بن جاتے ہیں، دوسرے ترقی یافتہ اور متمدن ممالک میں بچے کی جبلی حسی اور جذباتی قدروں کو پرکھا جاتا ہے اور اس کے مطابق انہیں حسب موقع ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کی سعی کی جاتی ہے، زیر نظر تحریر دراصل اسی قسم کے ایک بچے کا نفسیاتی جائزہ ہے۔

تین سال ہوئے ایک ماں نے اپنے بچے کو اس کی بہت سی فطری پیچیدگیوں کے پیش نظر ہمارے ہدایت بچگاں کلینک (child guidance clinic) میں بھیجا، وہ کپڑے کتابیں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں چباتا رہتا، مدرسہ جاتے وقت اس تحریر کو راستے میں ہی ہضم کر جاتا جو اس کے معلم کے نام ہوتی، ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ اس نے اپنی گرم بنیان کو ادھیڑ ڈالا، وہ ذہین تھا لیکن اس کا کام خراب اور گندہ، اس کے کردار میں ایسے عناصر موجود تھے جو کسی معلم کے لئے کسی وقت ایک لاینحل مسئلہ بن سکتے تھے، وہ اسکول دیر سے آتا۔ نافرمانی کرتا، حکم عدولی کرتا مگر تحمل اور خاموشی سے۔ اور اکثر معمولی نظم و ضبط کو توڑتا رہتا، مثلاً کھیل کے میدان میں قطار بندی سے گریز کرتا، اس کے علاوہ یہ کہ داؤد اپنے مدرسی ماحول سے بہت زیادہ خوف زدہ اور حراساں بھی رہتا، مثلاً اسکول ختم ہوتے وقت وہ اپنے جماعتی کمرے میں کبھی داخل نہ ہوتا۔ وہ ڈرتا تھا کہ معلم نے اپنی الماری میں کوئی سیاہ مکڑی نہ چھپا دی ہو، داؤد کی ایک ٹانگ چھوٹی ہے، اس لئے وہ لوہے کا ایک نمایاں سہارا استعمال کرتا ہے اور حالانکہ لنگڑا ہے لیکن رفتار و سہولت کے اعتبار سے چلنے پھرنے میں اسے کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی، بہرصورت اس کی نیلی نیلی متجسس اور تیز آنکھیں اور اس کے

رے بھورے بال اور زرد آلود چہرے کی وضع کو نمایاں کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔
یہاں میں نے داؤد کے مزاج کی ان پیچیدگیوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اسے فی الواقع
یف وہ شاگرد بنا دیا ہے، اس پورے واقعے میں جس چیز سے مجھے دلچسپی پیدا ہوئی ہے۔
ہے دوران علاج میں اس کے اپنے پڑھنے والوں سے تعلقات۔ ان تعلقات سے بہت سی
دشواریوں کا پتہ چل جاتا ہے جو اس قسم کے بچے معلموں کے لیے پیدا کرتے رہتے ہیں، داؤد کی
سیاتی تحلیل اور زمانۂ علاج میں کلینک اور مدرسے میں مسلسل رابطہ رہا، اور جو حالات داؤد
راس کی ماں سے مجھے معلوم ہوئے تھے میں انہیں اس تصویر میں مکمل رنگ بھرنے کے لئے
بے مصرف میں لایا۔
جس وقت داؤد کو ہمارے حوالے کیا گیا ہے اس کا استاد نہایت شفیق اور ہمدرد تھا۔
سے اس سے محبت تھی اور وہ دل و جان سے کوشاں تھا کہ مدرسے کا ہوّا اسے کاٹنے کو نہ دوڑے
س کے لیے پورا ماحول وسیع اور خوشگوار ہو، وہ اس میں گھٹن سی محسوس نہ کرے، اس نے اس سے
بّت کی اسے بہلایا پھسلایا؛ اور اپنے بے پایاں صبر کی بدولت اس نے اس میں زندگی پیدا
دی اور جماعتی نظم و ضبط سے بے پرواہ ہو کر اور دوسرے بچوں سے اپنے تعلقات کو معرضِ خطر
... میں ڈال کر اس نے داؤد کے قابلِ مواخذہ جرموں کی یا تو اسے سزا نہیں دی یا اس کی
دیب کے لئے کوئی دوسری صورت نکالی، اب اگر وہ مدرسے میں دیر سے پہونچتا تو اسے ہیڈ ماسٹر کے
س پہونچ کر اپنی آمد کی اطلاع دینا ضروری نہیں تھی، کیونکہ وہ ہیڈ ماسٹر سے بہت ڈرتا تھا۔
ور جب دوسرے بچے اپنی اپنی جماعتوں میں چلے جاتے تو وہ کھیل کے میدان میں تھوڑی دیر
ک ضرور کھڑا رہتا، اس سے اس سلسلے میں کچھ بھی نہ کہا جاتا، اگر وہ کام کی طرف تھوڑی بہت
بھی توجہ دیتا تو اس کی تعریف کی جاتی، میں اس مدرس کے اس صبر و تحمل پر حیران اور متعجب
رہا، پہلے چند مہینوں ہی میں مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ داؤد کے پہلے مدرس کا طریق کار بالکل مختلف
تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے غیر متعین مزاج اور تھکا دینے والے کردار سے مبتدیوں کی

جماعت کے امن وسکون کو ہمیشہ خطرہ رہتا تھا، غالباً اسی لئے اس نے اسے جماعتی نظام کا پابند بنانے کی زیادہ کوشش کی، ممکن ہے اس کے اس چبانے اور کھدیڑنے کا برا اثر اس کے معلم نے بھی قبول کیا ہو، اس زمانہ میں داؤد کی طبیعت میں زیادہ درشتی اور مزاج میں اضطراب اور بے چینی کے آثار رونما ہو چکے تھے۔ اس کا ایک برا اثر یہ ہوا کہ وہ غدودی بیماری کا شکار ہو گیا۔ ایک نے وظائف نفسیہ کی خرابی تشخیص کی، بیمار بچہ مدرسہ کیسے آئے۔ اسے چند ہفتوں تک مسلسل گھر ہی میں رہنے کا موقع ملا۔ مدرسہ اور اس کی فضا سے دور اور یہی تو وہ چاہتا تھا۔

اس وقت تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اچھائی یا برائی، دونوں واضح اور متعین ہیں، موازنہ ہے اچھے اور برے مدرس کا، جزا و سزا کا، انفرادی افہام وتفہیم اور جماعتی اصول پرستی کا، اس کا نتیجہ کچھ زیادہ وقیع نہ رہا۔

کم وبیش ۱۸ مہینے کے علاج کے بعد داؤد کی عادتوں میں اور اس کے عمومی کردار میں نمایاں فرق پیدا ہوا، لیکن اس کے اسکول کا کام اسی طرح ڈانواں ڈول رہا، اس کی طبیعت میں اب بھی وہی درشتی تھی، وہ اپنی جماعت کا رکن بننے سے برابر گریز کرتا رہا، یوم نمائش میں اس کے والدین اس کے کام کو دیکھ کر بہت زیادہ رنجیدہ ہوتے، مگر معلمین بالعموم اس کی ماں کو قصوروار ٹھہراتے کہ وہ اس چھوٹے سے بچے سے بہت زیادہ توقع کرتی ہے، داؤد بجائے خود زیادہ الجھا الجھا سا رہنے لگا، انجام کار وہ ایک مرتبہ پھر اس احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا، اس کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی میں ایسے اوقات بھی آئے کہ اس کے جذبات واحساسات میں ایک ہیجان بلکہ ایک طوفان پیدا ہوا، اور یہی اشتعال انگیز طوفان۔ اس کی دبی ہوئی بے چینی اور اضطراب اس کی امداد کرتا ہے، حالاں کہ اکثر اس کے مدرس نے اس کی تعریف بھی کی اور وہ اپنے استحقاق کے حصول میں کامیاب بھی ہو گیا، لیکن اس نے معاً یہ محسوس کیا کہ اسے صف دوم میں دھکیل دیا گیا، اس اقدام سے مدرس کا یہ مقصد تھا کہ اس کے سر سے اسکول کے اس تھکا دینے والے کام کا کچھ بوجھ اتر جائے اور اونچی ذہنی اقدار کے حامل بچوں سے اس کے کام کا مقابلہ

بند کر دیا جائے۔

لیکن داؤد نے اس تحریک کو غلط سمجھا اور اس کے متعلق اپنا علیحدہ نظریہ قائم کر لیا اور اس کا ذہن۔ اسکول میں خود اپنی حیثیت کے متعلق گوناں گوں خیالات کا مرکز بننے لگا، اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس نے خود اپنے کام کا مقابلہ دوسروں سے کرنا شروع کر دیا، اور اسی پر اکتفا نہیں کیا اس کی آنکھیں یہ بھی دیکھنے لگیں کہ معلم کا برتاؤ اس کے ساتھ کیا ہے اور جماعت کے باقی بچوں کے ساتھ اس کی کیا نوعیت ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اسے بالکل ٹھس اور ریت کا ڈھیر سمجھتا ہے جس سے انسان کو خود کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیئے اور جو خود اپنی معمولی اور چھوٹی چھوٹی کوششوں کی تعریف چاہتا ہو، آخر وہ اس کے لئے اتنے تحمل سے کام کیوں لے، اس نے یہ محسوس کیا کہ زیادہ اچھا کام کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے، کیونکہ اب وہ اپنے آپ کو مہمل اور بے کار سمجھنے لگا تھا، اور اسے اس بات کا پورا پورا یقین ہو گیا کیونکہ اس کے معلم کو اس سے بہت معمولی توقعات ہوتی ہیں۔ بقول داؤد معلم اپنے شاگردوں کے متعلق اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان میں سے کون اہل ہے اور کون نااہل، کون ذہین ہے اور کون غبی۔ اور یہی وجہ ہے کہ بچے مختلف دھاروں میں بہتے ہوئے نظر آتے ہیں، یہاں تک تو داؤد کے جذبات تاسف پر ایسے مجروح ہوتے رہے، اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ جماعت میں اس نے اپنی حیثیت آپ متعین کر لی تھی، اس نے اپنی ماں کی تحسین کو حقیر جانا اور یہ کہہ کر کہ میں اسکول کے کام کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتا، اور مجھے کچھ بہتر کام کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، اس طرح داؤد نے ہر متعلق شخص کو دھوکا دیا اور حق یہ ہے کہ اس سے میں بھی مستثنیٰ نہیں ہوں۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ داؤد پر اس کے معلم کے برتاؤ کا اتنا شدید ردِ عمل ہوا۔ لیکن ہم یہ سمجھتے رہے کہ مدرسی ماحول میں اسے اپنی ماں کے پچھلے برتاؤ کی تکرار نظر آئی، اس کی ناکامیابی پر وہ اسے سخت دلی سے مطعون کرتی اور ماحول کے بہت سے تقاضوں سے اسے محفوظ رکھتی

اِس طریقِ کار نے بالواسطہ اور غیر شعوری طور پر اس کے احساسِ بے مقدوری کو اور شدید بنا دیا۔ اب ہم داؤد کو یہ احساس دلا سکتے ہیں کہ ہمیں اس کے ساتھ پوری پوری ہمدردی ہے اور ہمیں افسوس ہے کہ مسابقتی دوڑ میں وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے دوش بدوش نہیں کھڑا ہو سکا۔ اس مسئلے پر اس کے معلم اور ہمارے مابین جو گفتگو ہوئی اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ اُسے آسانی اور زیادہ مستعدی کے ساتھ اس بچے کو پابند نظم و ضبط بنا سکتا ہے، اور اپنی توقعات کے افق کو اچھے اور مفید نتائج سے وسیع تر کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اکثر داؤد کی زبان سے یہ کلمات ادا ہوتے رہے کہ میرے معلم نے کہا "داؤد! یہ خط اتنا اچھا تو نہیں جتنا فی الواقع اسے ہونا چاہیے تھا، لیکن یہ پہلے سے ضرور اچھا ہے، میرا خیال ہے کہ تھوڑی سی کاوش کے بعد اچھا لکھنے لگو گے۔"

میں داؤد کی اس جز رسی سے بہت زیادہ متاثر ہوا، اس نے اپنے معلم کے ان مقاصد اور رجحانات کو بخوبی سمجھ لیا تھا جو اس کے انداز و گفتار میں مخفی تھے اور غالباً جس سے وہ خود اچھی طرح واقف نہیں تھا، داؤد نے جو کچھ مجھے بتایا جب میں نے اس موضوع پر سوچنا شروع کیا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ اس کا یقین صحیح ہے کہ معلم نے اس کی صلاحیتوں کو کچل دیا ہے۔ اس نے اس سے بے لاگ محبت شروع کر دی جس میں تنقید کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اور بعینہٖ اسی طرح جیسے ایک ماں اپنے غیر مصالحت پسند بچے کو اپنے دامنِ عاطفت میں جگہ دے دیتی ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کی تقصیر کی نوعیت کیا تھی، اور ہم ماں کی اس مامتا کی قدر کرتے ہیں، لیکن ایسا کرنے میں اس نے ادائیگیِ فرض سے انحراف کیا، اس فرض کی ادائیگی سے جس کی ایک بچہ توقع رکھتا ہے۔ یعنی گھریلو زندگی سے باہر سماجی ماحول کے معیار اور حقائق کی نمائندگی کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ ہی ہمدردی اور محبت کا اظہار کرنا، اس حیثیت میں معلم ہر بچے کا اعزاز و احترام سماج کے دوسرے بالغ ممبروں کی طرح کرے گا اور ایسے محبت اور تکریم کے صلے میں دوسری چیزوں کے پہلو بہ پہلو بچوں سے ذمہ دارانہ

تعاون کے تقاضوں اور مطالبوں کی توقع رکھے گا، اگر وہ اس میں ناکامیاب رہتا ہے، ان مطالبات سے روگردانی کر کے یا بچے پر انہیں انتہائی سختی سے مسلط کر کے جو اس کی ننھی منی شخصیت کے لئے بارگراں ثابت ہو تو بچہ مسلسل اجنبیت محسوس کرتا رہتا ہے مزید براں معلم کا مخصوص سلوک اور بچے کا اسے قبول کرنا جماعت کے دوسرے بچوں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جس کے مکمل تجزیئے کی ضرورت ہے اور معلّم کو بہت سے متعلقہ مسائل سے آپ ہی آگاہی ہو جائے گی، اس مقام پر میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ ہم بچے سے یکساں سلوک کریں، یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ بہت سے اساتذہ نے مدت ہوئی اس طریق کار کو چھوڑ دیا ہے لیکن چاہیئے تو یہ کہ ہمارا رجحان اور طریق فکر ہر بچے کے لئے حقائق کا ایک ایسا معیار مقرر کر دے جو ہر بچے کے لئے یکساں مواقع مہیا کرتا ہو۔ بچوں سے جو سلوک روا رکھا جائے حق و صداقت پر مبنی ہو، صحیح اور منصفانہ ہو، یہی انداز کار ہمارے بلند مقاصد کا اہم جزو ہونا چاہیئے، ہمیں حیرت ہوتی ہے اور ہے بھی یہ ایک حیرت انگیز بات کہ ہم ہمدردی، محبت اور حوصلہ افزائی سے بیسیوں بچے فائدہ اٹھاتے ہیں، مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب انہیں اس انداز میں ڈھال دیا جائے، انہیں اس کا عادی بنا دیا جائے، یا کم سے کم محبت کرنے والوں میں اس کے اظہار کا صحیح سلیقہ ہو"۔ میں تمہیں پسند کرتا ہوں خواہ تم اس کے اہل نہ ہو لیکن دراصل حساب یا عبارت کو اسی انداز میں لکھنا چاہیئے، اور میرا خیال ہے کہ اگر تم نے اپنی کوششوں کو جاری رکھا تو یقیناً کچھ دنوں کے بعد میں تمہیں اور اچھا بنا سکوں گا

عام بچوں کے لئے بالعموم مدرسین کا نظریہ یہی ہوتا ہے لیکن جسمانی یا جذباتی طور پر ناقص بچہ ہمارے جذبات کو برانگیختہ کرتا رہتا ہے، ساتھ ہی ساتھ ہمدردی، بےزاری اور جھلاہٹ کا جذبہ مشتعل ہو جاتا ہے، اور اس سے پہلے کہ ہمیں یہ محسوس ہو سکے کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں ہم بچے کی اور خود اپنی فطرت کے خدوخال کو مسخ کر دیتے ہیں، کتنی مرتبہ داؤد نے یہ شکایت کی کہ وہ دوسرے بچوں کی طرح نہیں چل سکتا یا اس کے برعکس کتنی مرتبہ اس نے مجھے اکسایا کہ میں

اس کی خود فریبیوں میں اس کا شریک بن جاؤں"، میں بھی اتنی ہی تیزی سے دوڑ سکتا ہوں جتنی تیزی سے محمود دوڑ لیتا ہے، کیا میں نہیں دوڑ سکتا؟" ہر مرتبہ مجھے یہ ترغیب ہوتی تھی کہ میں اسکی شکایت کی تردید کر دوں اور اس کے انکار سے مطابقت پیدا کرلوں لیکن تھوڑے سے غور و خوض کے بعد مجھے حق کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے "مجھے معلوم ہے داؤد، تم اسے شدت سے محسوس کر رہے ہو، لیکن تم فی الواقع دوسرے بچوں کی طرح دوڑ بھاگ نہیں سکتے، البتہ یہ ضرور ہے کہ تم نہایت خوش سلیقگی سے چل پھر سکتے ہو، بہر صورت تم دوسرے بچوں کی طرح لکھ پڑھ سکتے ہو اس کے علاوہ اور کام بھی کر سکتے ہو، اور گانا تو تم بہتوں سے اچھا گاتے ہو۔ میں تمہاری اس چھوٹی سی ٹانگ کے باوجود تم سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی محبت میں تمہاری سالم ٹانگ ہونے کی صورت میں کرتا۔"

ابھی کچھ دنوں کی بات ہے داؤد کی جماعت میں دوسرے معلم کا تقرر ہوا، داؤد پر اس کا گہرا اثر پڑا، اس نے پھر تھوڑا بہت کپڑا چبانا اور کھد بدانا شروع کر دیا، اس علامت نے معلم میں ایک عظیم ردِ عمل پیدا کر دیا۔ اور داؤد کی باریک بین نگاہوں نے اسے بھانپ لیا، وہ ہر موقع پر نظم و ضبط کے قیام کے لئے اسے علیحدہ کر دیتا، داؤد نے اپنی ماں سے کہا "میں جانتا ہوں کہ اسے میرا اس طرح چباتے رہنا پسند نہیں لیکن میں تو ایسا ہی کروں گا کیونکہ اس سے مجھے یک گونہ سکون ملتا ہے" پھر یہ بات بھی اس کی سمجھ میں آگئی کہ یہ اس کی اپنی ذات یا اپنے کردار کی ناشائستگی نہیں بلکہ یہی مختلف علامتیں ہیں جو معلم کے لئے ناقابل برداشت بن جاتی ہیں۔

داؤد نے اس مسئلے کو میرے سامنے پیش کیا، کیوں کہ یہ اس کی مخصوص اور نمایاں مثال تھی، اور اس میں یہ خداداد صلاحیت موجود تھی کہ وہ دوسروں کے متعلق اپنے محسوسات کو الفاظ کے روپ میں پیش کر سکتا، میں اس قسم کے اور مختلف واقعات کے متعلق سوچنے لگا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ آیا اس کی شکایت زیادہ عمومی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں بہت سے لوگ مریضوں اور شاگردوں کی دشواریوں کے سلسلے میں بہانہ جو ہوتے ہیں اور ان کے کردار کی کچھ علامتیں ہماری ہمدردی یا ہماری نفرت کو کہیں زیادہ اکسا دیتی ہیں، ہم میں سے بعض

اعصابی شکست اور اسی قسم کی دوسری عادتوں سے نفرت کرتے ہیں اور بعض ان بچوں کے ساتھ زیادہ نرمی اور محبت سے پیش آتے ہیں، جو کسی جسمانی یا ذہنی تکلیف کا شکار ہوتے ہیں، یہ اپنی اپنی طبیعت اور اپنا اپنا مزاج ہے، جب میں پڑھاتا تھا تو میرے لئے طبعًا یہ سخت مشکل تھا کہ میں بچوں کے مزاج اور ان کی عادتوں سے ہم آہنگی پیدا کر سکوں، نرمی گرمی، شفقت اور سختی ان سب کے امتزاج کی ضرورت ہوتی ہے، مدرس کی نگاہیں بینا ہوں وہ جانتا ہو کہ کس وقت بچے کو دور رکھنا چاہیئے اور کب اس کے قریب آنا چاہیئے، لیکن یہ بھی عجیب مایوس کن بات ہے کہ ہم کچھ . . . بچے کو اپنے قابو میں نہیں رکھ سکتے، اوّل اوّل تو ہم بہت کچھ کوشش کرتے ہیں اس کی اصلاح کے لئے ایک طریق کار کے بعد دوسرا طریق کار اختیار کرتے ہیں، اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس پر مزید توجہ دیتے ہیں اور اسی قسم کے دوسرے اقدام کرتے رہتے ہیں اس کے بعد ہمیں یکایک یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ناکام رہے، کیوں کہ کچھ دنوں تک ممکن ہے یہ کام جاری رہے، لیکن اختتام کار پر دشواریاں پھر عود کر آتی ہیں اور یہ احساس ناکامی اتنا مایوس کن ہوتا ہے کہ ہم بچے سے بہت دور ہو جاتے ہیں، کھنچاؤ بڑھتا جاتا ہے اور ایک دن ایسا آتا ہے کہ ہم اس کے لئے محسوس کرنا ہی چھوڑ دیتے ہیں، اور کبھی کبھی تو انتقامی جذبات بھی اُبھر آتے ہیں، منتشر افکار اور پراگندہ خاطر بچوں کے ساتھ اکثر یہی ہوتا ہے، جب وہ ایک مدت تک کسی مخصوص جماعت میں رہتے ہیں تو ان کے متعلق معلم کا نظریہ بدل جاتا ہے اور اتنا زیادہ بدل جاتا ہے کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس جماعت میں دو معلم ہیں، یہ کایا پلٹ بچوں کے لئے زیادہ حیران کن ہوتی ہے۔

یہ حالات اساتذہ کی اکثریت کے لئے بار خاطر ثابت ہوتے ہیں، کیونکہ انہیں تو پہلے سے ہی کافی توجہ سے بچوں کی اصلاح کی فکر میں رہنا پڑتا ہے، اور ان کے ہر کام میں انہیں اپنے انتہائی شغف اور انہماک کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے کج رو بچے فی الواقع کیا اپنے معلموں سے کچھ ان کی حیثیت سے زیادہ تقاضہ نہیں کرتے ہیں، ایسے بچوں

کے مزاج میں داخلی اور خارجی عناصر کے امتزاج کی ضرورت ہوتی ہے، وہ متوقع ہوتے ہیں کہ ان کے
مخصوص معاملات اور ان کی ناکامیوں میں ان کے اساتذہ کا نظریہ خارجی رنگ لئے ہو۔ اور
ان کی شخصیتوں کے سمجھنے میں اس کا داخلی رنگ بھی نمایاں ہو، اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں ان سے
مستقل طور پر ہمدردانہ اور محبت آمیز سلوک کرنا چاہیئے، اور ان محسوسات کو تو گمان میں بھی نہ لانا
چاہیئے جو ہمارے جذبات کو مشتعل کرتے رہتے ہیں، اس کے باوجود میرا خیال یہی ہے کہ تا حدِ امکان
ایسے بچے معمولی اسکولوں میں دوسرے طلبہ کے ساتھ ساتھ تعلیم پائیں، کیوں کہ ایسے بچے کے لئے
ان کے ساتھ رہ کر ایک روشن دماغ بالغ بننے کا بہترین موقع ملے گا، بشرطیکہ بہت جلد وہ اپنی
صحیح سماجی حیثیت کو ختم نہیں کر دیتا اور اسے صرف اپنے جماعتی ماحول میں ہی قائم رکھ سکتا ہے۔
ذمہ داری کا یہ سارا بوجھ مدرسین پر گرتا ہوا معلوم ہوتا ہے جن لوگوں کو بچوں کے نفسیاتی علاج
سے دلچسپی ہے وہ محسوس کریں گے کہ بعض اوقات ایک یا دوسرے مریض کے متعلق معالج کی روش
باقی مریضوں سے مختلف ہوتی ہے، اسے پھر اپنے محسوسات کے اسباب کو سلجھانا ہوتا ہے، اور
دل ہی دل میں ان سے مطابقت پیدا کرنی ہوتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایسے بچوں کی اتنی امداد
تو کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے ماحول کو اپنے لئے سازگار بنا سکیں، ان کے اضطراب سے ہمیں نہ دل
مایوس، رنجیدہ یا برانگیختہ ہونے کی ضرورت نہیں، ان سب کی اصلاح ممکن ہے، لیکن شرط یہ
کہ ہم خود اپنے دل کی گہرائیوں میں جذبات کے اس خزانے کو واضح کرنے کی کوشش کرے جو
ہمارے دلوں میں مخصوص بچوں کے لئے ان کے مخصوص مشاغل کے پیش نظر نمایاں ہوتے
رہتے ہیں، اس سے ہمیں یہ اندازہ ہو جائیگا کہ بچوں کے کردار کو متاثر کرنے کے لئے ہم کہاں کہاں
معذور ہیں اور ہمارے اثرات کی حدود کیا ہیں، اس طرح اگر ہمیں ان جذبات کا صحیح علم ہوگا، جو
ان کے دلوں میں برانگیختہ ہوتے رہتے ہیں تو کسی حد تک ہم ان حالات میں اپنے عمل اور
ردعمل پر ضبط قائم رکھ سکتے ہیں ؛

تعلیمی تراشے

—— عبدالغفور چودھری

۱۸۶۰ء - ۱۸۶۱ء کا زمانہ روس کی تاریخ میں ایک طوفانی دور سے کم نہیں، ملکی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں آہستہ آہستہ انقلابی خیالات کا اثر ہو رہا تھا، ادبی، ثقافتی اور سماجی حلقوں سے خیالات کے سیلاب، امنڈ امنڈ کر ملک کی وسعتوں میں پھیل رہے تھے، سامراجی حکومت اور اس کا خوفناک جال جس کا گہرا سایہ روس پر ایک بھیانک تاریکی مسلط کئے ہوئے تھا، رفتہ رفتہ ٹوٹنے لگا۔ بالآخر ۳ مارچ ۱۸۶۱ء کو اس کی آخری آہنی کڑی ایک جھٹکے سے دو ٹکڑے ہو گئی روس کے غلام کسان آزاد ہو گئے۔

آزاد ہونا تو آسان ہے لیکن آزادی کا سنبھالنا اتنا ہی دشوار ہے، ہم اس ملک کے رہنے والے اس کا اندازہ خوب لگا سکتے ہیں، ابھی تو ہم نے آزادی کے آتشین جام کی جھلک دور سے ہی دیکھی تھی، ابھی اس کا جھاگ اٹھا تھا اور بلوری ساغر ہمارے نتھنوں تک بھی نہ پہونچنے پایا تھا کہ اس کی مہک سے ہمارے دماغ میں ایک آگ سی دوڑ گئی اور لگے بکارنے، روسی مصلحین کو بھی اسی بکار کا ڈر تھا اور اسی کے علاج کے لئے ٹالسٹائی یاس بنا پانہ اپنے دیہاتی وطن میں اسکول کھولا، دیہاتی روس کے بیچوں بیچ دیہاتی بچوں کے لئے، دیہاتی کسانوں کے لئے وہ ایک ایسی تربیت گاہ قائم کر دینا چاہتا تھا جس سے روسی کسان کے تخلیقی اور عملی قوی کو جو اعلان آزادی سے بیدار ہو گئے تھے، ایک سلسلۂ ضبط میں لایا جا سکے، وہ ان سوتوں کو ایسی نہروں

میں ڈال دینا چاہتا تھا جو سیلاب کی طرح قید و بند کو توڑنے اور نباہ کاری کا سامان مہیا کرنے کی بجائے کہر آلود اور منجمد فضا کو خوشگوار اور دلفریب بنانے میں امداد دے، آزادی کبھی دی نہیں جاتی لی جاتی ہے، یہ کوئی تحفہ نہیں جو کسی خوبصورت کشتی میں سجا کر کسان کی خدمت میں پیش کیا جا۔ یہ اس کا پیدائشی حق ہے، مگر شرط یہ ہے کہ وہ اس کا حقدار بھی ہو۔

ٹالسٹائی اپنے مدرسے میں روسی کسان کو اس عزیز شے کا حقدار بنا دینا چاہتا تھا روسی مصلحین اس تاریخی حقیقت سے آشنا تھے کہ سیاسی انقلاب بغیر ذہنی انقلاب کے مکمل نہیں ہو سکتا۔ ایسا ذہنی انقلاب جو محض اوپر کے طبقے میں پھلجھڑیاں نہ چھوڑے، بلکہ سماجی جسم کے رگ و پے میں بجلی کی طرح سرائت کر جائے، انہوں نے فرانسیسی انقلاب کے نتائج دیکھے تھے طبقۂ امرا کی ایڑیوں کے نیچے پسے ہوئے عوام نفس انسانی کے تقدس کے جذبے کے ماتحت ایک ہوائی کی طرح اوپر کو اٹھے اور ایک چھچھوندر کی طرح بیٹھ گئے اور ایک مرتبہ پھر ان پر ایک جابر اور سامراجی حکومت مسلط ہو گئی، آزادی جسم کی نہیں روح کی، مادی نہیں حقیقی شے ہونی چاہیئے اگر روسی کاشتکار اور غلام جسمانی لحاظ سے اور اقتصادی لحاظ سے نئے بال و پر پیدا کر چکا تو اُسے روحانی اور ذہنی لحاظ سے بھی وہ پرواز حاصل کر لینا چاہیئے جو اس کی سماجی اور کلچرل زندگی کے لئے نئے آسمان اور نئے زمین کی تخلیق کر سکے گا۔

جب کوئی بلند ہمت، قوم کی بنیادوں کو استوار اور سنگین چٹانوں سے بھی زیادہ استوار رکھنا چاہتا ہے تو اس کی نگاہیں مدرسوں پر اور ان کے نظم نسق پر پڑتی ہے، رُوسو نے اگر ایک طرف سوشل کنٹراکٹ (SOCIAL CONTRACT) لکھ کر انسان میں عزت نفس اور آزادی کی روح پھونک دی تو دوسری طرف ایمیل لکھ کر مدرسوں اور ان کے اساتذہ کے لئے چند خطرناک لمحاتِ فکر کا سامان مہیا کر دیا، انسان لیکن ما در سے آزاد پیدا ہوتا ہے، مگر ہر جگہ بیڑیوں میں جکڑا ہوا ملتا ہے۔ رُوسو نے انسان کے بچے کو بھی آزاد پیدا ہوتے ہوئے دیکھا۔ مگر مدرسی ماحول میں اسے ضبط کے بندھنوں، قواعد کی پابندیوں، نفسانی خوف

اور ڈر کی زنجیروں میں گرفتار پایا، اس سوستان کے آزاد فسوں گر نے جس کی رگ و پے میں کوہستانی ہوا کی خوشگوار چبھن اور تازگی دوڑ رہی تھی، وہ صور اسرافیل پھونکا جس سے یہ طلسمی بندشیں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں، اس خوفناک صور نے یورپ بھر کے سیاسی، ادبی اور تعلیمی حلقوں میں ایک تہلکہ مچا دیا سوستان سے ایک فرشتے کی یہ صدا گونجتی گونجتی جرمنی کے سیاہ جنگل میں پہونچی اور وہاں سے مدھم پڑتی پڑتی آخر کار روس کی بے پناہ وسعتوں میں اور اس کے اسٹیپ کے میدانوں کے زناٹے ہوئے جھکڑوں میں گم ہو گئی، فضا میں ایک ہلکا سا ارتعاش ایک خفیف سا تلاطم باقی رہ گیا، مگر جیسے ننھے ننھے کیڑے پتنگے بادل کی گرج اور ہوا میں اڑتی ہوئی خوشگوار نمی کو سیکڑوں میل سے جان لیتے ہیں، جس طرح ریڈیو ہزاروں میل دور کی فضائی حرکت سے اپنے تاروں کو مترنم کر دیتا ہے، اسی طرح ٹالسٹائی کے دل نے بھی روسو کا اثر قبول کیا، پندرہ سال کی عمر میں وہ روسو کا والہانہ پرستار رہ چکا تھا، اس نے مقدس صلیب کی بجائے روسو کی تصویر تمغے کی صورت میں اپنی گردن میں حمائل کر لی تھی، اس کی تصنیفات میں اکثر ایسے خیالات ملتے ہیں جنہیں وہ بچھڑے ہوئے دوستوں کی طرح دوبارہ پاکر مسرت آمیز حیرانی میں گم ہو جاتا تھا، اور اکثر یہ سمجھنے لگتا تھا کہ یہ چیزیں اس کے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں اپنے بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں بھی اس نے روسو کے امیل اور اس کے بنیادی اصولوں پر چلنے کی کوشش کی،

ٹالسٹائی نے اپنے تعلیمی نظریہ کی بنیاد تین اصولوں پر رکھی، ایک تعلیم عوام کے لئے ہو خواص کے لئے نہیں، دوسرے مدارس کے لئے نصاب کی تدوین میں اس اصول کو پیش نظر رکھا جائے مضامین کے انتخاب، ان کے لئے نصابی کتب کی تیاری، اور طریق تدریس میں عوام کی دلچسپیوں ان کی معاشی، اخلاقی اور روحانی ضروریات کا خاص لحاظ رکھا جائے، تیسرے مدرسہ کا نظام نسبط پر مبنی ہو، اسکول میں ذہنی اور عملی زندگی کی فضا جاری وساری ہو۔

آج کی گفتگو بادشاہ اور شہنشاہیت پر رہی، اس موضوع پر تو بچوں سے بھی گفتگو کرنا آسان ہیں۔ مگر میں احتیاط سے کچھ نہ کچھ بات چیت کر ہی لیتا تھا۔ میں نے بچوں کو بتایا کہ ایک حاکم کا تخیل ارتقائے انسانی کے ابتدائی ارتقائی درجوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ذہین قوموں کو بادشاہ کے قشون شکوہ اور اس کے طمطراق کی حاجت نہیں ہوتی، شہنشاہیت موجودہ حالت میں ہمارے لئے ہی بری نہیں ہے، شاہی خاندان کے لئے بھی ایسی بھلی نہیں، بے چارے شہزادے اور شہزادیاں ایک جھوٹ موٹ کی فضا میں پرورش پاتی ہیں، ان کی انفرادیت، ان کی محبتیں اور ان کے شکوے ایک بے رحم آہنی نظام کے نیچے پرزہ پرزہ کر دیئے جاتے ہیں۔ نظام کیا ہے اچھی خاصی جھوٹوں کی پوٹ ہے، ہم کہتے ہیں کہ بادشاہ کے نام سے بھلا اس قسم کے بہانوں کی کیا ضرورت ہے حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ کام وزارت کے نام سے ہے، بادشاہ کی اطاعت ہم میں سے بہتوں کے لئے مخصوص رسمی سی ہو کر رہ گئی ہے، لوگ قومی گیت کچھ ایسے ہی ڈھنگ سے گاتے ہیں، جیسے کھانے سے پہلے کی دعا، یہ پلاؤ زردے والے دستر خوان پر ختم اور درود پڑھنے والا مقدس الفاظ کو ادا کرتے ہوئے لذیذ پلیٹوں پر ہی دھیان رکھتا ہے، اس کے منہ میں پانی بے اختیار بھر بھر آتا ہے، کبھی کبھی قومی گیت گانے والا بھی یہی سوچتا رہتا ہے کہ ان مز حضرات سے کس طرح جلد سے جلد نجات ملے۔

میری نگاہ میں حساب سائنس نہیں آرٹ ہے۔ مجھے تو ایک بھی قاعدہ نہیں آتا اور میں ہمیشہ ابتدائی اصولوں سے ہی شروع کرنے کی کوشش کرتا ہوں، میں ہمیشہ CATCH QUESTION کو بہت زیادہ پسند کرتا ہوں، ایسے سوالات جن میں کوئی پیچیدہ راز ہو۔ اور جو بچے کو غور و فکر کرنے پر مجبور کر دیں حساب کو بحیثیت آرٹ جانچنے کے لئے ہمارے انسپکٹروں میں خاک اہلیت نہیں ہوتی، وہ تو معمولی گھٹیا قسم کی بازاری چیزیں ہوتی ہیں جن میں مادیت کا سخت تعفن ہوتا ہے اور مادیت کی سڑاند ان میں نکلتی رہتی ہے، اس قسم کے سوالات فی الحقیقت بچے کے ذہن

میکانکی پہلو سے اپیل کرتے ہیں، لیکن قوت متخیلہ پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ امتحانات میں تو میں اس قسم کے سوالات پوچھنا چاہتا ہوں ۰ × ۵۵،۵۵ ۷۸، × ۶۵۰۰، × ۲۳۳،۴
اندھا دھند رٹنے والا طالب علم تو فوراً ضرب دینا شروع کر دے گا۔ مگر ایک زندہ تخیل رکھنے والا بچہ پہلی نظر میں ہی صفر (۰) کی رقم کو ڈھونڈ لے گا، اور فوراً جان لے گا کہ اس سوال کا جواب بھی صفر ہے۔

ایک عورت نے آج مجھ سے پوچھا کیا آپ اپنے بچوں کو اچھی عادتیں بھی سکھاتے ہیں"؟ میں نے کہا۔ "ہرگز نہیں۔ میں انہیں آداب و رسوم نہیں سکھاتا، اگر کوئی لڑکا مجھے جناب کہہ کر خطاب کرتا ہے تو اپنی مرضی سے، مجھے یقین ہے کہ ہم عادات نہیں سکھا سکتے، سکھائی ہوئی عادتوں میں ہمیشہ ایک بناوٹ ہوتی ہے، اور اس میں انتہائی مبالغے سے کام لیا جاتا ہے، میرے لئے کسی بچے اور شریف آدمی کا نمونہ ایک ایسا انسان ہے جس میں خوش مذاقی اور حسن توازن فطری طور پر موجود ہو، ایک مرتبہ میں ایک ایسے اسکول میں گیا جہاں عادات و اطوار کی تربیت عین مذہبی اصولوں پر ہوتی تھی، میں نے ہنستا کر ایک لڑکے کے طمانچہ مارا، اس نے جواب دیا۔ جناب کا شکریہ"۔

اب میں چاہتا ہوں کہ بچے اسکول میں جانور ضرور پالا کریں، ایک تو خرگوشوں کا ڈربہ ہونا چاہئے، ایک کبوتروں کی چھتری، ایک دو کتے بھی ہوں تو کیا مضائقہ، اور ہاں بچیوں کے لئے چند بلیاں تو نہایت ضروری ہیں، ہر بچہ کچھ کبوتر ضرور رکھے، انہیں اڑایا کرے، اس طرح وہ ان کی بہت سی عادتوں کا مطالعہ کر سکے گا، قدرتی مطالعہ کے علاوہ اس مسئلے کا ایک گہرا اخلاقی اور جذباتی پہلو بھی ہے، جانور پالنے سے بچوں میں ان بے زبانوں کے لئے ہمدردی کا جذبہ اور فرض شناسی کا احساس پیدا ہوتا جائے گا، مجھے یقین ہے کہ اس طرح بچے چھٹی کے دن بھی ان جانوروں کو دانہ دنکا دینے کے لئے پہونچ جایا کریں گے۔ اس کے علاوہ کبوتروں اور خرگوشوں کے

مطالعہ سے نسلی تعلقات بھی واضح ہو جائیں گے۔

اس گفتگو میں میں آپ کو ایک اشاک سبق کے متعلق کچھ سناؤں گا۔ اس سے میری مراد وہ سبق ہے جو انسپکٹر کے کمرہ میں داخل ہوتے ہی شروع کر دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے سبق بالعموم وہ اساتذہ پڑھاتے ہیں جو اپنی تنخواہ کی ترقی کے لئے بار (BAR) پر پہونچ چکے ہیں، یہ سبق عام طور پر خارجی ہوتے ہیں اور اس کی حیثیت محض نمائشی۔ بحیثیت ایک انسپکٹر میں کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتا تھا کہ مدرس کسی خاص موقع پر کیا کچھ کر سکتا ہے بلکہ میں تو یہ دیکھتا تھا کہ اسکول کے روزمرہ پروگرام میں وہ اپنے طلبہ کو کہاں تک بڑھا سکتا ہے، وہ ان میں علمی شوق پیدا کر سکتا ہے یا نہیں حق تو یہ ہے کہ میں ہمیشہ یہ معلوم کرنا چاہا کرتا تھا کہ جماعت میں اس وقت کیا ہوتا ہے، جب میں وہاں موجود نہیں ہوتا یہ چیز معلوم کرنا آسان نہیں ہے لیکن معلوم کرنے کے قابل اور دوسری چیز ہے ہی کیا لیجئے اب آپ ایک اشاک سبق کا قصہ بھی سن لیجئے سبق کا موضوع تھا "مرغی" کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا آٹھ آٹھ نو نو سال کے کوئی پچاس لڑکے مجھے دیکھتے ہی سیدھے ہو کر کچھ اکڑ کر بیٹھ گئے، گویا پچاس موم کے مجسمے تھے، چھاتی آگے کو اُبھری ہوئی اور نگاہیں استاد پر جمی ہوئیں، میں جانتا تھا کہ یہ حالت ایک دو منٹ سے زیادہ نہیں رہ سکتی تھوڑے وقفے کے بعد ان کا اکڑنا ڈھیلا پڑنے لگا، آنکھیں استاد سے ہٹ کر کمرے میں پریشان پھرنے لگیں، اس دوران میں سبق برابر چلتا گیا، تپائی پر ایک مرغی کی تصویر لگی تھی اور مدرس بار بار اس کی طرف اشارہ کرتا تھا، اس کے جسم کے حصے اور ان کے استعمال کی توضیح کرتا تھا اور جتنا کچھ بھی ہو سکتا تھا اخذ کراتا، آخر کار وہ سب سے اہم سوال پر پہونچ گیا، "بچو! بتاؤ مرغی کیا دیتی ہے" ؟ جماعت میں ایک ایک بچے کا ہاتھ اوپر اُٹھ گیا، ہر بچہ جواب دینے کے لئے بیتاب مگر اُستاد نے اپنا ہاتھ ان کے جوش وخروش کو ذرا کم کرنے کے لئے اٹھایا اور کہا، "دیکھو صبر آخر اس تیزی کی کیا ضرورت" اس کے بعد اس نے اپنی میز کے دراز سے انڈا نکالا اور میرے کان میں چپکے سے کہا کہ "میں اپنے سبق کی ہمیشہ تشریح کیا کرتا ہوں"۔ اس نے انڈا ہاتھ میں اٹھایا اور جماعت سے پوچھنے لگا "اچھا بچو! اب بتاؤ مرغی کیا دیتی ہے" اور قسم ہے خدائے پاک کی۔ ان

(مکتوب امریکہ)

پیلو آلٹو کا مرکز تعلیم بالغاں

فضل محمد خاں

دنیا میں تعلیم بالغاں کی اہمیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ مختلف ممالک میں ان مراکز کی نوعیت اور ان کا مقصد مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً ہمارے ملک میں تعلیم بالغاں سے مراد ان پڑھ عوام کی جہالت کو دور کرنا ہے۔ لیکن یو۔ ایس۔ اے میں اس کا مقصد اور مفہوم بہت زیادہ وسیع ہے۔ اس ملک میں جہالت کا سوال کیسا جہاں تعلیم مفت اور لازمی ہو اور صرف انہیں لوگوں کے لئے نہیں جو جسمانی طور پر درست ہوتے ہیں بلکہ ان کے لئے بھی جو جسمانی، اعتبار سے معذور ہوتے ہیں۔ اس لئے یو۔ ایس۔ اے میں تعلیم بالغاں کا مقصد بالغ کی شخصیت میں تنوع پیدا کرنا ہوتا ہے۔ جو اسے ذہنی اعتبار سے ہی نہیں پیشہ ورانہ لحاظ سے بھی آراستہ کر دیتا ہے اور انہیں مقاصد سے نصاب کا تعین ہوتا ہے ہمارے یہاں تعلیم بالغاں کا مقصد بالغوں کو معمولی قراءت، تحریر اور حساب دانی سکھانا ہوتا ہے، تاکہ وہ تھوڑا بہت لکھ پڑھ سکیں اور خود اپنے حساب کتاب کی بھی پڑتال کر سکیں۔ یو۔ ایس۔ اے میں تو انواع و اقسام کے تعلیمی اور پیشہ ورانہ کورس کا اہتمام ہوتا ہے۔ ان مراکز سے ملحق ایک ورک شاپ ہوتی ہے۔ تصویر کشی کا کمرہ ہوتا ہے۔ لکڑی کے کام کی دوکان ہوتی ہے۔ چمڑے کے کام کا معمل ہوتا ہے۔ گھریلو معاشیات کی تجربہ گاہ ہوتی ہے۔ مختلف دھاتوں کی ورک شاپ ہوتی ہے اور ایک وسیع ہال ہوتا ہے جس میں سماجی۔ ملکی اور دنیاوی مسائل پر بحث ہوتی ہے

ذیل میں اس قسم کے تعلیم بالغان کے ایک مرکز کا مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

یہ مرکز سینیر ہائی اسکول پیلو آلٹو (کیلی فورنیا) سے متعلق ہے، ممالک غیر کے اساتذہ جو اسٹین فورڈ یونی ورسٹی کے اسکول آف ایجوکیشن میں ثانوی تعلیم کی مخصوص تربیت کے لئے مقیم ہیں اس مرکز کو دیکھنے کے لئے گئے، یہ چند سطور ان کی یاد میں لکھی گئی ہیں۔

تعلیم بالغان کے مرکز کو کھولنے کی ضرورت

انیسویں صدی کے ربع آخر میں اور بیسویں صدی کے ربع اول میں یو ایس اے میں باہر سے آنے والے آباد کاروں کا تانتا بندھا رہا، ان میں سے بیشتر انگریزی زبان بھی اچھی طرح بول نہیں سکتے تھے، اس لئے تعلیم بالغان کے یہ مراکز کھولے گئے کہ ان بالغوں کو انگریزی کی ابتدائی تعلیم دی جا سکے ان مراکز کے قیام کا دوسرا مقصد بیرونی ممالک سے آباد ہونے والوں کو امریکی بنانا AMERICANIS-ATIRS) ہوتا ہے جس کے حصول کے لئے ان مراکز میں تجدیدی پروگرام کا اہتمام ہوتا ہے، ان کے قیام کا تیسرا مقصد یہ ہے کہ جنگ عظیم میں حصہ لینے والوں کو جو ادھر ادھر منتشر ہو گئے ہیں تعلیم دی جائے تاکہ وہ خود ہی اپنے پیشے کی تلاش میں کامیاب ہو جائیں اور اپنی روزی خود ہی کما سکیں اور بنیادی مضامین کی ضروری معلومات سے واقف ہو جائیں، ان مراکز کو شروع کرنے والوں اور انہیں چلانے والوں میں لیبر یونین، یونی ورسٹیوں، زراعتی اداروں، کتب خانوں اور چھوٹے شہروں میں سماجی گروہوں کے نام نمایاں طور پر لئے جا سکتے ہیں، پیلو آلٹو کا مرکز تعلیم بالغان بھی انہیں مقاصد کے پیش نظر قائم کیا گیا ہے۔

عمارت

بالغوں کے انواع و اقسام کے پروگراموں کا اہتمام بالعموم پیلو آلٹو سینیر ہائی اسکول کی عمارت میں ہوتا ہے، فی الحقیقت سینیر ہائی اسکول کا پلانٹ، مغرب کے وقت سے تعلیم بالغان کے مرکز میں تبدیل ہو جاتا ہے، یا کبھی کبھی چار بجے شام سے ہی۔ اسکول چار بجے بند ہوتا ہے، مرکز تعلیم بالغان کا پرنسپل، تدریسی سازوسامان، اسٹاف اور سیکریٹری سبھی دوسرے ہوتے ہیں، فرنیچر، بجلی اور دوسری چیزوں کے استعمال کے عوض میں مرکز کل اخراجات

کا چالیس فی صدی اسکول کو دیتا ہے، اس کے علاوہ تعلیم بالغاں کی بہت سی جماعتیں میتھاڈیکل چرچ، ہوائی اڈہ اور شہر کی ایک عمارت میں بیٹھتی ہیں، جو مرکز کی اپنی ملکیت ہے

نصاب آجکل پیلوآلٹو میں ۲۰ فی صدی بالغ مختلف نوعیت کے ۱۲۵ اسباق میں حصّہ لیتے ہیں، اس ادارے میں کم و بیش سو معلم کام کرتے ہیں، جن میں اسپکٹر، اسٹین فورڈ یونی ورسٹی کے گریجویٹ، امور خانہ داری سکھانے والی گرہستن مستورات، تاجر اور دوسرے پیشوں کے ماہرین شامل ہوتے ہیں، ان دنوں مختلف اسباق میں شریک ہونے والے طلبہ کی تعداد ۳۵۰۰ ہے، ہائی اسکول معیار کے تمام مدرسی مضامین کی تدریس کا اہتمام ہوتا ہے، مثلاً آرٹ اور موسیقی، تجارت اور پیشے اور ہوابازی وغیرہ۔

مالیات پچھلے سال اس مرکز کا سالانہ خرچ ۱۱۷۰۰۰ ڈالر تھا، ان میں سے ۶۶۰۰۰ ڈالر اسٹاف کی تنخواہ میں صرف ہوئے، کم و بیش پچاس فی صدی اخراجات کی کفیل خود حکومت ہوتی ہے، ۳۰ فی صدی مقامی محصولات اور ۲۰ فیصدی چندے سے پورے ہو جاتے ہیں۔

مشاورتی مجلس اس مرکز میں ایک مشاورتی مجلس بھی ہے، نصاب اور اسباق کا اہتمام اساتذہ کا تقرر اور اسباق کے لئے ضروری اشیا کا انتظام اسی مجلس کے سپرد ہوتا ہے

امتحانات صرف ہوابازی اور تجارتی مضامین کے امتحانات ہوتے ہیں، تعلیمی و تدریسی مضامین میں امتحانات نہیں ہوتے، کامیاب بالغوں کو فیکٹریوں کارخانوں اور تکنیکی شعبوں میں ملازمت حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

جماعت کا معائنہ ہمیں چمڑے کی صنعت کے عمل، لکڑی کے کام، دھاتوں کی ورکشاپ خود ورکی مشین، ہوائی جہازوں کے خاکے وغیرہ کو دیکھنے کا موقع ملا، ہم نے بھی ان کے مذاکرات میں حصّہ لیا۔

مقابلہ پیلوآلٹو کے مرکز تعلیم بالغاں کے اس مختصر بیان سے یہ واضح ہو جائے گا کہ امریکی مراکز تعلیم بالغاں اور ہمارے ملک کے مراکز میں کیا فرق ہے۔ ہمارے

ملک میں یہ مراکز خالص تعلیمی ہوتے ہیں اور یو ایس اے میں پیشہ ورانہ۔ وجہ بالکل واضح ہے، ہم جہالت کو دور کرنا چاہتے ہیں، اور امریکہ میں زیادہ ہنرمند کارکنوں کی مانگ ہے۔

امریکہ میں تعلیم بالغاں کے مراکز کی طرف خاص توجہ دی جاتی ہے۔ ان کی اہمیت ہائی اسکولوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ ان مراکز کی شرح امداد ہائی اسکولوں کے مطابق ہوتی ہے اور اپنے پروگرام کے لئے وہ ہائی اسکول ہی کی عمارتوں کو استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں تعلیم بالغاں کے مراکز کو ایسی سہولتیں میسر نہیں ہوتیں۔

تعلیم بالغاں کے مراکز پورے ملک میں پبلک ہائی اسکول سے ملحق ہوتے ہیں اس طرح فی الواقع وہ پبلک مدارس بن جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے انتظامات کی کمی ہے ہمارے مراکز بالعموم نارمل اسکولوں سے متعلق ہوتے ہیں اور بعض مقامات پر مقامی مکتبوں سے وابستہ کر دیئے جاتے ہیں۔ اسی لئے ان کی تعداد بھی بہت کم ہے اور بالغوں کی اس کثیر آبادی کے لئے مفید بھی نہیں ثابت ہوتے۔

کاغذ

——— مختار علی جعفری

کاغذ اس مہذب دنیا کی زندگی کا ایک ضروری جزو ہے، اور اگر یہ دفعتاً نابود ہو جائے تو ہمارے بہت سے کام رُک جائیں، اخبار بند ہو جائیں کوئی اشتہار نظر نہ آئے، طلباء کو پڑھنے کے لئے کتابیں اور لکھنے کے لئے کاپیاں بھی میسر نہ آئیں، لیکن کاغذ آج اتنا عام اور سستا ہو چکا ہے کہ ہماری نگاہ میں اس کی اہمیت کچھ نہیں اور ہمارے ذہن میں یہ خیال تو کبھی آتا ہی نہیں کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب دنیا میں کاغذ کا وجود نہ تھا اور نہ لوگوں کو اس کی ضرورت کا احساس یہ وہ زمانہ تھا جب آدمی اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے اشاروں سے کام لیتا تھا۔

جب آدمی نے اپنے خیالات کا اظہار شکلوں یا الفاظ کے ذریعے شروع کیا تو اُس نے ایسی چیزوں کی تلاش شروع کی جس پر وہ انہیں بنا سکے، پہلی اشیا جن کو اس نے اس کام کے لئے استعمال کیا وہ ہڈیاں، پتھر اور لکڑی تھی، پھر اس نے پتھر یا مٹی کی تختیاں بنائیں اور ان کے بعد کپڑوں، درختوں کے پتوں اور جانوروں کی کھالوں کا استعمال شروع کیا، اس کے بعد جانوروں کی کھالوں سے چرمی کاغذ (PARCHMENT) تیار کیا، جسے وکلاء یورپ اور امریکہ میں انیسویں صدی تک استعمال کرتے رہے، لیکن ان تمام چیزوں میں کوئی نہ کوئی نقص تھا، کچھ وزنی تھیں اور کچھ مہنگی، اس کا صحیح اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ گوٹنبرگ میں ایک انجیل کی طباعت کے لئے تین سو بھیڑیں کام میں آئیں۔

پہلی صدی مسیحی میں جنہوں نے ہڈیوں اور درختوں کی چھال کی بجائے بانس اور ریشم کا

استعمال شروع کیا، لیکن جب ان میں خطاطی اور خوشنویسی کا شوق بڑھا اور انہوں نے اونٹ کے بالوں سے بنا ہوا برش اور رنگ استعمال کرنا شروع کیا تو انہیں اس ضرورت کا احساس بھی ہوا کہ لکھنے کے لیئے ایسی چیز تلاش کی جائے جو بنے ہوئے کپڑے سے زیادہ کارآمد ہو۔

۱۰۵ء میں ایک چینی خواجہ سرا سائی لون نامی نے سیاٹے اور سام دار سانچوں پر بنائی ریشوں کو پانی سے نرم کر کے پتلی پتلی تہ با مسلح تیار کی جس کو حقیقتاً کاغذ کی حیرت انگیز ایجاد کہا جاسکتا ہے، اس ایجاد کی اہمیت کے پیش نظر چینیوں کی نگاہ میں سائی لون کا رتبہ دیوتا سے کم نہ تھا، اور آئندہ چینی نسلیں اسے احترام کی نگاہ سے دیکھتی رہیں، کاغذ کی صنعت اور اس کا استعمال بہت سرعت سے بڑھتا چلا گیا اور زمانۂ مابعد کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کاغذ کو محض لکھنے اور پڑھنے ہی کے کام میں نہیں لایا گیا، بلکہ ملک کے دور و دراز حصوں میں گھروں اور عبادت گاہوں کی زینت کے لیئے بھی استعمال کیا گیا۔

پرانے زمانہ میں موجد اکثر بخل سے کام لیتے تھے، اس لیئے کاغذ بنانے کا فن صدیوں تک چین میں ہی محدود رہا، ساتویں صدی کے آغاز میں کاغذ بنانے کا راز کوریا سے جو اس وقت چین کا ایک حصہ تھا جاپانیوں نے سیکھا ۷۷۰ء میں جاپانیوں نے ملکہ شوتوکو (SHOTOKU) کے حکم سے کاغذ پر تعویذیں چھاپیں، اور اس لحاظ سے دنیا میں سب سے پہلے کاغذ پر چھپائی کا کام جاپان میں ہوا۔

مغرب میں کاغذ کے متعلق معلومات پہونچنے میں اور بھی دیر لگی کیونکہ حکومت چین نے کاغذ کی صنعت کے راز کو بہت سختی سے چھپائے رکھا، ۷۵۱ء میں ترکستان میں دریائے چارز کے کنارے چینیوں نے ایک لڑائی لڑی، اس جنگ میں کچھ چینی قیدی مصریوں کے ہاتھ آئے، ان قیدیوں میں کاغذ بنانے کا تجربہ رکھنے والوں کی تعداد اچھی خاصی تھی، مصریوں نے ان قیدیوں کو کاغذ بنانے کے کام پر لگایا اور ۹۰۰ء میں مصر میں کاغذ بنایا جانے لگا، ۱۱۰۰ء میں یہ صنعت فیض اور مراقش میں جاری ہوئی اور یہاں سے یہ فن اسپین میں پہونچا۔

سب سے پہلی کاغذ بنانے والی مل ویلنسیا کے صوبہ جٹیوا میں قائم ہوئی۔ سنہ ۱۱۵۰ء میں اللادریسی نے جو ایک جغرافیہ داں تھا اس شہر کے متعلق لکھا ہے "یہاں ایسا اچھا کاغذ تیار ہوتا ہے کہ مہذب دنیا میں کسی اور جگہ اتنا اچھا کاغذ تیار نہیں ہوتا، اور یہاں سے کاغذ مشرق اور مغرب میں بھیجا جاتا ہے"۔ کاغذ بنانے والے اکثر یہودی تھے جو خلیفہ کے زیر سایہ اپنا کام کرتے رہتے تھے۔ سنہ ۱۲۳۸ء میں جیمز اول نے ویلنسیا کے صوبہ کو دوبارہ فتح کیا اور یہ یہودی کاریگر اپنے نئے آقا کے سایۂ عاطفت میں امن سے رہنے لگے۔

اس طرح کاغذ بنانے کی دستکاری کو چین سے یورپ تک پھیلنے میں تقریباً ہزار سال سے زیادہ عرصہ لگا، لیکن یورپ میں ابتداً کاغذ کو پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ کاغذ زیادہ مہنگا تھا، دوسرے چرمی کاغذ کی نسبت جلد پھٹ جاتا تھا، اور تیسری وجہ یہ تھی کہ اس صنعت کو رواج دینے والے "کفار" تھے بایں ہمہ سنہ ۱۲۷۶ء میں انکونا کے قریب اٹلی میں فیبریانو میں کاغذ بنانے کی ایک فیکٹری قائم ہوئی اور جلد ہی یہ ترقی کر گئی حتیٰ کہ فیبریانو کے شہری نشان (COAT OF ARMS) پر یہ الفاظ درج کیے گئے "فیبریانو سے تمام دنیا میں کاغذ بھیجا جاتا ہے"۔

اس ترقی کا راز اٹلی کے کاری گروں کی مساعی میں مضمر تھا جنہوں نے کاغذ بنانے کے فن میں مزید اصلاحات کیں، اور ان کاری گروں کی بدولت تیرھویں صدی میں کاغذ کے بارہ تختوں کی قیمت وہی ہوتی تھی جو ایک چرمی کاغذ کی تھی، اس کے بعد پے در پے بولونا، سیوی ڈیل پیڈوا، ٹریوائیز، اور جنیوا میں کاغذ بنانے کے کارخانے قائم ہوئے اور اٹلی کے کاغذ کی شہرت ایشیا تک پھیل گئی۔

فرانسیسی اور جرمن بہت عرصہ تک اس کاغذ کو خریدتے رہے اور بالآخر سنہ ۱۳۴۸ء میں فرانس میں کاغذ بنانے کے کارخانے ٹرائز اور بار لی ڈیوس کے مقامات پر قائم ہوئے، کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد نیورمبرگ سینیٹر المان سٹرومر نے اٹلی کے کاری گروں کی مدد سے ایک کارخانہ قائم کیا۔ کاغذ سازی کی تاریخ میں سنہ ۱۳۹۱ء میں اس مل کے کام کرنے والوں نے سب سے پہلی

ہڑتال کرنے کی سعی کی، مجموعی طور پر اس صنعت نے آہستہ آہستہ ترقی کی۔ اور جب کبھی مقامی ضرورتیاً کی وجہ سے مانگ بڑھ جاتی تھی تو نیا کارخانہ قائم ہو جاتا تھا۔ مثلاً بیل کی جنرل اسمبلی نے کاغذ کا ایک کارخانہ ایسے ہی حالات کے ماتحت قائم کیا تھا۔

پندرھویں صدی کے وسط میں مغرب میں چھاپہ خانہ کی ایجاد کے بعد فن طباعت کے رواج پانے سے کاغذ کی صنعت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اور اصلاحات کے زمانہ میں کاغذ کے استعمال میں بہت بڑا اضافہ ہوا تاہم انگلستان میں کاغذ کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا سولھویں صدی کے آخر میں ملکہ الزبتھ کے ایک جرمن سنار جان اسپیلمین نے ایک کارخانہ قائم کیا جسے بہت جلد فروغ حاصل ہوا۔

اس سے قبل ولندیزیوں نے ڈورڈورش (DOR DRECHT) میں ایک کارخانہ قائم کیا تھا، کہتے ہیں کہ کسی کا گھر جلے اور کوئی ہاتھ سینکے، جب جرمنی تیس سالہ جنگ کی مصیبت میں گرفتار تھا اور فرانس نانیتر (EDICTS OF NANTES) کی تنسیخ کے بعد فرانسیسی غلطیوں پر غلطیاں کرتے رہے تو ولندیزیوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، اور اس صنعت میں اتنی ترقی کی کہ سترھویں صدی میں ولندیزی کاغذ دنیا میں سب سے زیادہ نفیس سمجھا جاتا تھا اور ولہیلم رٹنگ ہوسن (WILHELM RITTINGHAUSEN) نے ایمسٹرڈم میں اس فن کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد وہ امریکہ چلا گیا، جہاں اس نے ۱۶۹۰ء میں فیلڈ ڈیلفیا میں جرمن ٹاؤن میں ایک کارخانہ کھولا۔ یہ کارخانہ اس نئی دنیا میں پہلا کارخانہ نہ تھا۔ کیونکہ میکسیکو میں کل ہوکان میں ایک کارخانہ پہلے سے قائم تھا، جہاں کاغذ تیار ہوتا تھا، اور مایا کے رہنے والوں نے تو صدیوں پیشتر ہی کاغذ بنانے کا فن معلوم کر لیا تھا۔

سترھویں صدی کے آخر میں تمام مغربی ممالک میں کاغذ تیار کیا جاتا تھا، مگر اس کے بنانے میں اسی طرح جسمانی مشقت سے کام لینا پڑتا تھا جس طرح پندرہ سو برس پہلے چین میں کاغذ بنانے والوں نے کام لیا تھا۔

اس زمانہ میں بھی جب کہ مشینوں کا دور دورہ ہے، کاغذ بنانے کے طریقے وہی ہیں، کاغذ بنانے کے کام آنے والی خام اشیا مثلاً بانس، چیتھڑے، گھاس، درختوں کی چھال یا صنوبر کی لکڑی وغیرہ کو اب بھی پیسا اور نرم کیا جاتا ہے، اس کا دبانا اور خشک کرنا اب بھی ضروری ہے، اور جس طرح مشرق بعید میں ناند پر کام کرنے والے کاری گر (VATMAN) کی اہمیت مسلّم ہے، اسی طرح مغربی ممالک میں جب کبھی تھوڑی تعداد میں عمدہ قسم کا کاغذ بنانا مقصود ہو تو اس کاری گر کی اہمیت کو مشین نے کم نہیں کیا، کیوں کہ یہ کاری گر ان سانچوں کو جنہیں مادے سے بھری ہوئی ناند میں ڈال دیا جاتا ہے پھر سے نکالتا ہے اور اس ترتیب سے ہلاتا یا جھٹکتا ہے کہ وہ ریشے صحیح طور پر مل جل جاتے ہیں، اس کے بعد تہ بٹھانے والا نمدے پر کاغذ کے تختے کی تہ جماتا ہے، جب ایسے تختوں کی اچھی خاصی تعداد تیار ہو جاتی ہے تو ان کو داب دی جاتی ہے، داب دینے والا مزدور بھی فن کاغذسازی میں دستکار کی حیثیت رکھتا ہے اور ہزارہا سال گذر جانے کے بعد بھی اس کے کام میں کوئی اختراع نہیں ہوئی۔

عربوں نے کاغذ سازی کی صنعت میں اور اقوام کی نسبت ترقی کی، صدیوں پہلے وہ کاغذ بنانے میں اوکھلی اور موسل کا استعمال ترک کر چکے تھے کیونکہ عربوں کو آبپاشی میں مہارت حاصل تھی، اس لئے آبی قوت سے انہوں نے خام اشیاء کے چورہ کرنے اور پیسنے کا کام لیا، انہوں نے کاغذ بنانے کی ایک ایسی مل ایجاد کی جس میں کاغذ کوٹنے کے لئے بہت سے گھن لگے ہوتے تھے اور مختلف ممالک میں ایسی ملیں صدیوں تک کام کرتی رہیں، یہاں تک کہ سترھویں صدی میں ولندیزیوں نے اس کی بجائے ایک ایسی مشین بنائی جس میں آبی قوت سے چلنے والے پہیہ کے ذریعہ ایک لکڑی کا بیلن گھومتا تھا، اور اس میں انہوں نے چھتیس چھریاں نصب کیں، اس ولندیزی مشین میں آہستہ آہستہ اصلاحات ہوتی گئیں ۱۷۵۰ء میں جان باسکر وائل نے ایک تار کا فریم ایجاد کیا جس کے ذریعہ بالکل چکنا اور ہموار

کاغذ تیار ہونے لگا۔

کاغذ بنانے کی مشینوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ خام اشیاء کے سلسلہ میں بھی حیرت انگیز معلومات کی گئیں، سب سے پہلے رُدمر نے مشاہدہ کیا کہ بھڑیں اپنا چھتہ لکڑی کے ریشے سے تیار کرتی ہیں، جو کاغذ سے بہت ملتا جلتا ہے، اور پھر اس امر کا اعلان کیا کہ آدمی بھی لکڑی سے کاغذ تیار کر سکتا ہے، مگر ماہرین نے اس کے قول کو باور نہ کیا، اور بالآخر سکیسونی کے ایک جلاہے فریڈرک گوٹلوب کیلر نے ۱۸۴۴ء میں لکڑی کے ریشہ سے مادا تیار کیا اور موجودہ کاغذ کی صنعت کی ترقی پچاس فیصدی کیلر کی اور باقی پچاس فیصدی کے لئے مشین کے موجد کی رہین منت ہے۔

کاغذ بنانے میں سب سے بڑا عمل نمی کا خشک کرنا ہے، یہ عمل ۱۸۲۰ء تک ہاتھ سے کیا جاتا رہا، لیکن اس کے بعد مشین کا استعمال شروع ہوا۔ ۱۷۹۶ء میں نکولس لوئی رابرٹ نے کاغذ بنانے والی مشین ایجاد کی، جس کو بعد میں برائن ڈنکن اور فورڈ ڈرینیر برادرز نے مکمل کیا، اس کی بدولت اس صنعت میں انقلاب آیا، کیونکہ اس کے ذریعہ لامحدود لمبائی کا کاغذ تیار ہو سکا، جس کی وجہ سے موجودہ رولرٹی پریس کا قیام ممکن ہوا۔

مشرق بعید میں کاغذ کا زمانہ، آج سے صدیوں پیشتر شروع ہوا، اور صحیح طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ کس زمانہ اور کن لوگوں نے کاغذ کا سب سے زیادہ استعمال کیا، چھٹی صدی میں شہنشاہ کاؤسونگ نے کاغذ کا روپیہ جاری کیا، بلکہ چاندی کے سکوں کی بجائے اس کو قبروں میں بھی رکھا جاتا تھا، مارکوپولو کا بیان ہے کہ "چینی رسومات منانے کے مواقع پر بڑی تعداد میں مختلف قسم کے کاغذوں کو نذر آتش کرتے ہیں"۔ اس سے پہلے ترک سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں چینی گھروں میں کاغذ کا استعمال کرتے ہوئے لکھا ہے، "پہننے کے کپڑوں کا استر۔ سینڈل۔ سلیپر۔ کھلونے۔ پٹاخے اور آتشبازی کا سامان بنانے میں کاغذ کا استعمال عام طور پر کیا جاتا ہے"۔

جاپان میں بھی کاغذ سے مختلف کام لئے جاتے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے ڈھانکنے (اور سائنس کی مدد سے یہ طریقہ بہتر بھی ہے کیونکہ الٹراوائلٹ (ULTRA VIOLET) شعاعیں کاغذ میں سے گذر جاتی ہیں) لالٹین، پردے، چھتریاں، اوورکوٹ، تھیلے اور غلاف وغیرہ کے لئے کام میں لاتے تھے۔

یورپ اور امریکہ میں لکڑی کے ریشہ سے مادا تیار کرنے کی معلومات سے پیشتر گاڑیوں کے بنانے والوں نے کاغذ کی گاڑیاں بنائی تھیں لیکن خام اشیاء کی کمی کی وجہ سے اس صنعت میں رکاوٹ پیدا ہو گئی، یہاں تک کہ ۱۸۵۰ء میں امریکہ کی چند ایک کاغذ کی فرموں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے مصر سے ممیوں (MUMMIES) کو درآمد کیا اور کاغذ بنانے میں ان کی پٹیاں استعمال کیں، اسی زمانہ میں حسن اتفاق سے لکڑی کے ریشہ سے مادا بنانے کی معلومات کاغذ بنانے کی صنعت کو ترقی دینے کا موجب ہوئی اور ۱۸۵۴ء میں نیویارک میں قمیصوں کے سامنے کا حصہ کالر اور کف کاغذ کے بنے ہوئے بازار میں بکنے لگے۔

اس کے دس سال بعد پیش بند (APRONS) ہیٹ۔ فرش اور دریاں کاغذ کی بنی ہوئی ملنے لگیں، کاغذ تابوت کے بنانے کے کام میں بھی آنے لگا، اس کے علاوہ مکانات اور گرجا بنانے میں بھی استعمال ہوا، چنانچہ ایک گرجا اوسلو اور دوسرا لندن میں بنایا گیا۔

۱۸۸۳ء میں ڈریسڈن کے ایک گھڑی ساز نے ایک گھنٹہ تیار کیا جو تمام و کمال کاغذ کا بنا ہوا تھا۔ ۱۸۹۱ء میں بیل کمپنی ٹیلیفون کے تاروں کے حاجز (INSULATOR) کے طور پر کاغذ کا استعمال کیا۔ ۱۸۹۷ء میں شکاگو میں گھوڑے کی نعلیں کاغذ کی بنی ہوئی استعمال کی گئیں۔ اور اسی طرح ہزاروں قسم کی اور اشیا تیار کی جاتی تھیں، اور آج کاغذ چودہ ہزار مختلف کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے اس میں شک نہیں کہ پلاسٹک اس کی جگہ بہت حد تک لے لے گی لیکن آج طباعت کا کام اتنا بڑھ چکا ہے کہ لاکھوں ٹن میں اس کی مانگ ہے، اور کاغذ بنانے والے اس مانگ کو پورا نہیں کر سکتے۔

سنہ ۱۹۵۰ء کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ کاغذ یا ستہلائے متحدہ امریکہ میں استعمال کیا جاتا ہے، دوسری جنگ عظیم سے پہلے ۰۰۰۸۲۲۳ ٹن کاغذ استعمال ہوتا تھا اور اب ۰۰۹۵۸۳۵ ٹن کاغذ استعمال ہوتا ہے اور دنیا میں سب سے زیادہ مقدار میں کاغذ کینیڈا میں تیار ہوتا ہے، یعنی ۰۰۷۸۸۵۴ ٹن۔ جبکہ اس ملک میں محض ۰۰۰۱۲۱۳ ٹن کاغذ استعمال ہوتا ہے۔

درخت یا پودے کے سیلولوس (CELLULOSE) سے کاغذ تیار کرنے کے لئے مندرجہ ذیل عمل کیا جاتا ہے، اس عمل کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) خام مال سے سیلولوس کے ریشوں کو علیحدہ کرنا۔

(۲) ان ریشوں کو مادے یا لئی کی شکل میں تبدیل کرنا۔

(۳) اس لئی کو کوٹنا حتیٰ کہ ریشے اتنے پتلے ہو جائیں جتنے کہ درکار ہوں اور دوسری کیمیادی اشیاء میں پوری طرح مل جائیں۔

(۴) کسی نفیس چھلنی میں کاغذ کی ایک جھلی سی بنانا، تاکہ چھلنی میں سے پانی نیچے گذر جائے لیکن اس کے ٹھوس حصے چھلنی کی سطح پر ایک پتلی تہ کی شکل میں رہ جائیں۔

(۵) اس کاغذ کی جھلی کو خشک کرنا اور پھر اسے چکنا بنانا اور مکمل کرنا۔

ہر قسم کے کاغذ کے بنانے میں سیلولوس کام میں آ سکتا ہے۔ لیکن تجارتی اغراض کے لئے محض چند قسم کے درختوں کا سیلولوس کام میں آتا ہے، آج تقریباً دو تہائی کاغذ لکڑی کے مادے سے تیار ہوتا ہے، اور کچھ کاغذ کتان۔ سنئی۔ پیال۔ گنے کے چھلکوں یا چیتھڑوں سے تیار کیا جاتا ہے اور ایک چوتھائی ردی کاغذوں سے۔

کاغذ بنانے کے کام میں عموماً صنوبر۔ حور۔ تیلیران۔ اناناس کے درختوں کا گودا کام میں آتا ہے، اس گودے کا یا تو مشین کے ذریعہ کوٹ پیس کر یا کیمیادی اشیاء کے ذریعہ ادھ ایا جاتا ہے، اس مادے میں بہت سی کثافتیں ہوتی ہیں اور اخباری کاغذ (NEWS PRINT

اسی مادے سے بنایا جاتا ہے، وہ کاغذ جو عموماً کتابوں، رسالوں اور میگزین وغیرہ میں استعمال ہوتا ہے۔ لکڑی کے گودے کو سلفائٹ یا سوڈا کاسٹک کے ذریعہ صاف کرنے کے بعد تیار کیا جاتا ہے۔ کاغذ کے تھیلے جن میں سیمنٹ یا شکر آتی ہے وہ زیادہ تر مینلوی سنی (MANILA HEWP) سے تیار کئے جاتے ہیں، اسی لئے اسے منیلا کاغذ بھی کہتے ہیں، چاول سے بنے ہوئے کاغذ کو رائس پیپر (RICE PAPER) کہتے ہیں، مگر بازار میں جو کاغذ رائس پیپر کے نام سے بکتا ہے وہ چاول سے نہیں بنایا جاتا۔ بلکہ درخت کے گودے سے ہی تیار کیا جاتا ہے۔

(ماخوذ از یونسکو کوریر)

ایمیل
یا
روسو کی تعلیم

—— تو قیر مرزا ارزقی

مسلسل ع ۱۴

چند باتوں سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جس کہانی کو ہمارے نوعمر پروفیسر صاحب نے اس خوبصورتی سے بیان فرمایا تھا اس کو وہ خود بھی بالکل نہ سمجھے تھے۔ طعام عشائی سے فراغت پاکر میں نے بچے کا ہاتھ پکڑا اور باغ میں چہل قدمی کے لئے نکل گیا۔ اثنائے گفتگو میں مجھے معلوم ہوا کہ سکندر اعظم کی پرغرور اور نمائشی شجاعت کو وہ بچہ بھی اتنا ہی پسند کرتا تھا جتنا کوئی اور پسند کر سکتا ہے۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ وہ اس قوت کو کس چیز پر مشتمل خیال کرتا تھا؟ محض اس واقعہ پر کہ وہ تیوری پر بل لائے بغیر اس بدمزہ دارو کو ایک گھونٹ میں بلاتامل پی گیا۔ پندرہ ہی روز قبل اس بیچارے بچے کو بھی ایک ایسی بدمزہ دوا پینی پڑی تھی جو بڑی مشکل سے پی جا سکتی تھی، اور جس کی کڑواہٹ ہنوز اس کی زبان پر باقی تھی۔ موت اور وہ بھی صرف بذریعہ زہر خورانی اس کے لئے ایک نہایت ناگوار احساس تھا، اور اس کی نظر میں صرف ایک صنعا کی ہی زہر معلوم ہوتی تھی۔ میں یہ ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ سکندر اعظم کی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی نے اس کے نوعمر دل پر بڑا گہرا اثر کیا تھا اور اس کے دل میں یہ بس گئی تھی کہ اس مرتبہ جب کبھی وہ کوئی دوا استعمال کرے گا تو وہ بھی سکندر اعظم ہی بن جائے گا۔ میں نے ان تفصیلات میں گئے بغیر جو صریحاً اس کی سمجھ کے باہر تھیں اس کے قابل قدر ارادے کی تائید کر دی، اور ان والدین اور استادوں کی عقل پر جو بچوں کو علم تاریخ پڑھانے کی تائید میں رہتے ہیں مسکراتا ہوا گھر واپس چلا آیا۔

بادشاہ، شہنشاہ، جنگ، فتح، قانون اور بغاوت جیسے الفاظ بچوں کو بآسانی ازبر کرائے جا سکتے ہیں، لیکن جب صاف اور صریح تخیلات کے تعلقات بھی ان الفاظ کے ساتھ ساتھ ظاہر کئے جائیں تو ان کی تشریحات باغبان رحمٰن خاں کی گفتگو سے بالکل مختلف ہوں گی۔

مجھے یقین ہے کہ بعض ناظرین "شیخ خاموش رہو" کے جملہ سے قطعاً مطمئن نہ ہوئے ہوں گے اور یہ جاننا چاہیں گے کہ سکندر اعظم کے چلن میں میں نے ایسی کونسی حقیقتاً قابل داد بات دیکھی، اور اسے نادانو اگر بتانے کی ضرورت ہے تو بھلا تم اسکو سمجھو گے کیسے؟ سکندر اعظم نیکی پر ایمان رکھتا تھا، اس نے اپنے سر اور جان تک کو ایمان پر قربان کر دیا اور اس کی اعلیٰ روح اسی ایمان کے لئے موزوں تھی، اسی گھونٹ کا بنیاد درحقیقت اس عظیم الشان ایمان کا اعتراف تھا جو اس میں ودیعت تھا کسی فانی انسان نے اس سے بہتر کوئی مذہب تلقین نہیں کیا، اگر دور حاضر میں کوئی سکندر رہے تو مجھے اس کے نام سے آگاہ فرمائیے۔

اگر بچوں کے پاس الفاظ کا ذخیرہ نہ ہو تو پھر کسی چیز کا مطالعہ ان کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا اور اگر حقیقی خیالات نہ ہوں تو ان کا حافظہ بھی حقیقی نہیں ہوتا کیونکہ میں حافظہ اس کو نہیں کہتا کہ احساسات یاد رہیں، بچوں کے دماغوں میں ان اعلانات کی فہرست کندہ کرنے سے کیا فائدہ جو ان کے لئے لایعنی ہوں؟ ان چیزوں کو جاننے کے بعد جن کا اظہار ان علامتوں سے ہوتا ہے، وہ از خود ان علامات سے واقف ہو جائیں گے۔ آپ انہیں دو دو بار یاد کرنے کی تکلیف کیوں دیتے ہیں؟ اور پھر ذرا یہ بھی تو سوچئے کہ لایعنی الفاظ کی تعلیم دیکر آپ ان میں کس قدر خطرناک تاثرات پیدا کر دیتے ہیں، بچے کے لئے پہلا بے معنی جملہ اور پہلی بات جو ذاتی نفع دیکھے بغیر دوسروں کے کہنے پر وہ تسلیم کر لیتا ہے اس کی قوت انفعالی کی تباہی کی بنا ہوتے ہیں، اسی نقصان کی تلافی ہونے

ص۱ بہت سے فلسفیوں کی تعلیم بھی بچوں کی سی ہوتی ہے، وسیع مطالعہ سے نقوش کی نسبت تخیلات کی ترقی نہیں ہوتی، تاریخ نام، مقام اور تمام اشیاء جو تخیلات سے غیر متعلق یا مفرد ہوتی ہیں، محض اپنی علامات کے باعث حفظ ہو جاتی ہیں، مطالعہ شدہ کتاب کے دائیں بائیں صفحات پر نظر ڈالے بغیر (باقی صفحہ ۴۹ پر ملاحظہ فرمائیے)

کے قبل کافی عرصہ تک وہ احمقوں کو چکا چوند اور اچنبھے میں رکھ سکتا ہے۔

اگر قدرت نے بچے کے دماغ کو اس قدر لوچدار بنایا ہے کہ وہ ہر قسم کے نقوش قبول کر سکتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بادشاہوں کے نام، تاریخ، حسب و نسب کی بھول بھلیاں، کرۂ ارض اور اس کا جغرافیہ وغیرہ تمام اس قسم کے الفاظ جو نہ تو بچے کے لئے اس عمر میں کوئی معنی رکھتے ہیں اور نہ ہی زمانہ مستقبل میں اس کو کوئی نفع پہونچا سکتے ہیں، بچے کے دماغ پر نقش کر دیئے جائیں تاکہ ان کے تلاطم سے اس کا دل اور افتادہ بچپن بھی مغلوب ہو جائے، بلکہ اس سوچ کے ذریعے آغاز سن ہی میں اس کے دماغ پر تمام کارآمد اور قابل فہم تخیلات اور ہر ایسی بات کا جو اس کی خوشحالی سے متعلق ہو اور کبھی نہ کبھی اس کے فرائض پر روشنی ڈال سکے، ایک غیر فانی چربہ یا عکس اتار دینا چاہئے تاکہ بچے کو فطرت اور قوت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی راہنمائی ہو سکے۔

بچہ کی کتاب اِس کا ماحول ہوتا ہے

بچہ کا حافظہ بغیر مطالعہ کتب معطل نہیں رکھا جا سکتا ہے ہر بات جو وہ سنتا اور دیکھتا ہے اس کے ذہن پر منقوش ہو جاتی ہے، وہ لوگوں کے اقوال اور افعال کی ایک یادداشت رکھتا ہے، اور اس کا سارے کا سارا ماحول ایک کتاب ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ نادانستہ اپنے حافظے کو مالامال کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کی قوت عمل اسی سے مستفید ہونے کے قابل ہو جاتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸ سے آگے) یا سابقہ دیکھی ہوئی شکل کا مشاہدہ کئے بغیر بمشکل ہی ہم کسی چیز کی یاد تازہ کر سکتے ہیں ، حال تک بہت سے علوم اسی نوعیت کے تھے، زمانہ حاضرہ کی سائنس کا معاملہ دیگر ہے مطالعہ اور مشاہدہ تو سنین ماضی کی باتیں ہیں، ہم خواب دیکھتے ہیں اور بُری رات کے خوابوں کو ہیں فلسفے کے طور پر بتایا جاتا ہے، آپ فرمائیں گے کہ میں بھی تو خواب ہی دیکھتا ہوں تو میں اس کو تسلیم کرتا ہوں لیکن میں وہ کام انجام دیتا ہوں جس کے انجام دینے میں دوسرے ناکام رہے ہیں، میں اپنے خوابوں کو خواب ہی تعبیر کرتا ہوں اور یہ انتخاب ناظرین پر چھوڑتا ہوں کہ ان میں سے اگر کوئی شے جاگنے والوں کے لئے کارآمد ثابت ہو تو وہ اس کو معلوم کریں۔

بچے کی ابتدائی تربیت کا حقیقی طریقہ یہ ہے کہ اس کے سامنے چھانٹ کر وہی چند اشیا متواتر لائی جائیں جن کو وہ جان سکتا ہو، اور ان اشیا کو اس سے پوشیدہ رکھا جائے جن سے واقف ہونے کی اس کو ضرورت نہ ہو، پس اس طور پر آپ اس کے پاس ایسا ذخیرہ مہیا کرانے کی سعی فرمائیں جو اوائل سنی کی تعلیم و تربیت اور زندگی بھر کے چال چلن کی خدمت انجام دے سکے، یہ سچ ہے کہ اس طریقۂ تعلیم سے بچہ معجزنما اور مافوق الفطرت نہیں بنے گا اور نہ استادوں اور استانیوں کی مہارت ہی میں چار چاند لگ سکیں گے، لیکن اس کے ذریعے ایسے شدید القوی اور صحیح الخیال آدمی ضرور تیار ہو سکیں گے جو ذہنی اور جسمانی طور پر چاق چوبند ہوں گے۔ اور وہ ایسے ہوں گے کہ زمانۂ طفلی میں تو کوئی داد حاصل نہ کر سکیں گے لیکن شہریت کا ملکہ پہونچ کر عزو وقار ضرور حاصل کریں گے۔

اسمٰعیل ایک لفظ بھی زبانی نہ یاد کرے گا حتیٰ کہ قصہ کہانی تک، چاہے وہ کہانیاں سیدھی سادی لکھی ہوئی کیوں نہ ہوں، جس طرح تاریخ کے الفاظ تاریخ ہی ہوتے ہیں اسی طرح کہانی کے الفاظ بھی کہانی ہی ہوتے ہیں، لوگ نہ معلوم اس قدر اندھے کیوں ہو جاتے ہیں کہ کہانیوں کو بچوں کے اخلاقی تعلیم سے متعلق کرنے لگتے ہیں، اور اس بات کا لحاظ نہیں کرتے کہ ان کہانیوں سے بچہ محض خوش ہی نہیں ہوتا بلکہ گمراہ بھی ہو جاتا ہے، وہ دکھاوے اور جھوٹ بولنے کا شیفتہ و فریفتہ ہو جاتا ہے اور صدق گوئی کو ضائع کر دیتا ہے، الغرض جو طریقہ کہ تعلیم کو خوشگوار بنانے کے لئے بکار لایا جاتا ہے، وہی منفعت حاصل کرنے کے مانع ہو جاتا ہے، قصے کہانیوں سے آدمی کو تو عبرت دی جا سکتی ہے، لیکن بچے کے لئے تو عریاں صداقت ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔

لافانٹن کی حکائتیں سب ہی بچے پڑھتے ہیں، لیکن ان میں سے ایک بھی ان حکائتوں کو نہیں سمجھتا، اور یہ بہت ہی اچھی بات ہے کہ وہ کچھ نہیں سمجھتے ہیں، کیوں کہ حکائیتوں کا اخلاقی سبق اس قدر پیچیدہ اور ان کی عمر کے لحاظ سے اس قدر ناموزوں ہوتا ہے کہ ان سے بچوں کے میلان کا نیکی کی نسبت بدی ہی کی طرف زیادہ احتمال رہتا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ ان حکائیتوں میں تصوف اور فلسفہ ہوتا ہے، ممکن ہے کہ ایسا ہو، لیکن آئیے! دیکھیں کہ کیا ان میں کوئی صداقت ہوتی بھی ہے،

میں تسلیم کرتا ہوں کہ جو بچہ حکایت یا قصہ پڑھتا ہے، اس کو وہ سمجھتا نہیں ہے، کیونکہ ان حکائتوں سے جو سبق آپ اخذ کرنا چاہتے ہیں وہ تخیلات کے طالب ہوتے ہیں۔ پس آپ بچے کو جس طرح بھی سمجھانے کی کوشش فرمائیں وہ اس کو نہیں سمجھ سکتا، اس کے ساتھ ساتھ ان حکائتوں کا شاعرانہ رنگ جو حافظہ کی امداد میں آسانی پیدا کر دیتا ہے بچوں کے لئے ان قصوں کو اور بھی دشوار الفہم بنا دیتا ہے، گویا کہ سادگی اور صاف گوئی کو سہولت پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ پس قطعتاً ناقابل فہم اور بے کار حکائتوں کے اس انبار کا ذکر کئے بغیر جو بچوں کو محض اس لئے پڑھا دیا جاتا ہے کہ ان کی زیر مطالعہ کتاب میں دیگر حکائتوں کے ساتھ ساتھ وہ بھی درج ہوتا ہے، آپ صرف انہی حکائتوں کے پڑھانے پر اکتفا کریں جو مصنف نے بالخصوص بچوں کے لئے ہی لکھی ہوں۔

میں لافانٹن کی جملہ حکائتوں میں صرف پانچ یا چھ ایسی حکائتوں سے واقف ہوں جو بچگانہ سادگی کے لئے ممتاز اور موزوں معلوم ہوتی ہیں، بطور نمونہ ان میں سے پہلی حکایت ذیل میں پیش کرتا ہوں، اس لئے کہ اس حکایت کا اخلاقی سبق ہر عمر کے انسان کے لئے نہایت موزوں ہے اور بچہ اس کو باسانی سمجھ سکتا ہے، اس کو یاد کرنے میں بچے کو بھی بڑی فرحت حاصل ہوتی ہے اور شاید مصنف نے یہی اپنی کتاب کی ابتدا اسی وجہ سے اس حکایت سے کی ہے، اگر مصنف کا مقصد اس سے حقیقتاً بچوں ہی کو خوش کرنا اور ہدایت دینا ہے تو یہ حکایت اس کا شاہکار ہے۔ اب آیئے اس کو پڑھیں اور مختصراً اس کی جانچ کریں۔

لومڑی اور کوّا

ایک کہانی

ایک کوّے صاحب درخت کی ایک شاخ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لفظ "صاحب" کے حقیقی اور اصلی معنی کیا ہیں؟ اسم معرفہ کے ساتھ اس لفظ کا کیا تعلق ہے؟ اس جگہ اس لفظ کا کیا مطلب ہے کوّا کیا شے ہے؟ درخت پر بیٹھنا کیا معنی رکھتا ہے؟ "بیٹھا تھا درخت پر" نہیں بولتے بلکہ

درخت پر بیٹھا تھا"۔ پس شاعرانہ الٹ پھیر کا ہم کو ضرور ذکر کرنا ہو گا، اور نظم و نثر میں تمیز کرانا بھی ضروری ہو گا۔

ایک پنیر کا ٹکڑا اپنی چونچ میں پکڑے ہوئے تھا۔ کس قسم کا پنیر؟ سوئٹزرلینڈ کا تھا۔ برطانیہ کا تھا یا ولندیزی تھا؟ اب اگر بچے نے کوّا ہی نہ دیکھا ہو تو پھر اس کا ذکر ہی کرنا بے سود ہے۔ اور اگر اس نے دیکھا ہے تو کیا وہ یقین کر سکتا ہے کہ ایک کوّا اپنی چونچ میں پنیر تھام سکتا ہے؟ آپ کو ہمیشہ قدرتی مثالیں دینی چاہئیں۔

لومڑی بیگم پنیر کی خوشبو سے متاثر ہو کر "یہ ایک لفظ مزید ہے" استانی یا بیگم، لیکن یہ خطاب لومڑی کے لئے نہایت موزوں بھی ہے، کیونکہ وہ اپنے ذاتی مفاد کے تمام فنون سے بخوبی واقف ہوتی ہے، آپ کو یہ تشریح کرنا ضروری ہوگی کہ لومڑی کیا چیز ہے، اور آپ کو اصل لومڑی اور اس کہانی کی مفروضہ لومڑی کے مابین امتیاز ظاہر کرنا بھی ضروری ہو گا۔

"AUECHE"۔ آپ کو یہ سمجھانا پڑے گا کہ یہ لفظ متروک ہے، آپ بچے کو بتا سکتے ہیں یہ لفظ صرف نظم میں استعمال ہوتا ہے، ممکن ہے بچہ آپ سے یہ سوال پوچھے کہ اشعار میں کیا مختلف زبان استعمال ہوتی ہے؛ تو پھر آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟

کوّا پنیر کو درخت پر چونچ میں دبائے ہوئے بیٹھا تھا، اس سے ظاہر ہے کہ پنیر کی بُو اتنی تیز ہو گی کہ لومڑی نے نیچے جنگل میں اس کو سونگھ لیا ہو گا، اس سے آپ اپنے اس شاگرد کو صحیح اندازہ لگانے کی تعلیم دے سکتے ہیں، جو معقول دلائل کے علاوہ ہر ایک بات کی تردید کر دیتا ہے، اور دیگر کہانیوں میں سچ اور جھوٹ کی تمیز کرنے کے قابل ہوتا ہے۔

اس طرح کوّے کو مخاطب کیا، یعنی لومڑیاں گویا بولتی بھی ہیں، کیا یہ سچ ہے؟ وہ کوّے کی مانند بولتی ہیں! اے عقلمند اساتذہ ہوشیار! دیکھیں اب آپ کیا جواب دیتے ہیں، ذرا جواب دینے کے قبل ہی سوچ لیجئے، جو آپ خیال کرتے ہیں اس سے یہ معاملہ کہیں زیادہ اہم ہے۔

"آداب عرض کوّے صاحب" یہ جاننے کے قبل کہ "صاحب" ایک اعزازی خطاب ہے۔

بچہ اس کو سن کر حقارتاً ہنسنے لگتا ہے، جو لوگ (MONSEUR DU CARBCAM) کا جملہ استعمال کریں ان کا کام محض DU کی تشریح کرنے سے ہی مختصر ہو جائے گا۔

"آپ کس قدر حسین ہیں اور مجھے کتنے بھلے نظر آتے ہیں"۔ یہ محض چاپلوسی اور ٹھگی کی گفتگو ہے، ان جملوں کے بار بار تکرار کو دیکھکر بچہ بھی لاپرواہی سے گفتگو کرنا سیکھ جاتا ہے، اب اگر آپ یہ کہیں کہ یہ فضول گوئی مصنف کی محض ایک ایجاد ہے، جو لومڑی کی عیاریوں کا ایک پہلو ظاہر کرتی ہے، تاکہ لفاظی کے ذریعہ کوّے کی تعریف و توصیف زیادہ وقیع معلوم ہو سکے بذاتِ خود تو میں اس عذر کو معقول خیال کرتا ہوں لیکن میرے شاگرد کے لئے یہ معقول نہیں ہے

"جھوٹ نہیں بولتی۔ اگر آپ کا گیت ....." اس جملہ سے کہ "جھوٹ نہیں بولتی" ظاہر ہوتا ہے بعض اوقات لوگ جھوٹ بھی بولتے ہیں، پس جب آپ یہ سمجھائیں گے کہ لومڑی جھوٹ نہیں بولتی"۔ محض اس وجہ سے کہہ رہی ہے کہ وہ حقیقتاً جھوٹ بول رہی ہے تو بچہ آپ کی بابت کیا خیال کرے گا۔

"آپ کے خوبصورت پروں کا جواب ہے"۔ جواب ہونا اس کے کیا معنی؟ ایسی مختلف اشیاء یعنی گیت اور پروں کا مقابلہ کرانے کی سعی بچے سے کرایئے پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کتنا کچھ سمجھ سکتا ہے؟

"آپ اس جنگل کے بسنے والوں میں عنقا ہیں"۔ عنقا یہ عنقا کیا چیز ہے؟ دفعتاً ہم زمانہ قدیم کی دروغ بافیوں میں غوطہ زن ہو جاتے ہیں اور دیو مالا کے کنارے جا پہنچتے ہیں۔

"اس جنگل کے باشندے" کس قدر نمائشی اور لچھے دار زبان ہے، چاپلوس اپنی زبان کو باوقعت اور موثر بنانے کے لئے شاندار طرز بیان اختیار کرتا ہے۔ کیا بچہ اس مکاری کو سمجھ جائے گا۔ کیا وہ اس سے واقف ہوتا ہے؟ شاندار اور سیدھے سادھے طرزِ بیان میں وہ کیونکر امتیاز کر سکتا ہے؟

"یہ الفاظ سن کر کوا خوشی میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے"، اس مشہور و معروف محاورے کی کامل قوت کا اندازہ کرنے کے لئے ہم کو بے حد شدید احساسی تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔

"اور اپنی لطیف اور سریلی آواز سنانے کے لئے" یاد رکھئے کہ اس فقرے کو سمجھنے اور ساری کہانی سے واقف ہونے کے لئے بچے کو یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ کوّے کی لطیف اور سریلی آواز کے معنی یہاں کیا ہیں؛

"وہ اپنا منہ کھولتا اور تسکار گرا دیتا ہے"۔ یہ فقرہ بڑا پُر لطف ہے محض اس کے خیال ہی سے سامنے تصویر کھنچ جاتی ہے مجھے ایک بڑی سی بھدی چونچ کھلی ہوئی اور شاخوں میں الجھتے ہوئے پنیر کے ٹکڑے کے گرنے کی آواز سنائی دے رہی ہے، لیکن یہ خوبی بچوں کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

"لومڑی جلدی سے اس کو اٹھا لیتی ہے اور کہتی ہے جناب عالی"۔ یعنی شرافت ایک حماقت ٹھہری، یہ سبق دینے میں یقیناً آپ کا ذرا سا بھی وقت ضائع نہ جائے گا۔

"آپ کو جاننا چاہیئے کہ ہر خوشامدی" یہ ایک عام قاعدہ ہے، بچہ نہ اس جملہ کا سر معلوم کر سکتا ہے یا نہ "اس شخص کے بل بوتے پر زندگی بسر کرتا ہے جو اس کی خوشامدی باتیں سنتا ہے"۔ اس معمہ کو کسی دس سالہ بچے نے ... تو سمجھا نہیں۔

بلاشک یہ سبق ایک پنیر کے ٹکڑے کے عوض مہنگا نہیں ہے، حکایت معقول بھی ہے اور سبق بھی عمدہ ہے، لیکن معدودے چند ہی بچے ہوں گے جو پنیر کے ٹکڑے اور اس حکایت کے سبق کا موازنہ کر سکیں، اور شاید گنتی کے ایسے بچے ہوں گے جو پنیر کے ٹکڑے ہی کو ترجیح نہ دیں لہٰذا آپ کو یہ سمجھانا پڑے گا کہ یہ تو مذاقیہ طور پر ایسا کیا گیا ہے، اب بتائیے کہ بچے کے لئے اس میں کس قدر مکاری کا سبق موجود ہے۔

"کوّے کو ندامت کے مارے کوئی سدھ بدھ نہ رہی" اور لیجئے یہ مزید بیان ہے، اور اس کا اس مرتبہ کوئی جواب بھی نہیں ہے۔

"اور اس نے بہت بعد از وقت یہ قسم کھالی کہ اس طرح کبھی نہ پھنسوں گا"۔ قسم! بھلا ایسا کون سا احمق استاد ملے گا جو بچّے کو قسم کے معنی سمجھا سکے۔

تفصیلات کا یہ کس قدر انبوہ کثیر ہے! لیکن اس حکایت کے جملہ تخیلات کو علیحدہ علیحدہ کر کے ان سادہ اور ابتدائی تخیلات میں تخفیف کرنا جن پر کہ وہ مشتمل ہیں اور وہ بھی زیادہ تفصیل طلب ہے لیکن ان کے تجزیہ کی ضرورت بچوں کو سمجھانے کے لئے بھلا محسوس ہی کون کرتا ہے؟ ایسا فلسفی ہم میں کون ہے جو خود بچہ بننے کی قابلیت رکھتا ہو؟ آئیے اب ذرا اخلاقی پہلو کی طرف بھی ایک نظر ڈال لیں۔

کیا چھ سالہ بچے کو ہم یہ سکھا دیں کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ موجود ہیں جو ذاتی منفعت کی غرض سے خوشامد کرتے اور جھوٹ بولتے ہیں، شاید ان کو کوئی یہ بھی بتا دے کہ بعض لوگ ننھے معصوم بچوں کو بھی بیوقوف بناتے ہیں، اور پیٹھ پیچھے ان کی احمقانہ نمود پر ہنستے ہیں، لیکن تمام کام تو پنیر کے ٹکڑے نے بگاڑ دیا، آپ اس کو یہ بتانے کی بجائے کہ وہ اپنا پنیر کس طرح محفوظ رکھے یہ سکھاتے ہیں کہ وہ اوروں کا پنیر کس طرح گروائے۔ یہ میرا دوسرا سمہ ہے جو سابقہ سے کسی طرح بھی کم اہم نہیں ہے

قصّے کہانیاں پڑھنے والے بچوں پر غور فرمائیے تو آپ دیکھیں گے کہ جب کبھی ان کہانیوں کے استعمال کا ان کو موقع حاصل ہوتا ہے تو وہ مصنف کے مقاصد کے بالکل خلاف ہی ان کو استعمال کرتے ہیں، اس نقص کے باعث اچھا سبق حاصل کرنے کی بجائے جو آپ ان کی حفاظت کی غرض سے دینا چاہتے ہیں ان کی طبیعت کا میلان ایسی برائیاں جذب کرنے کی طرف زیادہ ہوتا ہے جن کے ذریعہ وہ ایک دوسرے کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہو جائیں، متذکرہ بالا قصے کو سن کر سارے بچے کوّے پر ہنستے ہیں اور لومڑی کی چالبازی کو پسند کرتے ہیں، لا فانٹن کی دوسری کہانی میں آپ کو توقع ہو گی کہ وہ سب ٹڈے کی نقل کریں گے لیکن ایسا نہیں ہے، وہ در اصل چیونٹی کو پسند کریں گے، وہ کسی ذاتی توہین کا خیال نہیں کرتے بلکہ وہ ہمیشہ خصوصی اور نمایاں اداکاری کو پسند کرتے ہیں جو فطرتی چیز ہے، اور فی الواقع حب نفس کا انتخاب ہوتی ہے لیکن یہ تو خیال

دنیا کے بچوں کی کہانی کو کس قدر خوفناک سبق ملتا ہے، ایک تند مزاج اور لالچی بچے سے زیادہ قابل نفرین اور ذلیل کوئی خونخوار اژدھا بھی نہیں ہوتا کیونکہ بچہ یہ خوب جانتا ہے کہ اس سے کیا طلب کیا گیا ہے اور کس چیز سے اس نے انکار کیا ہے، چیونٹی اس کہانی میں اس سے زیادہ ہی سکھاتی ہے، وہ نہ صرف انکار کرنا سکھاتی ہے بلکہ بد زبانی بھی سکھاتی ہے، سارے قصے کہانیوں میں جن میں بالعموم شیر ببر کا نمایاں ذکر ہوتا ہے، بچے ہمیشہ انہیں سن کر شیر ہی بننا چاہتے ہیں اور جب کبھی کوئی اچھی چیز تقسیم کے لئے ان کے سپرد ہوتی ہے تو وہ اس چیز کو سب کا سب اپنے لئے ہی رکھ لینے کا خاص خیال رکھتے ہیں، لیکن جن کہانیوں میں کوئی بھنگا یا مچھر وغیرہ شیر ببر کو مغلوب کر لیتا ہے تو بچہ بھنگا ہی بننا چاہتا ہے اور ان لوگوں کو اپنے ڈنک سے ہلاک کرنے کا خواہاں ہوتا ہے، جن پر علانیہ حملہ کرنے کی جرات نہیں رکھتا ہے۔

چالاک اور غیر معتبر کتے اور بھیڑیئے کے قصہ سے مطلوبہ پرہیزگاری اور تقوے کا سبق حاصل کرنے کی بجائے بچے عیاشی کا سبق حاصل کرتے ہیں، یہ قصہ اطاعت کا سبق دینے کے لئے ایک ننھی سی بچی کو سنایا گیا، اس کو سن کر وہ اس قدر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہ میں اس کو کبھی بھول نہیں سکتا، وہ بے چاری پابہ زنجیر ہونے سے نفرت کرتی تھی، اس کو محسوس ہوا کہ زنجیروں سے اس کی گردن دکھنے لگی، پس وہ یہ خیال کر کے رونے لگی کہ وہ بھیڑیا نہیں تھی۔

پس معلوم ہوا کہ پہلے قصے سے بچوں کو خوشامد کا سبق ملتا ہے دوسرے سے ظلم اور بے رحمی کا تیسرے سے ناانصافی اور حق تلفی کا، چوتھے سے ہجو اور مذمت کا اور پانچویں سے نافرمانی اور بغاوت کا۔ یہ آخری سبق نہ آپ کے شاگرد کے لئے مفید ہے اور نہ میرے شاگرد کے لئے جس کے پاس نافرمانی کا کوئی مصرف ہے ہی نہیں، آپ اپنی اس تعلیم سے کس نتیجہ پر پہونچنے کی توقع رکھتے ہیں، بالخصوص جبکہ وہ خود ہی اپنی تردید کر دیتی ہے؟ ممکن ہے کہ اخلاقی نظام کے متعلق جن قصہ کہانیوں میں مجھے اس قدر نقائص اور کمزوریاں نظر آتی ہیں ان کو نصاب میں شامل کرنے کے لئے آپ کے پاس اتنے ہی قوی دلائل موجود ہوں، ہمارے اقوال اور اعمال دونوں ہی میں سماج اخلاقی احکام کی پابندی کرانا

چاہتی ہے۔ اور ان دونوں کے احکام بالکل مختلف اور جدا ہوتے ہیں، اول الذکر تو سوال اور جواب ہی پر ختم ہو جاتے ہیں، اور آخر الذکر وہ ہیں جو لافانوٹن نے بچوں کے لئے کہانیوں میں اور ماؤں کے لئے قصوں اور داستانوں میں درج کئے ہیں، ایک ہی مصنف نے دونوں کی خدمت کی ہے۔

ایم۔ ڈی لافانوٹن صاحب ہم آپ سے ایک سودا کرتے ہیں، یعنی میں خود تو آپ کی کتابیں خوب پڑھوں گا اور یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ آپ سے بڑی محبت کروں گا اور آپ کے قصے کہانیوں سے سبق بھی حاصل کروں گا، کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ میں ان کے معنوں اور مطالب میں کبھی دھوکا نہ کھاؤں گا، لیکن میرے شاگرد کی حد تک مجھے آپ اجازت دیں کہ اس کو میں یہ قصے کہانیاں اُس وقت تک نہ پڑھنے دوں جب تک آپ مجھے یہ یقین نہ کرا دیں کہ ایسی کہانیوں کا پڑھنا جن کا تین چوتھائی حصہ اس کے لئے بالکل ناقابل فہم ہے کوئی فائدہ پہونچا سکے گا۔ اور یہ کہ یعنی قابل فہم ربع حصہ کے متعلق یہ یقین نہ دلا دیں کہ بچہ مطالب کو الٹا نہ سمجھ لے گا اور بدمعاشوں کے مکر و فریب سے سبق حاصل کرنے کی بجائے خود بدمعاش نہ بن جائے گا۔

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

مدرسوں میں ٹیلی ویژن -

ان دنوں امریکی جریدوں میں بعض اہم تعلیمی موضوعات پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے، ان میں سے غالباً مدرسوں میں ٹیلی ویژن کا استعمال اپنی نوعیت کے لحاظ سے زیادہ اہم ہے۔ اور بقول فرینک ڈن ہم ٹیلی ویژن کے استعمال سے درس و تدریس میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو رہا ہے، یوں تو یو۔ایس۔اے میں سمعی اور بصری امداد کو تعلیم کا ضروری جزو تسلیم کر لیا گیا ہے، لیکن ٹیلی ویژن کا استعمال نئے خیالات اور نئے رجحانات کی ترویج کا پیش خیمہ ثابت ہو رہا ہے۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ تعلیم میں ٹیلی ویژن کے استعمال کو عام کیا جائے اور تعلیمی ضروریات کے پیش نظر ٹیلی ویژن کی تعداد ارتعاش کو بڑھایا جائے۔ چنانچہ ۲۰۹ ارتعاش محض تعلیمی کاموں کے لئے مخصوص کر دیئے گئے ہیں، اور یہ تعداد ٹیلی ویژن کی کل تعداد کا ۱۰ فی صدی ہے۔

امریکہ کے بیشتر جرائد امریکی پبلک اسکولوں کی تنقید کو شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ تنقید کے دو خاص پہلو ہیں۔ اوّل تو امریکی مدارس میں درس و تدریس کا مسئلہ بالخصوص بنیادی شق کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی، دوم تعلیم و تدریس میں کفایت شعاری ضروری ہے۔ جریدہ میگزین نے ان دونوں گروہوں پر شدید حملہ کیا ہے، اور یہ ثابت کیا ہے کہ امریکی مدارس آج بھی نہایت عمدہ کام کر رہے ہیں، پروگریسو ایجوکیشن نے تو اپنا ایک شمارہ اسی تنازع کے نذر کر دیا ہے اس شمارے کا تمام تر مقصد طریق تعلیم پر حملہ کرنے والوں کا جواب دینا ہے، مدیر جریدہ نے تعلیم کے ان نئے رجحانات کی موافقت میں بہت ہی موثر مضمون لکھا ہے اور ان الزامات کی تردید

ہے جو نئے تعلیمی طریقوں پر جا و بے جا کئے جاتے ہیں ۔

۱۲ جنوری ۱۹۵۲ء کو اپنے بجٹ کے پیغام میں صدر ٹرومین نے تعلیمی مسائل کے متعلق بعض سب اشارے کئے، یو، ایس، اے کی وفاقی حکومت کا ۱۹۵۳ء میں تعلیم اور تعلیمی تحقیقات کے سلسلے میں اخراجات کا تخمینہ ۲۲۴،۰۰۰،۰۰۰ ڈالر ہے، یہی اخراجات ۱۹۵۲ء میں ۲۳۸،۰۰۰،۰۰۰ ڈالر تھے اور ۱۹۵۱ء میں ۱۱۵،۰۰۰،۰۰۰ ڈالر تھے۔ ۱۹۵۳ء میں اخراجات کے نفس اضافے کی سب سے بڑی وجہ بنیادی تعلیم اور بنیادی تحقیقات کے پروگرام کی توسیع ہے پچھلے چار سال کی نسبت طلبہ کی تعداد میں اس سال ۱۰ فیصدی اضافہ ہوا ہے اور اگلے چار سال میں ۴۲ فی صدی اضافہ کی توقع ہے، ریاستیں اور مختلف تعلیمی ادارے اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں، تاکہ اسکولوں میں اتنی زیادہ بھیڑ نہ ہونے پائے ۱۹۵۱ء میں ریاستوں نے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے، اس سال ۴۰،۰۰۰ نئے کمرے تعمیر ہوئے جن پر ۱۲۱ ارب ڈالر لاگت آئی ۔

تعلیمی تحقیقات

اسکاٹش کونسل فار ریسرچ ان ایجوکیشن کی سالانہ رپورٹ ابھی حال میں شائع ہوئی ہے یہ رپورٹ صرف تحقیقات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ہی نہیں۔ بلکہ ان مدرسین کے لئے بھی مفید ہے جو جدید تعلیمی تحقیقات اور تجربوں سے فائدہ اٹھانے کے آرزومند ہیں ۔ ان میں سے بعض تو اس تحقیقاتی مشن کے موید اور کارکن ہیں، اور یہ طریق کار تو اب کم و بیش ایک قومی مہم کی صورت اختیار کر چکا ہے، اور اس معاشی بحران کے دور میں کونسل نئے کام اختیار کرنے میں معذور بھی ہے لیکن کونسل کی یہ خواہش ہے کہ اس قسم کے رضاکار اراکین کی تعداد میں اور اضافہ ہو، باہمی تعاون اور ارتباط ہی سے کسی بہتر صورت کی توقع کی جا سکتی ہے، اس کا بہترین اور موثر طریقہ یہ ہے کہ مختلف تعلیمی تنظیمی حلقوں میں تحقیقاتی جماعتیں قائم کر دی جائیں اور دوسرے تربیتی اداروں اور کالجوں سے ان کے تحقیقی کاموں کو منسلک

کردیا جائے ۔ اس باہمی تعاون سے اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں ۔ کونسل نے مختلف شعبہ ہائے
تعلیم میں تحقیقاتی کام کیا ہے ۔ اس میں دو تحقیقات تو کافی وقیع ہیں ۔ ایک تو دس سالہ بچوں کا
قومی تعلیمی سروے ۔ اس سروے میں انگریزی اور حساب کے نتائج تحقیقاتی کام کی بنیاد
قرار پائے ۔ اور اس کا تعلق اُن بچوں سے ہے جو یکم جولائی سنہ ۱۹۴۲ء اور ۳۰ جون سنہ ۱۹۴۳ء کے
درمیان پیدا ہوئے ۔ اور دوسرا اہم تحقیقاتی کام دس سال کے بچوں کے نقص سماع کو معلوم کرنا
تھا ۔ اس تحقیق کے لئے نائیفے کونٹی کو منتخب کیا گیا ، جہاں آجکل بھی سماعت پیما آلوں کی مدد سے
تحقیقاتی کام جاری ہے ، اور جہاں تعلیمی ترقی کے اسکور آسانی سے مہیا کئے جا سکتے ہیں ۔ اس
طرح نقص سماع کے متعلق بہت سی ضروری معلومات فراہم کی جا سکیں گی اور
یہ معلوم ہو سکے گا کہ مختلف بچے کس حد تک نقص سماع کے مریض ہیں ۔

کارڈف میں خود حرکی طریق

کارڈف میں خود حرکی طریق کے اجرا کو کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے ۔ ابھی حال ہی میں والدین
کے ایک وفد نے تعلیمی کمیٹی سے ایک مدرسے کے طریق تعلیم کے خلاف احتجاج کیا ۔ اس
اسکول کے صدر معلم نے اپنے مدرسے کے طریق تعلیم کی تشریح کے لئے اسکول کی مجلس
انتظامیہ کے ایک اجلاس میں شرکت کی ۔ اس جلسے میں شریک ہونے کا مقصد یہ بھی تھا کہ
والدین کے وفد نے جو احتجاج کیا ہے اور اس سے جو صورت حال پیدا ہوئی ہے اس کا جواب
موثر انداز میں دیا جائے ۔ ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ بچوں میں لکھنے پڑھنے اور تھوڑی بہت
حساب دانی کا سلیقہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ تحریر و قرأت اور حساب کا معیار روز بروز گرتا جاتا ہے
دوسرا اعتراض یہ تھا کہ بچے گھروں کو میلے کچیلے واپس جاتے ہیں ، سڑکوں پر گھومنے کی کھلی
ہوئی اجازت ہوتی ہے ، اور گھروں میں بچوں کے کردار اور آداب و اطوار سے ایک گونہ
پریشانی سی پیدا ہوتی ہے کیونکہ مدرسے میں جو طریق تعلیم و تدریس رائج ہے اس سے بچے
کے دل میں والدین کی عزت باقی نہیں رہتی ۔ صدر معلم نے واضح طور پر بیان کیا کہ جہاں تک

پڑھنے لکھنے کا تعلق ہے بچوں کے کمزور ہونے کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ صرف وہ بچے ایسے ہیں جو کمزور ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بالعموم اپنی بیماری کی وجہ سے اسکول میں حاضر نہیں رہتے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ لڑھکتے ہوئے گیند کی تلاش میں بچہ اپنی نگران معلمہ سے پوچھے بغیر سڑک پر چلا گیا ہو لیکن ان کی نگرانی کے لئے ایک معلمہ ہر وقت موجود رہتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کھیل کے جوش و خروش میں جو بچے اپنے مخصوص حفاظتی کپڑے نہیں پہنتے بعض اوقات گندے ہو جاتے ہیں، لیکن بعض بچے ایسے بھی ہیں جنہیں گھروں میں اپنی مدد آپ کرنے کی تربیت نہیں دی گئی۔ اس نے کمیٹی سے درخواست کی کہ ان نئے طریقوں کو اول اور بے کار سمجھنے کی بجائے صبر و تحمل کے ساتھ ان کی اچھائی اور برائی کو دیکھنا چاہئے اور تجربے کے لئے اچھے خاصے مواقع بہم پہونچائے جانے چاہئیں۔ بچوں کو اپنی صلاحیتیں معلوم کرنے کا موقع ملنا چاہئے تاکہ وہ بزرگوں کی گرفت کو ڈھیلا کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ اور اپنے جذبات و خیالات کا خود ہی اظہار کر سکیں۔ بعض بچے تیز رفتار ہوتے ہیں اور بعض سست رفتار۔ انہیں اپنی رفتار کے مطابق ہی چلنے دینا چاہئے۔ ڈائرکٹر نے اس سوال کے جواب میں کہ اس مدرسہ میں خود حرکی طریق کے جو تجربے کئے جا رہے ہیں وہ دوسرے مدرسوں سے بالکل مختلف ہیں اس نے کہا کہ ہر مدرسے کا ماحول اور اس کے حالات کے مطابق تجربہ کر رہی ہوں۔ کمیٹی کے ایک ممبر نے کہا کہ تعلیمی طریقہائے کار میں کچھ تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کو بھی ان تبدیلیوں کو ماننا چاہئے۔ لیکن اس نے خود حرکی طریق کو دن بھر کے لئے موزوں نہ سمجھا۔ ناظم نے کمیٹی کو اطلاع دی کہ اس طریق کار میں کچھ ترمیم و اضافے ہوئے ہیں۔ بالآخر یہ طے پایا کہ جن والدین نے شکایات کی ہیں انہیں ان کا جواب لکھ دیا جائے گا۔

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو ملک کے ہر حصے میں ہمیشہ آتا رہتا ہے۔ بعض حلقوں سے یہ آواز بھی اٹھتی ہے کہ بچوں کو مکمل آزادی دینا مناسب نہیں ہے۔ اسکول کے آئین و ضوابط اور اس کے رسم و رواج ان میں احساس تحفظ پیدا کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی مکمل آزادی جو ناپختہ ذہنوں میں مسلسل انتخاب کا مسئلہ پیدا کرتی رہتی ہے کچھ موزوں نہیں ہوتی۔ موقع شناسی اور حسن تدبیر کے لئے ضبط و تحمل اور برداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اگر بچوں کی ابتدائی تعلیم صرف کتابی ہوتی تو ان میں سے بیشتر ناکامی کا منہ دیکھتے ہیں۔ اس سے بچوں میں تعلیم سے نفرت پیدا ہو سکتی ہے اور وہ تعلیم و تعلم سے اپنا پیر

سرکاری جریدہ کے اعلانات

نمبر اور تاریخ	نام اور عہدہ	کس عہدے پر تقرر یا تبادلہ ہوا	کیفیت
ی/۳۲۷۸ ۲۰ اکتوبر ۵۲ء	م۔ پیر امانت اللہ لیکچرر کیمیا گورنمنٹ کالج کیمبل پور (مشاہرہ ۲۲۵/- - ۱۵ - ۴۵۰/-)	سیلیکشن انسٹرکٹر ملٹری ونگ آف گورنمنٹ کالج منٹگمری (مشاہرہ ۲۵۰/- - ۲۰ - ۴۵۰ - ۲۵ - ۶۰۰/- - ۲۵ - ۷۵۰) پی ای ایس	ایک نئی آسامی جسے حکومت پنجاب نے بحوالہ چٹھی نمبر ۱۲۶۲ منظور کیا۔
ی/۲۸۰۴۳ ۵ نومبر ۵۲ء	ڈاکٹر ظفر الدین ایم ایس سی، پی ایچ ڈی لیکچرر کیمیا گورنمنٹ کالج راولپنڈی (مشاہرہ ۲۲۵ - ۱۵ - ۴۵۰)	سینیر لیکچرر کیمیا گورنمنٹ کالج لائلپور (مشاہرہ ۲۵۰/- - ۲۰ - ۴۵۰/- - ۲۵ - ۶۰۰/- - ۲۵ - ۷۵۰) پی ای ایس دوم	م تاج محمد خیال کی جگہ جنہیں پی۔ای۔ایس (اول) میں ترقی مل گئی۔
ی/۲۰۴۰۲ ۵ نومبر ۵۲ء	م۔ واعظ حسین ایم ایس سی لیکچرر حیوانیات گورنمنٹ کالج لاہور (مشاہرہ ۲۲۵/- - ۱۵ - ۴۵۰/-)	قائم مقام سینیر لیکچرر حیوانیات گورنمنٹ کالج لائلپور (دو سال کے لئے) یا جب م احسن الاسلام تعلیمی رخصت سے واپس آئیں پی ای ایس دوم ۱۰ اکتوبر ۵۲ء	م حشمت خاں کی جگہ جو ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔
ای/۲۳۹۷۶ ۲ نومبر ۵۲ء	م محمد سعید قریشی ایم اے (۲۲۵/- - ۱۵ - ۴۵۰/-) قائم مقام لیکچرر ریاضی گورنمنٹ کالج کیمبل پور	قائم مقام لیکچرر گورنمنٹ کالج لائلپور بمشاہرہ خود	طبیعات کی ایک خالی آسامی پر
	چودھری مختار احمد ایم اے (امیدوار)	قائم مقام لیکچرر ریاضی گورنمنٹ کالج کیمبل پور (مشاہرہ ۲۲۵/- - ۱۵ - ۴۵۰)	م۔ محمد سعید قریشی کی جگہ جو لائلپور تبدیل ہو گئے

نمبر اور تاریخ	نام اور عہدہ	کس عہدے پر تقرر یا تبادلہ ہوا	کیفیت
ای/۱/۹۶/۳۳۴۳ ۸ نومبر ۵۲ء	م۔ دین محمد ایم اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) معلم انگریزی سنٹرل ماڈل ہائی اسکول لاہور	قائم مقام لکچرر سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور (بشاہرہ ۲۷۵ ــ ۱۵ ــ ۳۵۰/۰)	تاریخ حاضری سے م۔ معزالدین کی رخصت کے اختتام تک (بیرون پاکستان)
	م۔ مختار علی جعفری ایم اے بی ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) معلم انگریزی سنٹرل ماڈل ہائی اسکول لاہور	ایضاً	تاریخ حاضری سے م۔ فضل محمد خاں کی رخصت کے اختتام تک (بیرون پاکستان)
ای/۱/۹۸/۳۳۴۳ ۸ نومبر ۵۲ء	م۔ محمد انور ایم۔ ایس سی لکچرر کیمیا گورنمنٹ کالج لائل پور	لکچرر کیمیا گورنمنٹ کالج راولپنڈی بشاہرہ خود	ان کی اپنی آسامی بھی راولپنڈی منتقل ہو جائے گی۔
ای/۱/۷۲/۳۳۴۳ ۸ نومبر ۵۲ء	م۔ عبدالرؤف بی اے بی ٹی (نمبر ۳۴ ۱۳۰ ــ ۲۵۰) اے ڈی۔ آئی۔ ایس میانوالی	اے۔ ڈی۔ آئی۔ ایس۔ سیالکوٹ بشاہرہ خود	راؤ منصور علی خاں کی جگہ پر تبدیل ہو گئے۔ تاریخ حاضری سے۔
	راؤ منصور علی خاں (۱۳۰ ــ ۲۵۰) اے ڈی، آئی۔ ایس، سیالکوٹ	قائم مقام نگران تربیت جسمانی گورنمنٹ نارمل اسکول بشاہرہ خود	ایک خالی آسامی پر تاریخ حاضری سے
	شیخ کرامت علی بی، اے، ایس اے، وی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول [illegible]۔ (۱۳۰ ــ ۲۵۰)	اے، ڈی، آئی، ایس۔ میانوالی۔ بشاہرہ خود	م۔ عبدالرؤف کی جگہ پر تبدیل ہو گئے
ای/۱/۴۵/۱۰۰۶	م۔ محمود علی قریشی بی اے بی ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول شرقپور	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول باغبانپورہ لاہور بشاہرہ خود	تاریخ حاضری سے م۔ [illegible] بخاری کی جگہ جنہوں نے محکمہ فوج میں ملازمت کر لی ہے اور جن کا حق رخصت گورنمنٹ ہائی اسکول شرقپور [illegible]

نمبر اور تاریخ	نام اور عہدہ	کس عہدے پر تقرر یا تبادلہ ہوا	کیفیت
ای ایل/۱۳۴۳۴-۲۰ ۳۰ نومبر ۵۲ء	م مقصود احمد بی، اے بی ٹی۔ معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول تلہ گنگ	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال بشاہرہ خود	م غلام مہدی کی جگہ جو ۲۰ نومبر ۵۲ء کو ملازمت سے سبکدوش ہو گئے
ای (جی)/۸۸/۱۷	م۔ عبدالسلام بی اے بی ٹی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری۔۔ (رخصت پر)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ریناله خورد بشاہرہ خود	تاریخ حاضری سے م۔ عبدالمجید کی جگہ جو تبدیل ہو گئے
	م عبدالمجید معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ریناله خورد	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری (بشاہرہ خود)	م عبدالسلام کی جگہ جو تبدیل ہو گئے۔
	چودھری عبدالوحید گھمن ایم اے بی ٹی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ (۱۳۰-۲۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ننکانہ بشاہرہ خود	تاریخ حاضری سے م امیر بخش کی جگہ جو تبدیل ہو گئے۔
	م۔ محمد افضل بی اے بی ٹی قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال۔	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ	م۔ عبدالوحید کی جگہ جو تبدیل ہو گئے۔ تاریخ حاضری سے
	م۔ امیر بخش بی اے بی ٹی (۲۵۰-۳۵۵) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ننکانہ (رخصت پر)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال۔ بشاہرہ خود	تاریخ حاضری سے م۔ محمد افضل کی جگہ جو منتقل ہو گئے۔
ای/سد/۲۲۲۹ ۸	م۔ فیاض حسین شاہ معلم گورنمنٹ ہائی اسکول تکھر	معلم سائنس گورنمنٹ ہائی اسکول عیسیٰ خیل (میانوالی)، بشاہرہ خود	فیض محمد بی اے کی جگہ جن کی خدمات کی اب ضرورت نہیں رہی۔